ارکانِ اسلام

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

MINHAJ-UL-QURAN PUBLICATIONS
منہاج القرآن پبلیکیشنز

ISBN: 969-32-0281-3

اَرکانِ اِسلام

ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تدوین :

علی اکبر قادری ، ضیاء نیر

مِنہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365- ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7237695

www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

نام کتاب	:	اَرکانِ اِسلام
خطبات	:	ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	:	ڈاکٹر محمود الحسن عارف، جاوید القادری، حافظ محمد خان قادری
نظرِ ثانی	:	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی
پروف ریڈنگ	:	محمد افضل قادری
کمپوزنگ	:	محمد سلیم حسن
زیرِ اہتمام	:	فریدِ ملّتؒ ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ www.Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
نگرانِ طباعت	:	شوکت علی قادری
اِشاعت اول تا نہم	:	اپریل 1985ء تا فروری 2003ء (13,100)
اِشاعت دہم	:	اکتوبر 2004ء (1,100)
اِشاعت سوم	:	جنوری 1997ء (2,000)
اِشاعت چہارم	:	ستمبر 2004ء
تعداد	:	1,100
قیمت اِمپورٹڈ پیپر	:	-/320 روپے

نوٹ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو / ویڈیو کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلیکیشنز)

sales@minhaj.biz

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَوْلَایَ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

فَهُوَ الَّذِیْ تَمَّ مَعْنَاهُ وَ صُوْرَتُهٗ

ثُمَّ اصْطَفَاهُ حَبِیْبًا بَارِئُ النَّسَمِ

﴿صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَ عَلٰی آلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ وَ بَارَکَ وَسَلَّمَ﴾

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔ا) ۴-۱/ ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۲۰-۴-۸۷ جنرل و ایم ۴/ ۷-۳-۹۷۰، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۶۷-۲۴۴۱۱ این۔ا/ اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت/ اِنتظامیہ ۸۰۶۱-۶۳/ ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

پیش لفظ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ یوں تو ہر نبی کے ذریعے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے مختلف شکلوں میں مذہبی تعلیمات پر مبنی احکام نازل فرماتا رہا لیکن خالقِ کائنات ﷻ نے محسن و مقصودِ کائنات حضور نبی اکرم ﷺ کے ذریعے امت مسلمہ کو جس آخری حتمی، مکمل اور جامع ترین دین سے نوازا وہ دین اسلام ہے۔

اسلامی تعلیمات کے دو بنیادی شعبے ہیں عقائد اور اعمال۔ عقائد کا تعلق ان نظریات اور حقائق سے ہے جن پر دل کی گہرائیوں سے غیر متزلزل یقین رکھنا اسلام کی شرطِ اول ہے۔ یہ عقائد پانچ ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالآخرۃ۔ ان میں سے ہر ایک کے تقاضے الگ اور ہر ایک کی نوعیت بھی مختلف ہے۔

دین اسلام کا دوسرا شعبہ اعمال سے متعلق ہے جسے عبادات بھی کہا جاتا ہے یعنی ایسے امور جن کی ادائیگی ایک مسلمان کے لئے حسبِ استطاعت ضروری اور لازمی ہے۔ ان عبادات کی بھی پانچ قسمیں ہیں۔ اعمال کی یہی پانچ بنیادی اقسام جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے معروف اصطلاح میں ارکانِ اسلام کہلاتی ہیں جو بالترتیب اس طرح ہیں:

☆ کلمہ پڑھنا یعنی توحید خداوندی اور رسالتِ محمدی ﷺ کا دل سے اقرار کرنا۔

☆ شب و روز میں پانچ نمازیں اوقاتِ مقررہ پر ادا کرنا۔

☆ صاحبِ نصاب کے لئے سال میں ایک مرتبہ مال کا ڈھائی فیصد (چالیسواں حصہ) زکوٰۃ کے طور پر مستحقین زکوٰۃ کو ادا کرنا۔

☆ سال بھر میں ایک مہینہ ماہِ رمضان کے روزے رکھنا اور

☆ جسے طاقت ہو اس کے لئے بیت اللہ کا حج کرنا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی عقائد و اعمال اسلامی معاشرے کی خصوصیات کا بنیادی عنصر ہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو دیگر تہذیبوں سے ممتاز و منفرد کرتے ہیں۔ دین اسلام نے اپنی تمام تر روحانی، اخلاقی اور سماجی اقدار، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی نظام اور جملہ عبادات و معاملات کا ڈھانچہ انہی عقائد و اعمال پر استوار کر رکھا ہے لہٰذا یہ جاننے میں قطعاً دشواری نہیں ہونی چاہئے کہ ہر دور کے بدلتے ہوئے علمی، فکری، تہذیبی اور معاشرتی و سیاسی تقاضوں کے مطابق اسلام کی حقانیت و صداقت اور عملیت کو متحقق کرانے کے لئے ان کی مطلوبہ تشریح و توضیح کس قدر ضروری ہے

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام کے علاوہ دوسرے کسی بھی انسان ساختہ مذہب کے ہاں عبادات کا ایک ایسا عظیم اور جامع تصور نہیں ملے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام صرف عقائد کا مذہب نہیں آفاقی دین اور مستقل ضابطہ حیات ہے۔ اس کا ہر رکن بنی نوع انسان کے لئے روحانی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا بہترین اور قابل عمل جزو ہے۔ نماز کو ہی لیجئے، اس کی شرائط اور جملہ واجبات کا اطلاق انسان کی روز مرہ عملی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ اس میں انسانی سیرت و کردار کی تشکیل اور ظاہری و باطنی طہارت کے جملہ اصول موجود ہیں۔

اسی طرح تزکیہ نفس کے حوالے سے اخلاقِ حسنہ کے حصول جیسے اعلیٰ نصب العین کی تکمیل کے لئے اسلام کے روحانی نظام میں روزے کی منفرد افادیت نکھر کر واضح ہوتی ہے۔ انسانی زندگی میں معاشی ضروریات کی قطعی اور بنیادی اہمیت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں مادی اور روحانی نظام کے تقاضے باہم متعارض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کے حکم کے ساتھ تقریباً بیاسی مرتبہ ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہوا ہے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام انسان کی مادی ضروریات سے اعراض کا نام نہیں بلکہ تنگدست اور مفلوک الحال لوگوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہی عبادت کی بہترین

شکل ہے۔

اب حج کو دیکھئے اگر اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ محبت کی ایسی عجیب داستان ہے جس کا ہر باب محبت کا نقطہ عروج ہے جہاں عقل و خرد اور علم و تحقیق کے سارے پیمانے توڑ کر انسان دیوانہ وار کبھی دوڑتا ہے، کبھی پتھر چومتا ہے، کہیں ستونوں پر کنکریاں پھینکتا ہے اور اس کا واحد مقصد محبوبِ حقیقی کی رضا و خوشنودی ہوتا ہے۔

الغرض ارکانِ اسلام کا یہ پانچ نکاتی لائحہ عمل دنیوی و اخروی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔

زیرِ نظر کتاب ایمانیات کے باب میں قائدِ تحریک منہاج القرآن ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی اہم تصنیف ہے جس میں متذکرہ بالا عنوانات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ امید واثق ہے کہ یہ کتاب نہ صرف علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گی ارکان اسلام کے حوالے سے عامۃ الناس کے لئے معلومات افزا ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان و اسلام کے مطلوبہ معیار پر پورا اترنے کے لئے حسنِ عقیدہ و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

العارض

علی اکبر قادری الازہری

ریسرچ سکالر

فریدِ ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

مارچ ۱۹۹۱ء

باب اوّل

حقیقتِ توحید و رسالت

ارکانِ اسلام میں تصورِ توحید بلاشبہ بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اسلامی نظریہ حیات اسی تصور کو انسان کے رگ و پے میں اتارنے اور اس کے قلب و باطن میں جاگزیں کرنے سے متحقق ہوتا ہے۔ تصورِ توحید کی اساس تمام معبودانِ باطلہ کے بطلان ونفی اور ایک خدائے بے ہمتا کی الوہیت کے تحقق و اثبات پر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمررضی اللہ عنہما سے مروی ایک متفق علیہ حدیث کے مطابق حضور ﷺ نے فرمایا:

بنی الإسلام علی خمس شھادۃ ان لا الہ الا اللہ و أن محمداً رسول اللہ واقام الصلوۃ و ایتاء الزکوٰۃ و الحج و صوم رمضان.

(بخاری، الصحیح، ۱: ۱۲، کتاب الإیمان، باب الایمان وقول النبی ﷺ بنی الاسلام علی خمس، رقم: ۸)
(مسلم، الصحیح، (۱: ۴۵، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام رقم: ۱۶) میں أن محمداً عبدہ و رسولہ ''محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں'' کے الفاظ دیئے ہیں)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج ادا کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

اس حدیثِ مبارکہ میں جن پانچ چیزوں کو بنیادِ اسلام قرار دیا گیا ہے اصطلاحِ شریعت میں انہیں اسلام کے ارکانِ خمسہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی ارکانِ خمسہ حدیث جبرئیل میں بھی مذکور ہیں اور متعدد روایات میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے اور انہی کی بطریق احسن ادائیگی پر لفظِ اسلام کا اطلاق ہوتا ہے۔

شہادتِ توحید

اسلام کا رکن اول شہادتِ توحید و رسالت ہے۔ زیر نظر باب میں ہمارا بیان صرف شہادت توحید پر مرکوز ہو گا جبکہ آئندہ ابواب میں انشاء اللہ شہادتِ رسالت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اسلام کا رکن اول کلمہ شہادت ہے جو بایں الفاظ مذکور ہے:

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

شہادتِ توحید و رسالت کے لئے محض کلمہ طیبہ کا رسمی اعلان اور زبانی اقرار ہی کافی نہیں کیونکہ کسی شخص کا اپنی زبان سے کلمہ طیبہ ادا کرنا اور بات ہے اور دل و زبان کی ہم آہنگی سے اس کی شہادت دینا اور بات۔ ایمان فی الحقیقت ''اقرارٌ باللّسان'' اور ''تصدیقٌ بالقلب'' کا نام ہے۔ دلی تصدیق کے بغیر محض زبانی اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا بقول اقبالؒ:

زباں نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

شہادتِ توحید کے دو پہلو

شہادتِ توحید کے دو پہلو ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت چونکہ یہ دونوں پہلو تفصیل طلب ہیں لہٰذا ان پر الگ الگ بحث کی جائے گی۔

شہادتِ توحید کا منفی پہلو

شہادتِ توحید کا پہلا حصہ نفی ما سوا اللہ پر مشتمل ہے جس کا مفہوم اس بات کا

مقتضی ہے کہ بندہ اپنے قلب و باطن کی اتھاہ گہرائیوں سے کائناتِ ارض و سما میں موجود ہر چھوٹی بڑی اور ادنیٰ و اعلیٰ مخلوق کی الوہیت کے ہر امکان کی کلی طور پر نفی کر دے اور یہ اقرار کرے کہ کائنات ہست و بود کی کوئی بھی چیز اصلاً بالفعل یا بالقوۃ اسے نقصان پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتی۔ نیز وہ اس امر کی گواہی دے کہ شجر و حجر، شمس وقمر، جمادات و نباتات، جن و انس و ملائکہ، ارضی و سماوی کائنات کی یہ اشیاء تو اپنی جگہ خود محکوم ہیں جو ایک غالب اور زبردست ہستی کا حکم بجا لانے کی پابند و منقاد ہیں۔ از روئے ارشادِ ربانی اپنے اپنے حال کی مناسبت سے ہر وجود ایک غالب و کار آفریں ذات کے آگے برضا یا بالجبر سر تسلیم و نیاز خم کئے ہوئے ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا

(القرآن، ال عمران، ۳: ۸۳)

''اور جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اس نے خوشی سے یا لاچاری سے (بہرحال) اسی کی فرمانبرداری اختیار کی ہے۔''

شہادتِ توحید کا اثباتی پہلو

شہادتِ توحید کا دوسرا حصہ الا اللہ ہے جس کے اثباتی پہلو کا مفہوم یہ ہے کہ الوہیت کی نفی کا اطلاق ہر وجود پر نہیں ہوتا کیونکہ کائنات میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جو انسان اور دیگر مخلوقاتِ ارضی و سماوی کی معبود و مسجود ہونے کی بناء پر حقدار و سزاوارِ الوہیت ہے اور وہی بنی نوعِ انسان کو نفع و نقصان پہنچانے پر قادر ہے کہ تنہا وہی ذات ہر ذی حیات و غیر ذی حیات کی خالق و مالک ہے اور مطاعِ مطلق اور مختار کل ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے نظامِ بندگی میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ ذات بابرکات اللہ رب العزت کی ہے۔

نفی و اثبات پر مشتمل اقرار کی ان دو جہتوں کی تکمیل ہی سے شہادت توحید کا مضمون مکمل ہوتا ہے۔ اگر محض نفی ہو اور اس کے ساتھ اثبات کا پہلو نہ ہو یا محض اثبات اور ماسوااللہ کی نفی نہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں اسلام کے رکن اول میں شہادتِ توحید کا پہلو

بہمہ وجوہ نامکمل اور ادھورا رہے گا۔

لفظ اللہ اور اس کا مفہوم

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو شہادتِ توحید میں ایک لفظ بڑی اہمیت رکھتا ہے جس سے ہر غیر اللہ کی الوہیت کی نفی اور صرف ایک ذات کی الوہیت کا اثبات ہو رہا ہے۔ یہ الٰہ کا لفظ ہے جو قرآن حکیم میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ یہاں مناسب ہو گا کہ مزید تفصیل میں جانے سے پہلے لفظ الٰہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔

مختلف مادہ ہائے اشتقاق کی رو سے لفظ الٰہ کا مفہوم

اہل علم کے مطابق اپنے مفہوم کے اعتبار سے لفظ الٰہ درج ذیل مشتقات سے عبارت ہے۔

پہلا مادۂ اشتقاق : أَلَہَ (عبادت کرنا)

اس لفظ کے کئی مادے بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے لغوی اشتقاق کے سلسلہ میں علماء کا ایک قول یہ ہے کہ یہ 'أَلَہَ' یَأْلَہُ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی عبادت کرنا ہے۔ اس طرح الٰہ کا معنی معبود (جس کی عبادت کی جائے) قرار پایا۔ زمانہ قدیم میں سورج کی پرستش کرنے والوں نے سورج کا نام الٰہہ رکھا ہوا تھا۔اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی کہ وہ اسے معبود تصور کرتے تھے۔ امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ لفظ الٰہ معبود سے عبارت نہیں بلکہ اس کی دلالت اس وجود یا ہستی پر ہوتی ہے جو خود معبود ہونے کی اہل اور مستحق ہو۔قرآن حکیم میں لفظ الٰہ اکثر وبیشتر معبود کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ

اِبۡرَاهِيۡمَ وَ اِسۡمَاعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ○

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۳۳)

''جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے (انتقال کے) بعد کس کی عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے کہا ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود و یکتا ہے، اور ہم (سب) اسی کے فرماں بردار رہیں گے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

قَالَ يَا قَوۡمِ اعۡبُدُوۡا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ اَ فَلَاتَتَّقُوۡنَ○

(القرآن، الاعراف، ۷: ۶۵)

انہوں نے کہا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کیا کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کیا تم پرہیز گار نہیں بنتے۔

اسی مضمون کی متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ جن سے الٰہ کا معنی ''معبود'' متحقق ہوتا ہے۔ اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ○

(القرآن، الانبیاء، ۲۱: ۲۵)

''اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری (ہی) عبادت کیا کرو۔''

اس مادۂ اشتقاق کی بنا پر لفظ اللہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ اکیلی ذات جو مستحق عبادت ہے۔ جو اپنے وجود و کمال میں اس قدر جامع اکمل اور اتم ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے کے لئے پرستش کے لائق ہے۔ جو خود واجب ہے اور باقی سب ممکن، جو خود خالق ہے اور باقی سب مخلوق، جو خود مالک ہے اور باقی سب مملوک، جو خود باقی ہے اور باقی سب فانی، جو خود

قدیم ہے اور باقی سب حادث، جو خود غنی ہے اور باقی سب محتاج، جو خود ہی ازلی وابدی ہے، اول وآخر ہے اور ظاہر وباطن ہے اور جو کچھ اس کائنات کے نقطہ آغاز سے لے کر نقطہ انجام تک وجود میں آ رہا ہے، اسی کے فیضان ربوبیت کا پرتو ہے۔ چونکہ کائنات کی ہر چیز اپنے ہونے، باقی رہنے اور کمال پانے میں اس کی محتاج ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں۔ کیونکہ جو محتاج ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ اخلاص میں تمام صفات الوہیت کے بیان کو اس طرح جمع کیا گیا کہ وہ سورت لفظ اللہ کی مکمل تعریف بن گئی، ملاحظہ ہو۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌO اَللّٰهُ الصَّمَدُO لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْO وَ لَمْ يَكُنْ لَهٗ كُفُوًا اَحَدٌO

(القرآن، الاخلاص، ۱۱۲)

’’آپ فرما دیں وہ اللہ ہے (جو) ایک ہے ۔ اللہ بے نیاز ہے ۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ۔ اور نہ اس کا کوئی جوڑ ہے۔‘‘

دُوسرا مادۂ اشتقاق: اَلِہَ (تحیر و درماندگی)

لفظ اللہ کے اشتقاق میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اَلِہَ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی تحیرودرماندگی ہے۔ رب ذوالجلال کے لئے اس لفظ کا اسم قرار پا جانا اس کی عظمت اور علو مرتبت کی صحیح نشاندہی ہے۔ کیونکہ انسان ذات باری تعالیٰ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیراورفہم و اِدراک کی درماندگی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور کرے گا۔ اس کی حیرت واستعجاب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ معرفت الٰہی کی ابتدا بھی عجزوحیرت تھی اور انتہا بھی عجزوحیرت ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

حواسِ انسانی ذاتِ حق کا ادراک نہیں کر سکتے۔ عقل انسانی اس کے فہم سے قاصر ہے۔ کشف و وجدان اس کی کامل معرفت سے عاجز ہیں۔ انسان جب اپنی تمام ظاہری و باطنی صلاحیتوں اور نفسی استعدادوں کو بروئے کار لا کر بھی اس حسن مطلق کے جلووں کا صحیح نظارہ نہیں کر سکتا اور اس حقیقت ابدی کو اپنے دامن عقل وفہم میں سمو نہیں سکتا تو اس کی زبان بے ساختہ پکار اٹھتی ہے۔

مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ۔

''اے حسن ازل! ہم تجھے اس طرح نہیں جان سکے جیسے تجھے جاننے کا حق تھا۔''

اس لئے کہ وہ کل ہے اور باقی سب جزو۔ وہ خود محیط ہے اور باقی سب محاط۔ وہ غیر محدود ہے اور باقی سب محدود۔ اس کی حقیقت سب جاننے والوں کی سرحد ادراک سے ماوراء ہے اور اس کی ہستی سب دیکھنے والوں کی منتہائے نظر سے بلند و بالا ہے۔

لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ○

(القرآن، الانعام، ۶: ۱۰۳)

''نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔''

اسی وجہ سے حکم دیا گیا:

تَفَکَّرُوْا فِیْ اٰلَآءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِیْ اللّٰهِ۔

(الدر المنثور، ۲: ۱۱۰)

''اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرو اور ذات باری تعالیٰ میں غور وفکر نہ کرو۔''

قرآنِ حکیم میں جا بجا آیاتُ اللہ (خدا کی نشانیوں) میں غور وفکر اور تعقل و تدبر کی تعلیم دی گئی ہے۔ ذات ایزدی میں تفکر کے لئے نہیں کہا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذَالِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیاتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ○ اِنَّ فِیْ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ○

(القرآن، یونس، ۱۰: ۵۔ ۶)

’’اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا فرمایا مگر درست تدبیر کے ساتھ، وہ (ان کائناتی حقیقتوں کے ذریعے اپنی خالقیت، وحدانیت اور قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لئے تفصیل سے واضح فرماتا ہے جو علم رکھتے ہیں ۔ بیشک رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور ان (جملہ) چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا فرمائی ہیں (اسی طرح) ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو تقویٰ رکھتے ہیں۔‘‘

دوسرے مقام پر اسی طرح ارشاد فرمایا:

سَنُرِيُهِمُ اٰيَاتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِیٓ اَنۡفُسِهِمۡ۔

(القرآن، حم سجدہ، ۴۱: ۵۳)

’’ہم انھیں جلد ہی کائنات میں اور ان کے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھا دیں گے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

أَ وَ لَمۡ يَتَفَكَّرُوۡا فِیٓ اَنۡفُسِهِمۡ۔

(القرآن، الروم، ۳۰: ۸)

’’کیا وہ اپنے نفوس میں تفکر نہیں کرتے۔‘‘

تفکر فی آیات اللہ کی تلقین دیگر مقامات پر اس طرح کی گئی ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ○

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۱۹)

’’اسی طرح اللہ تمہارے لئے (اپنے) احکام کھول کر بیان فرماتا ہے تا کہ تم غور وفکر کرو۔‘‘

مزید ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ وَ يَتَفَكَّرُوۡنَ فِیۡ

خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○

(القرآن، ال عمران، ۳:۱۹۱)

’’یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اس کی عظمت اور حسن کے جلوؤں) میں فکر کرتے رہتے ہیں (پھر اس کی معرفت سے لذت آشنا ہو کر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔‘‘

متذکرہ بالا آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ عالم کون ومکان میں کارفرما قدرت کی نشانیوں میں غور وفکر سے ہستی باری تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے اور اس کی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے۔ جوں جوں اِنسان انفس و آفاق کی آیات و علامات کے فکر میں منہمک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس پر ذات حق کی عظمتیں اور سطوتیں مزید آشکار ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ تحیر و اِستعجاب کے سمندر میں غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر عالم حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک معرفت کی منزلوں میں اس ’مقامِ حیرت‘ کو نہایت بلند درجہ حاصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کئی عرفاء طوِیل طوِیل مدت تک آیاتِ الٰہیہ میں غور وفکر کرتے ہوئے مقامِ حیرت میں اس طرح گم کھڑے رہے کہ اس محویت میں نہ انھیں اپنی خبر رہی نہ دنیا کی۔ حتی کہ یہی حیرت منتہائے معرفت قرار پا گئی۔ لیکن اس درجہ تک بھی عقل کو نہیں عشق ومحبت ہی کو رسائی حاصل ہوتی ہے، بقول اقبالؒ:

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم

دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

اسی لیے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

دنیا کے تمام عرفاء اور حکماء اس امر پر متفق رہے ہیں کہ آگہی کی انتہا بے خبری ہے اور علم کا آخری نقطہ کمال لاعلمی ہے۔ جب چشم علم و معرفت پر تمام حجابات کے اٹھ جانے سے حقیقت ابدی منکشف ہو جاتی ہے اور عارف ذات حق کی معرفت کے لیے قدم آگے بڑھاتا ہے تو اسے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں اور اس لاعلمی کا علم ہی اس کے لئے سب سے بڑا علم قرار پا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ:

معلوم شُد کہ ہیچ معلوم نہ شُد

بس بارگہ الوہیت میں یہی انسانی علم کی انتہاء ہے کہ انسان کو اس کے ہونے اور اپنے نہ ہونے کی خبر ہو جائے۔ کسی نے اس مقام معرفت کو کیا خوب بیان کیا ہے کہ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اکبر نے حیرت و درماندگی اور تحیر و بے خبری کو منتہائے علم تصور کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا کہ

ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بہت ہی عالم تھا

بلھے شاہؒ فرماتے ہیں:

علموں بس کریں او یار

اس لئے اس ذاتِ بلند و برتر نے اپنا نام اللہ منتخب فرمایا تاکہ انسان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ وہ اس ہستی مطلق کی عظمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اسی کو امام رازیؒ یوں بیان کرتے ہیں :

فَهٰهُنَا الْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الْاِدْرَاکِ اِدْرَاکٌ۔

(التفسیر الکبیر،۱:۱۶۰)

''پس اس مقام پر حصول ادراک میں عجز و ناکامی کا نام ہی ادرک ہے۔''

تیسرا مادۂ اِشتقاق : اَلَهَ (سکون پانا)

اس بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ الله اَلَهَ سے مشتق ہے۔ جس کا معنی سکون پانا ہے۔ کہا جاتا ہے ۔ ألهتُ إلى فلانٍ أی سکنتُ إليه (کہ میں نے فلاں سے سکون پایا) ذات باری تعالیٰ کو ''اللہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ بیتاب دلوں کو اسی سے تسکین ملتی ہے، قران حکیم میں مذکور ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ○

(القرآن، الرعد،۱۳:۲۸)

''جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَکَّلُوْنَ○

(القرآن، الانفال،۸:۲)

''ایمان والے (تو) صرف وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل (اس کی عظمت و جلال کے تصور سے) خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ (کلام محبوب کی لذت انگیز اور حلاوت آفریں باتیں) ان کے ایمان میں زیادتی کر دیتی ہیں اور

وہ (ہر حال میں) اپنے رب پر توکل (قائم) رکھتے ہیں (اور کسی غیر کی طرف نہیں تکتے)۔‘‘

اس آیت میں اہل ایمان کی حالتِ محبت بیان کی جارہی ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں جو اپنا رشتہ محبت اس محبوب حقیقی سے استوار کرلیتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ علامتِ محبت ہے کہ محبوب کا نام اور ذکر سن کر اہل محبت کے دلوں کو تسکین ملتی ہے، سب غمِ زیست بھول جاتے ہیں، دل اس کی یاد میں لذت وطمانیت اور کیف وسرور کی دولت پاتے ہیں۔ لیکن سورہ انفال کی آیت میں ’’وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ ‘‘کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ جن میں دل کے لرز جانے کا ذکر ہے۔ اہل دل سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں ہو گی کہ جب محبت شدت اختیار کر کے عشق کا روپ دھار لے تو دل پر عجیب کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں ۔ اس وارفتگی اور جنون کی حالت میں جب محبوب کا نام سننے میں آئے۔ کہیں اس کا تذکرہ ہو یا خود دل میں اس کی یاد زور پکڑ لے تو دل لرز لرز جاتا ہے۔ بعض اوقات کپکپی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جسم میں سے بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ عاشق اس کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے، آنکھیں برسنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہی یاد اسے بے چین کر دیتی ہے اور یہی اس کے لیے باعث سکون بھی بنتی ہے۔ متنبّی محبوب کا ذکر سننے پر دل کر کیفیت یوں بیان کرتا ہے:

أَلیسَ وَعدتَّنی یَا قلبُ عنِّی

إِذا مَا تُبتُ عن لیلٰی تتوبُ

فھا أَنا تائبٌ عن حبِّ لیلٰی

فمَا لکَ کُلَّمَا ذُکرتْ تذُوبُ؟

(اے دل! کیا تُو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جب میں لیلٰی کی محبت سے تائب ہو جاؤں گا تو تُو بھی توبہ کر لے گا۔ پس دیکھ میں تو لیلٰی کی محبت سے تائب ہو چکا ہوں۔ اب تجھے کیا ہوا ہے کہ جب بھی لیلٰی یاد آتی ہے (یا

اس کا ذکر ہوتا ہے) تو تُو پھر پگھلنا شروع کر دیتا ہے)

قرآن اہلِ ایمان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جب باری تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو اہل ایمان کے دل پگھلنے لگتے ہیں۔ کیونکہ جوں جوں حب الٰہی عشق میں بدلتی جاتی ہے، ایمان کمال کو پہنچتا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

(القرآن، البقرۃ،۲:۱۶۵)

''اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔''

اسی ٹوٹ کر محبت کرنے کو ہی تو عشق کہتے ہیں اور اس کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ عاشق کو محبوب کے سوا نہ کسی اور کی طلب رہے اور نہ ضرورت۔ اسی بے نیازی کو قرآن ''وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ'' کے الفاظ سے تعبیر کر رہا ہے کہ اہل ایمان اپنے محبوب حقیقی کے علاوہ کسی اور کے لطف وکرم اور عنایت واحسان کی آرزو ہی نہیں کرتے۔ جب دنیا کی تمام متاع اور خیر کا منتہائے کمال سکون قلب ہی ہو اور یہ دولت انھیں دامن محبوب سے میسر آجائے تو پھر انہیں کسی اور جانب نگاہ اٹھانے کی حاجت ہی کیوں ہو کسی نے کیا خوب کہا ہے:

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اِس دعا کے بعد

چنانچہ لفظ اللہ ذات باری سے انسان کے محبت کرنے اور اسی سے سکون قلب پانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ پر الف لام کے واقع ہونے سے جو تعریف اور اختصاص پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی افادیت یہ ہے کہ انسان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے کہ اس عالم آب وگل میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اسے حقیقی سکون کی دولت سے بہرہ ور کر سکے۔ گویا یہ نام پریشان حال لوگوں اور بے چین ومضطرب دلوں کو مژدہ

جانفزا سنا رہا ہے کہ دنیا کی گونا گوں مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات اور دل و دماغ کی آسودگی وطمانیت دنیوی عیش و آرام کے سامانوں سے میسر نہیں آسکتی۔ زیادہ سے زیادہ دولت اور مادی وسائل و ذرائع سمیٹنے سے نصیب نہیں ہوسکتی، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی ہوس نفس پرستی کے تحت محکوم اور غلام بنا لینے سے نہیں مل سکتی، بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے دامن لطف و عافیت سے وابستہ ہوکر نصیب ہوسکتی ہے۔ بیشک بیقرار دلوں کو اسی کی یاد میں قرار ملتا ہے اور غم حیات کے ستائے ہوئے انسانوں کو اسی سے لو لگانے میں سکون ملتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ دنیا میں کتنے انسان ایسے ہیں، جو تمام مالی آسائشوں اور رنگین سامانیوں کے باوجود سکون قلب سے محروم ہیں اور اسی دولت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اسی بنا پر وہ آئے دن متعدد امراض کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس، وہ خوش نصیب جنھوں نے تمام مادی دولتوں کے عوض ایک روحانی دولت یاد الٰہی کی صورت میں پالی ہے۔ کس قدر مطمئن اور پرسکون رہتے ہیں۔ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** کے مصداق ہر پریشانی سے محفوظ ہیں۔ یاد حق سے شغف و انہاک کتنی لذت، سکون، طمانیت اور کیف و سرور عطا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ تو اسی کو ہوسکتا ہے، جس نے شب کی تاریکیوں میں محبوب حقیقی کی خاطر اپنا پہلو بستر سے جدا رکھا ہو، جس نے نصف شب اور آخر شب عشق الٰہی میں بسمل کی طرح تڑپنے کا مزہ چکھا ہو، جس نے راتوں کی خلوت کو محبوب کی یاد اور اس کے ذکر وفکر سے جلوت میں بدل کے دیکھا ہو۔ جس نے اسے منانے کے لئے رو رو کر اپنا دامن آنسوؤں سے بھگویا ہو اور جس نے عشق کی آگ کو سرد آہوں سے بجھانا سیکھا ہو اسی کو اس سکون اور لذت کی خبر بھی ہوسکتی ہے اور قدر بھی۔ جس پر کیفیات کبھی بیتی ہی نہ ہوں، اسے ایسے احوال کی کیا خبر۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص نہایت خوش ذائقہ پھل کھا کر اس کی وہ لذت اور شیرینی جو اسے کھانے میں محسوس ہوئی تھی ایسے شخص کو سمجھانے لگے جس نے کبھی وہ پھل چکھا تک نہ ہو۔ آخر یہ کیونکر ممکن ہوگا۔ وہ شخص یقیناً اس لذت کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ جب تک کہ وہ خود اس پھل کو نہ کھالے۔ لہٰذا اس سکون کو جو اللہ کی ذات سے لو لگانے میں میسر آتا ہے خود لو لگا کر محسوس تو کیا جاسکتا ہے دلائل سے سمجھا نہیں جاسکتا۔ اسی سکون قلب کے حصول کے لئے

تو اہل دل شب بھر یادِ حق میں مشغول رہتے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا○

(القرآن، الفرقان، ۲۵: ۶۴)

''اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیام (نیاز) میں راتیں بسر کرتے ہیں۔''

اور یہ وہ لوگ جو ساری رات اپنے رب کے لئے سجود و قیام میں گزار دیتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ بِالۡاَسۡحَارِ ھُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ○

(القرآن، الذاریات، ۵۱: ۱۸)

''اور وہ پچھلی رات (اٹھ اٹھ کر) استغفار کرتے ہیں۔''

اس آیت میں اہل محبت کی دائمی حالت بیان کی جارہی ہے کہ محبوب کو منانے کے لئے ہمیشہ پچھلی رات آہ و بکا کرتے ہیں۔ اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں۔ اس کی یاد میں راتوں کی نیند اور سحر کا خمار انگیز وقت قربان کرتے ہیں۔ تب جا کر انھیں ''من کی دولت'' نصیب ہوتی ہے، اقبالؒ نے بجا کہا ہے:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

یہ سکون قلب یا من کی دولت ایسی دولت ہے جس پر نہ غربت اثر انداز ہوتی ہے نہ امارت، نہ سفر، نہ حضر، نہ بیماری، نہ صحت، نہ کمزوری، نہ طاقت، اس سے باطن میں ایک الگ دنیا آباد ہوتی ہے۔ جس کی رونقوں میں انسان مگن رہتا ہے اور تمام دنیوی احوال اس کے لئے اضافی ہوتے ہیں اور اضافی کیفیات عاشق کی دنیا میں اپنا کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ اقبالؒ نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے کیا خوب لکھا ہے۔

تری دُنیا جہانِ مرغ و ماہی
مِری دُنیا فُغانِ صبح گاہی

تری دُنیا میں میں محکوم و مجبور
مِری دُنیا میں تیری پادشاہی

چوتھا مادۂ اشتقاق: الوله (عقل کا گم ہونا)

دُوسرے اور چوتھے مادوں میں معنوی یکسانیت ہے۔ دوسرا مادہ اشتقاق الہٰ تھا۔ جس کا معنی تحیر ودرماندگی بیان کیا گیا ہے اور ولہ میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان دونوں مادوں کے اعتبار سے لفظ الہٰ اور اللہ کا معنی یہ قرار پایا کہ وہ ذات جس کی جستجو میں عقل وخرد گم ہو جائیں۔

عقل ہمیشہ سے اسی حقیقت ابدی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن آج تک بالیقین اسے پا نہ سکی۔ فلسفہ کا آغاز بھی اسی حقیقت یعنی منظور کو جاننے کی کوشش سے ہوا تھا۔ چنانچہ فلسفہ اپنے دور عقلیت میں حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ عقلیت سے مراد فلاسفہ یونان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ صرف عقل ہی ذریعۂ علمِ حقیقت ہے۔ اس سے محسوسات کے حقیقت ہونے کا انکار لازم آیا اور حقیقت کو صرف معقولات سے مختص کر دیا گیا۔ لیکن جو ذات عقل کے حیطۂ ادراک سے ماوراتھی، حقیقت قرار نہ پا سکی اور بالآخر فلاسفہ اس تصور علم سے تائب ہو گئے۔ اس کے بعد فلسفے کے دور حقیقت کا آغاز ہوا۔ جس میں صرف حواس کو ہی ذریعہ علم حقیقت مانا گیا۔ اس طرح محسوسات حقیقت قرار پا گئے اور معقولات کے حقیقت ہونے کا انکار ہو گیا۔ لیکن جو وجود حواس کے حیطۂ اِدراک سے ماورا تھا، حقیقت قرار نہ پا سکا۔ عقل حقیقت کی تلاش میں سرگرداں وپریشان پھرتی رہی۔ بالآخر 'تشکیک' اور 'سوفسطائیت' کی نذر ہو گئی۔ فلاسفہ اور عقلاء کے پاس عقل کو اس بھنور سے نکالنے کی کوئی تدبیر نہ تھی اور نہ حقیقت کو پانے کا کوئی حتمی لائحہ عمل تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی تلاش وجستجو کا رخ ہی پھیر لیا۔ انھوں نے توجہ منظور (جسے دیکھا جا رہا ہو) کی بجائے ناظر (خود دیکھنے والا) کی طرف کر لی۔ اور عقل کی بجائے 'اسے' تلاش کرنے کے 'اپنی' ہی تلاش میں مگن کر لیا۔ فلاسفہ کے اندازِ فکر اور سمت وجستجو میں یہ تبدیلی دراصل اس حقیقت کا

اعلان تھا کہ ''عقل حقیقتِ ابدی کونہیں پا سکتی'' عقل کے سفر میں اتنے مراحل اس لیے آئے کہ وہ اقدام و خطا (Trial and Error) کے طریق پر گامزن تھی۔ اگر وہ شروع سے آستانِ مذہب پر سرِ تسلیم خم کر لیتی تو اسے اتنے جتن نہ کرنے پڑتے۔ کیونکہ مذہب تو اس حقیقت کو اللہ کا نام دے کر پہلے دن سے یہ پکار رہا تھا کہ اس ذات کا ادراک حواس وعقل کی پرواز سے بلند ہے۔ اگر عقل اس کی تلاش میں نکلے گی تو خود گم ہو جائے گی۔ عقل کو بالآخر اعلان الوہیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اب عقل کا خود ناظر کی تلاش میں مصروف ہو جانا دراصل ''معرفت نفس'' کی سعی ہے اور یہ سعی ''ذریعہ وجدان'' کے بغیر ممکن نہیں۔ تلاش کے لئے دو تو عالم تھے۔ عالم آفاق اور عالم انفس جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ۔

(القرآن، حم سجدہ، ۴۱: ۵۳)

''ہم تمھیں اپنی نشانیاں انفس وآفاق کے دونوں عالموں میں دکھا دیں گے۔''

عالم آفاق میں حواس اور عقل کی کاوشیں کارگر ہوسکتی تھیں وہ اپنی جدوجہد کر چکیں۔ انہیں حقیقت کا سراغ بھی ملا لیکن اسے پا نہ سکیں، مگر عالم انفس میں معرفت نفس کی کاوش میں حواس اور عقل سے کہیں زیادہ وجدان کی ضرورت ہے۔ اس نہج پر بھی حقیقت کا احاطہ تو ممکن نہیں لیکن اس کی کچھ نہ کچھ معرفت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ''**من عرف نفسه فقد عرف ربه**'' (الحاوی للفتاوی للسیوطی، ۲: ۴۱۲) کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ اقبالؒ تلاشِ حقیقت کے لیے صحیح سمت کی نشاندہی اس طرح کرتا ہے۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
که اُو پیدا ست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نه بینی
تلاش خود کنی جز اُو نیابی

چنانچہ لفظ اللہ جس واجب الوجود کی ذات والا صفات پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی

براہ راست معرفت عقل انسانی کے بس میں نہیں بلکہ یہ اس کے مظاہر سے ممکن ہے اور حقیقت انسانی خود اس ہستی مطلق کی سب سے کامل مظہر ہے۔ اس لئے اقبالؒ ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

اگر خواهی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز
اگر زیری ز خود گیری زبر شو
خدا خواهی بخود نزدیک تر شو

اِسی تصور کو ایک اور انداز میں یوں واضح کیا گیا ہے۔

چیست دیں؟ در یافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش
بر مقامِ خود رسیدن زندگی ست
ذات را بے پردہ دیدن زندگی ست

معرفت ذات حق کی راہ پانا عقل سے نہیں ذوق و وجدان سے ممکن ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

عقل تو خود ہی اس راہ میں دم بخود ہے اور اس حقیقت کی تلاش میں عقل مادی کا سہارا لینے والے بھی گم گشتہ راہ ہیں۔ عقل کی بے سروسامانی اور عشق کی شناسائی منزل راہ نوردوں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

بیا که عشق مسلمان و عقل زناری

پانچواں مادۂ اشتقاق: لاۃ (بلندی و ارتفاع)

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ الٰہ اور اللہ کا مشتق منہ 'لاۃ' ہے۔ جس کا معنی ''بلند ہونا'' ہے چنانچہ اس لفظ کی معنوی دلالت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو ہر عجز اور کمزوری سے بلند

ہو، جو ہر نقص اور حرمان سے بلند ہو۔ جو ہر عیب و خطا سے بلند ہو۔ جو ہر ضرورت واحتیاج سے بلند ہو۔ جو ہر مناسبت ومماثلت سے بلند ہو۔ جو ہر ایک کے کفر وشرک سے بلند ہو۔ جو انسانوں کے ظلم ومعصیت سے بلند ہو جو انسانی وہم وگمان سے بلند ہو۔ جو ممکنات ومحدثات سے بلند ہو۔ جو ہر مخلوق کی قوت ادراک سے بلند ہو۔ اور جو ہر ایک کی طاقت توصیف سے بھی بلند ہو، اسی لئے ارشاد فرمایا گیا:

سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ○

(القرآن، الانعام،۶:۱۰۰)

''وہ ان (تمام باتوں سے پاک اور بلند و بالا ہے جو یہ (اس سے متعلق) کرتے پھرتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ○

(القرآن، الصافات، ۳۷:۱۸۰)

''تیرا رب جو عزت والا رب ہے ان کی باتوں سے پاک اور بلند ہے۔''

امام رازیؒ باری تعالیٰ کی مطلق بلندی و برتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لِاَنَّ الواجب لذاته لیس الا هو، والکامل لذاته لیس الا هو، والاحد الحق فی هویته لیس الا هو، والموجد لکل ماسواه لیس الا هو

(التفسیر الکبیر،۱:۱۶۰)

ارتفاع عام طور پر ایک اضافی امر تصور کیا جاتا ہے، جس کا تعلق مکان سے ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات مکان اور اضافت مکانی سے بھی بلند و بالا ہے۔ اس لئے اس عالم کو جہاں اس کے انوار ذات کا جلوہ عیاں ہے۔ اصطلاح میں عالم لامکان کہتے ہیں۔ لامکاں کو عالم کہنا بھی مجاز ہے ورنہ اس کی ذات اس سے بھی بلند ہے کیونکہ اس کا ارشاد تو یہ ہے:

أنا مكون المكان و ليس لی مکان سوی الانسان۔

(الرسالۃ غوث اعظمؒ)

''میں مکان کو پیدا کرنے والا ہوں اور سوائے انسان کے میرا کوئی مکان نہیں ہے۔''

اس کی تائید اس حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا:

لا یسعنی أرضي و لا سمائي و لکن یسعنی قلب عبدی المؤمن۔

(الحدیث)

''مجھے زمین اور آسمان کی وسعتیں اپنے اندر نہیں سمو سکتیں لیکن میں اپنے بندہ مومن کے دل میں سما جاتا ہوں۔''

اس لئے وہ ذات مکان اور سمت و جہت کے تعینات کے بغیر ہر شے سے بلند ہے۔ لیکن اس کی بلندی کائنات کی تمام جہتوں میں اس کے ظہور کو بھی مانع نہیں ہے۔ بناء بریں ارشاد قرآنی ہے:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔

(القرآن، البقرہ، ۲:۱۱۵)

''پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)۔''

چھٹا مادۂ اشتقاق: لاہ یلوہ (مخفی ہونا)

اس اعتبار سے الٰہ اور اللہ کا اطلاق اس ذات اقدس پر ہوتا ہے جو ہر آنکھ سے پنہاں ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

(القرآن، الحدید، ۵۷:۳)

''وہی اول ہے وہی آخر، وہی عیاں ہے وہی نہاں اور وہ ہر چیز کا جاننے والا

ہے۔‘‘

گویا وہی ذات عیاں بھی ہے اور نہاں بھی۔ ظہور و احتجاب (اجاگر ہونا اور مخفی ہونا) دونوں شانوں کا بیک وقت ایک ہی ذات میں موجود ہونا اس طرح ممکن ہے کہ

i- صفات سے عیاں، ذات سے نہاں

وہ جلوہ حسن اپنی صفات کے اعتبار سے عیاں ہو مگر ذات کے اعتبار سے نہاں، گویا کائنات میں ہر سو اس کی صفات و کمالات ربوبیت کا جلوہ ظہور پذیر ہو۔ اس کی بے پایاں رحمتیں اور نشانیاں اظہر من الشّمس ہوں جو قدم قدم پر انسان کو اس کے ہونے کا یقین دلا رہی ہوں۔ لیکن جب انسان اس کی ذات کا بے حجاب دیدار کرنا چاہے تو وہ مستور و محجوب رہے۔ یعنی اس کی صفات ظاہر ہوں اور ذات باطن جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔

(القرآن، الانعام، ۶: ۱۰۳)

’’نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔‘‘

ii- شدتِ ظہور کے باعث آنکھوں سے نہاں

احتجاج ظہور و بطون کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ذات اس قدر ظاہر ہو کہ دکھائی نہ دے سکے گویا وہ شدت ظہور کی بناء پر آنکھوں سے مخفی رہے۔ اس ضمن میں امام رازی فرماتے ہیں:

قال بعض المحققين: سبحان من احتجب عن العقول بشدة ظهوره واختفى عنها بكمال نوره.

(التفسير الكبير، ۱: ۱۶۰)

’’بعض محققین کہتے ہیں پاک ہے وہ ذات جو اپنی شدت ظہور کے باعث عقلوں سے محجوب ہے اور کمال نور کے باعث ان سے مخفی ہے۔‘‘

جیسے سخت گرمی کے موسم میں عین نصف النہار کے وقت سورج کو اس کی شدتِ ظہور کے سبب سے براہ راست دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس طرح وہ عیاں ہوکر بھی نہاں رہتا ہے لیکن آفتاب کو اس نورِحق کے ظہورِتام سے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ جس کا بیان اَللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے لفظوں میں کیا گیا ہو اور وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا کا اعلان جسکی جلوہ تابانیوں پر دلالت کرتا ہو۔ چنانچہ وہ ذات اپنے نورِ ذاتی اور نورِ صفاتی کے ساتھ اس قدر ظاہر، عیاں اور تاباں ہے کہ کوئی آنکھ اس کے جلوے کی تاب نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ ظاہر ہوکر بھی مخفی رہتی ہے۔

iii- اِنتہائے قرب کے باعث نظروں سے نہاں

ذاتِ باری کے مخفی ہونے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ اس قدر قریب ہے کہ قابلِ ادراک نہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ درمیان میں مناسب فاصلہ ہو۔ اگر ناظر و منظور دونوں میں اتنا قرب ہو کہ نقطہ بھر بھی فاصلہ اور دوری باقی نہ رہے تو منظور مخفی ہی رہتا ہے اسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ جیسے پتلی آنکھ کے اندر ہوکر بھی آنکھ سے مخفی ہے۔ اسی طرح ذاتِ حق انسان کے باطن میں سما کر بھی اس سے مخفی رہتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔

(القرآن، البقرہ، ۲:۱۸۶)

’’اور (اے حبیب!) جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں تو (بتا دیا کریں کہ) میں نزدیک ہوں۔‘‘

ایک اور مقام پر اس قرب کی نوعیت بھی بیان کی گئی ہے۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ○

(القرآن، ق، ۵۰:۱۶)

’’اور ہم اس سے دل کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔‘‘

اس آیت میں بھی قرب کو مبالغے کے صیغے سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن قرب کی حد متعین نہیں کی گئی جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ذات اپنے بندے سے اتنی قریب ہے کہ اس کا اندازہ بھی ممکن نہیں۔ گویا ذات حق سارے جہان اور اہل جہان کی جان ہے اس لئے بدن اسے دیکھنے سے قاصر ہیں، بقول شخصے

حق جانِ جہان است و جہاں جملہ بدن
توحید ہمیں است دِگر حیلہ و فن

حضرت رومیؒ جان وتن کے قرب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سرِ من از نالۂ من دُور نیست
لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جان و جاں زتن مستور نیست
لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

محرمِ ایں ہوش جُز بے ہوش نیست
مرزباں را مشتری چوں گوش نیست

حقیقت یہی ہے کہ قربِ الٰہی کا یہ ہوش پوری دنیا و مافیہا سے بے ہوش ہوئے بغیر نصیب نہیں ہوسکتا۔

چوں ایں جا بے خودی می آورد ہوش
عبارت را اشارت گفت خاموش

iv- خود مخفی مگر اپنے تصرفِ قدرت کو ظاہر کرنے والی ذات

ذات حق کے ظاہر اور باطن ہونے کا معنی یہ بھی ہے کہ وہ ذات خود مخفی ہے، لیکن ہر شے میں اپنی قدرت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ اس کی مثال روح کی سی ہے، جو خود مخفی رہتی

ہے مگر اپنے تصرفات کو جسم کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ جسم درحقیقت مردہ و بے جان ہوتا ہے لیکن روح کا محکوم۔ لوگوں کی نظر میں جسم کی حرکات عیاں ہوتی ہیں اور وہ روح جو اصل محرک ہے، نہاں ہوتی ہے۔ گویا روح کی حیثیت ''ہست نیست نما'' کی ہوتی ہے کہ خود حقیقت میں متصرف ہے لہذا ''ہست'' ہے اور حرکت جسم جو اصلاً نیست تھی روح کی وجہ سے ہست نظر آنے لگی۔ اسی طرح گردباد میں ہوا اصل محرک ہوتی ہے لیکن خاکی ذرات تیز رفتاری کے ساتھ گول چکر میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ ہوا مخفی اور محجوب رہتی ہے اور ذرات ظاہر و عیاں۔ لوگوں کی نگاہیں ذرات کی حرکت پر پڑتی ہیں لیکن ہر ہر ذرے کے پیچھے کارفرما قوت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت ہست تو وہ صاف ہوا تھی جس نے تحریک کے ذریعے ذرات خاک کی حرکت کو نیست سے ہست بنادیا۔ اس طرح وہ قادر مطلق جو قیوم عالم ہے وہی ہست ہے لیکن نیست نما ہے جس نے اپنے تصرف سے موجودات عالم کو متحرک بنادیا ہے وہ خود تو مخفی ہے لیکن اس کا تصرف کائنات کے ذرے ذرے میں ظاہر و باہر ہے۔ ورنہ اس کے بغیر ہر چیز نیست و معدوم تھی۔ اس قرآنی ارشاد کا یہی معنی ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔

(القرآن، القصص، ۸۸:۲۸)

''سوائے اس کے ہر ہست، نیست ہے۔''

چونکہ ہر شے اسی کی ہستی سے قائم ہے اس لئے ارشاد فرمایا گیا:

وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ۔

(القرآن، الحدید، ۴:۵۷)

''تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔''

لہٰذا اللہ کا لفظ ان معنوں میں اس ذات کے مخفی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ساتواں مادۂ اشتقاق : الہ (جھکنا، راغب ہونا اور رجوع کرنا)

اس اعتبار سے الہ کا معنی ہوا جس کی طرف جھکا جائے اور رجوع کیا جائے۔

اور اللہ کا معنی لام تعریف کے باعث یہ طے پایا کہ وہی ایک ذات ہے جس کی طرف جھکنا ،راغب ہونا اور رجوع کرنا فطری اور لابدی امر ہے گویا ''اللہ'' کے کلمات اس حقیقت کا کھلا اعلان کر رہے ہیں کہ اے انسان تو چاہے جتنا سرکش و باغی بن جا۔ اپنے رب کی اطاعت وغلامی سے جتنا بھی منہ موڑ لے۔ سرکش و باغی شخص بھی بالآخر اسی کی طرف جھکتا ہے، اس کی ذات سے دل کا علاقہ جس قدر چاہے، منقطع کرلے ،لیکن جب بھی تجھ پر آفت ومصیبت کی گھڑی آئے گی ساری دنیا کے اسباب وذرائع سے تو کلیۃً مایوس ہو جائے گا اور کسی چیز پر بھی تیری کوئی امید باقی نہ رہے گی تو اس وقت تیرا دل عاجزی اور شکستگی کے ساتھ بے اختیار ذات باری تعالیٰ کی طرف جھک جائے گا، تو اسے والہانہ رغبت اور رجوع کے ساتھ پکار اٹھے گا کہ اے اللہ مجھے بچالے اور میرے حال پر رحم فرما، تیرے لاشعور کی یہ دبی ہوئی آواز بلند ہو جائے گی۔ جب سب امیدیں ٹوٹ جائیں اور صرف ایک ہی امید باقی رہ جائے تو وہ امید ''اللہ تعالیٰ'' کی ذات رحیم وکریم کی ہوتی ہے اس وقت ہر انسان خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ موحد ہو مشرک، مومن ہو یا کافر ملحد بلا استثناء اسی ذات کو پکارتا ہے اور دل اس کے سوا کسی اور جانب جھکنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ طبعی و فطری حقیقت ہر صورت میں رونما ہو کر رہتی ہے۔ خواہ بندہ اسے کوئی بھی نام دے دے۔ اس ہستی کو خدا کہے یا کوئی اور ماورائی طاقت لیکن اس کا دل کسی عظیم ہستی کے تصور سے پسیجتا ضرور ہے۔ بس یہی ذات وحدہ لاشریک ہے اور اسی کا نام ''اَللّٰہُ'' ہے۔

لفظِ اللہ اور لفظِ انسان کا معنی

مزید برآں جب 'اَللّٰہُ' کے لفظ میں اس کی طرف راغب ہونے کا معنی موجود ہے تو اس کے بالمقابل انسان ہی سب سے زیادہ مستحق ہستی ہے جو اس کی طرف سب سے بڑھ کر راغب اور مانوس ہو کیونکہ لفظ 'انسان' بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ 'انسان' کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ 'اُنس' سے ماخوذ ہے اور دوسرے یہ کہ 'نسیان' سے۔ پہلے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا 'مانوس ہونے والا' جب کہ دوسرے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا 'بھولنے والا''۔ ان دونوں معنوں میں کوئی تضاد ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ انس

سبب ہے اور نسیان اس کا نتیجہ ۔ جب انسان کسی سے مانوس ہوتا ہے اور محبت کرنے لگتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ محبوب کے ما سوا کو بھولتا جاتا ہے، جب انس ومحبت کمال کو پہنچتے ہیں تو وہ محبوب کے علاوہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی بھی ہوش اور خبر باقی نہیں رہتی۔

ذاکر همه ذکر و ذکر مذکور شود

گویا یہی نسیان اس کے انس کے کامل ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔ اب ایک طرف اللہ جلوہ حسن کے طور پر موجود ہے اور دوسری طرف 'اِنسان' اس کی جانب راغب اور مانوس ہونے کے لئے۔ چنانچہ وہ ذات جس کیطرف محبت کرنے والے دل جھکتے اور راغب ہوتے ہیں ذات باری ہے۔ اور جو افراد اس حسن ازل کی محبت میں گرفتار ہیں 'کامل اِنسان' ہیں یہی پیغام محبت لفظ اللہ کے ذریعے بنی نوع انسان کو دیا جارہا ہے کہ اے افراد نوع انسانی !زوال پذیر حسن کے جلووں سے دل لگانے کی بجائے اس لازوال حسن کے گرویدہ ہو جاؤ۔ اسی کی طرف لپکو اور اسی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھو کیونکہ اس کی محبت میں جو موت آئے گی وہ حیات ابدی کا پیش خیمہ ہوگی۔

آٹھواں مادۂ اشتقاق : الہ (عطا کرنا ، پناہ دینا)

اس مادے کے اعتبار سے لفظ ''اللہ'' اس معنی پر دلالت کرتا ہے کہ وہی وہ ذات ہے جو ہر ایک کو پناہ دینے والی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ۔

(القرآن، المومنون، ۲۳: ۸۸)

''اور جو پناہ دیتا ہے اور جس کے خلاف (کوئی) پناہ نہیں دی جا سکتی۔''

پناہ دینا مصیبت زدہ افراد کے لئے سب سے بڑی نعمت اور عطا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جتنی بھی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہیں، وہ فی الحقیقت انسان کا اپنا کسب نہیں ہیں۔ آنکھوں کی بصارت ہو یا

کانوں کی سماعت، زبان کا ذائقہ ہو یا ہاتھ پاؤں کی حرکت۔ دماغ کی فکری قوت ہو یا طبعی ونفسانی لذات۔ الغرض حیات دنیوی کی تمام نعمتیں اگر اللہ تعالیٰ عطا نہ کرے تو پیدائش سے لے کر تا دم مرگ انسان کسی وقت بھی ان کے حصول پر قادر نہیں ہو سکتا۔ جب خود زندگی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دین ہے تو اس کے لوازمات وانعامات اس کی عطا کیوں نہ ہوں، قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔

(القرآن، النحل، ۱۶: ۵۳)

''اور تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے سو وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔''

ارشاد الٰہی ہے:

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ۔

(القرآن، الانعام، ۶: ۱۴)

''اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور (خود اسے) کھلایا نہیں جاتا۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔

(القرآن، النساء، ۴: ۷۸)

''آپ فرما دیں (حقیقتاً) سب کچھ اللہ کی طرف سے (ہوتا) ہے۔''

چنانچہ لفظ 'اللہ' کی معنوی افادیت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو سب کچھ عطا کرے لیکن خود کچھ نہ لے۔ اسی لئے وہ خود کو الصمد (بے نیاز) کہتا ہے۔ یہاں یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے عبادت کا طلب گار ہے۔ نہیں نہیں۔ عبادت اس کی نہ ضرورت ہے اور نہ اجرت، بلکہ عبادت در اصل خشوع وخضوع، تذلل انکساری اور عاجزی کی انتہائی صورت کا نام ہے۔ اس لئے اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کو سائل بننے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، تا کہ اس کی بارگاہ صمدیت سے کچھ مانگنے کا ڈھنگ آ جائے اور وہ ذات اپنے بندے کی عاجزی دیکھ کر اسے مزید لطف وکرم سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ کا علی الاطلاق مجیر ومعطی ہونا اس حدیث صحیح سے کتنا واضح ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ۔

(صحیح مسلم، ۱:۳۳۳، کتاب الزکوۃ، رقم: ۱۰۳۷)

''بے شک تقسیم میں ہی کرتا ہوں لیکن عطا اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔''

گویا انبیاء کرام بھی روئے زمین پر باری تعالیٰ ہی کی نعمتوں اور عطاؤں کو تقسیم کرنے کے لئے تشریف لاتے رہے۔

متذکرہ بالا تمام معانی کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی کامل دلالت کے لئے الله سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں آ سکتا اس لئے اسے شہادتِ توحید میں استعمال کیا گیا۔

الله کا نواں مرادی مفہوم

الله سے مراد وہ کلی طور پر بااختیار ہستی ہے جو غالب الارادہ ہے یعنی جس کے ارادہ و منشاء کے سامنے ہر دوسرا ارادہ وعزم مغلوب ہو اور جس کے چاہنے سے ''وجود'' اور نہ چاہنے سے ''عدم'' عبارت ہو اور اس کی مشیت کے آگے کائناتِ ارض و سما کی ہر مخلوق برضا و رغبت یا بامرِ مجبوری اپنی جبین خم کر رہی ہو۔

ارشادِ ربانی ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ○

(القرآن، حم السجدہ، ۴۱: ۱۱)

''اور پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی درآنحالیکہ وہ اس وقت دھواں تھا۔ پس اس (آسمان) کو اور زمین کو حکم دیا کہ حاضر ہو جاؤ طوعاً وکرہاً دونوں نے عرض کیا ہم دست بستہ حاضر ہیں۔''

اس آیہ کریمہ سے مترشح ہوا کہ اس حسین وجمیل اور منظّم و مربوط کائنات کا نظام

رب العزت کے زبردست ارادے اور بلند پایہ عزم نے سنبھال رکھا ہے۔ یہ اسی کے حسن انتظام کا کرشمہ ہے کہ سورج اپنے مقام سے وقتِ مقررہ پر طلوع ہوتا ہے اور اپنی منازل طے کرتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ چاند اپنی حیات افروز کرنوں سے پھلوں میں لذت و حلاوت اور پھولوں میں نکہت و رنگ پیدا کرتا ہے۔ موسمِ بہار میں پھول کھلتے اور کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ ہوائیں بوجھل بادلوں کو اپنی کمر پر لادکر دور دراز خطوں میں پہنچاتی رہتی ہیں۔ اگر بالفرض محال اس کائنات میں رب العزت کی ذات کے سوا کوئی اور ہستی ارادے اور قدرت میں اس کے مساوی ہوتی تو نظامِ عالم کب کا درہم برہم ہو گیا ہوتا۔

ارشادِ خداوندی ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا

(القرآن، الانبیاء، ۲۱: ۲۲)

''اگر (آسمان و زمین کی کائنات میں) اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔''

ایک زبردست متصرف الوجود اور غالب الارادہ ہستی جو اتنی بڑی اور وسیع و لامتناہی کائنات کے نظام کو بے مثال نظم و توازن سے تنہا چلا رہی ہے وہی الوہیت کی مستحق ہے۔ دو الٰہوں کا وجود عقل و منطق کی رو سے بعید از فہم ہے۔ اگر برائے بحث یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کائنات میں دو الٰہ ہیں اور دونوں غالب الارادہ ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مغلوب الارادہ اور مفتوح نہیں ہے تو دو ممکنہ صورتیں ہوں گی۔ پہلی صورت میں بفرضِ محال ایک شخص پر ان دو مختلف الٰہوں کے ارادے کام کر رہے ہوں جن میں سے ہر ایک کی صلاحیتیں اور قدرتیں دوسرے کے مساوی ہیں۔ اگر ایک الہ چاہے کہ یہ شخص بیمار ہو جائے اور دوسرے کی خواہش ہو کہ وہ صحتمند رہے یعنی ایک غالب الارادہ الٰہ اسے بیمار کرنے پر اور دوسرا اس کی استمرار صحت مندی پر مصر ہو۔ اس صورتحال میں کونسی حالت برقرار رہ سکتی ہے۔ لامحالہ ان متضاد ارادوں کے نفاذ کی کشمکش میں مذکورہ شخص اپنے وجود ہی سے اس طرح ہاتھ دھو بیٹھے گا جس

طرح دو برابر قوتوں کے مابین معرکہ آرائی میں میدانِ جنگ بننے والا علاقہ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یا تو وہ شخص بیمار پڑ جائے گا یا صحتمند رہے گا۔ اندریں صورت لامحالہ ایک الہٰ کا ارادہ غالب ہو گا اور دوسرے کا مغلوب، اب وہ ہستی جس کا ارادہ مغلوب ہو گیا اور وہ اس شخص پر اپنا ارادہ نافذ نہ کرسکی کبھی الہٰ نہیں ہوسکتی لہٰذا عقلاً کائنات ارض و سما میں ایک الہ برحق کے سوا کسی اور ہستی کی طرف نسبت الوہیت قائم کرنا محال ہے۔

اس امر کی مزید توضیح ایک اور مثال کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو، ایک الہ اس شخص کو موت سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے اور دوسرا اسے زندہ رکھنے پر مصر ہے۔ اب یا تو وہ شخص زندہ رہے گا یا پھر مر جائے گا۔ اگر وہ شخص زندہ رہا تو اس کی موت پر مصر الہ کا ارادہ نافذ العمل نہ ہو سکا اور اگر وہ مر گیا تو اسے زندہ دیکھنے والے الہ کا ارادہ مغلوب رہا حالانکہ الہ تو ہوتا ہی وہ ہے جس کا ارادہ مغلوبیت اور ناکامی کے تصور سے بھی ناآشنا ہو اور بہر صورت نافذ ہو کے رہے۔

ان مثالوں کے بیان کرنے کا مقصود یہ نکتہ ذہن نشین کرنا ہے کہ کائنات میں دو الٰہوں کا تصور بھی عقل و منطق کی رو سے ناممکنات میں سے ہے، چہ جائیکہ دو سے زیادہ تعداد میں الہٰ کا وجود تسلیم کر لیا جائے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ان کے ارادے ہمیشہ باہم متفق ہی ہوں۔ لازماً کبھی نہ کبھی ان میں اختلاف و تفاوت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اس صورت میں اختلاف صرف اسی طرح رفع ہوسکتا ہے کہ ایک الہٰ اپنے ارادے کو غلط، باطل یا مغلوب سمجھتے ہوئے دوسرے الہٰ کے ارادے کے نفاذ کو قبول کر لے اور خود اپنے ارادے کے نفاذ سے دستبردار ہو جائے۔ اب جس کا ارادہ نافذ ہو گیا وہ تو صاحبِ قدرت اور غالب الارادہ الہٰ قرار پایا اور جس کا ارادہ نفاذ کے اعتبار سے تشنہ رہا وہ مغلوب الارادہ ہو گا اور کوئی الہٰ مغلوب الارادہ نہیں ہوسکتا لہٰذا تعددِ الوہیت کا تصور عقلاً و نقلاً بعید از فہم

اور نا قابل التفات ہے۔

اسی بناء پر قرآنِ حکیم میں توحید باری تعالیٰ کی سب سے بڑی دلیل یہی قرار پائی اور نظامِ عالم میں نظم و قاعدہ اور توازن کی کارفرمائی اور اتنی بڑی کائنات کی حرکت پذیری میں کجی و ناہمواری کا فقدان پکار پکار کر شہادت فراہم کر رہا ہے کہ ایک ہی کامل اور اکمل ذات الوہیت کی سزاوار و حقدار ہے اور اگر بالفرض خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہوتا تو پھر کائنات کا نظامِ عدل پر استوار رہنے کی بجائے آماجگاہ فتنہ و فساد بن جاتی اور پھر یہاں زمین ہوتی نہ زمینی مخلوق، آسمان ہوتا نہ سیارگانِ فلک کی گردش اور چمک دمک۔

اللہ کے جملہ مفاہیم کا مجموعی تاثر

متذکرہ بالا مفاہیمِ الوہیت پر علمی مباحث کا خلاصہ اور لبِ لباب یہ ہے کہ کائنات ارضی و سماوی میں صرف وہی ایک ہستی ہی الٰہ ہونے کی سزاوار اور مستحق ہے جس کے فہم و ادراک سے عقل انسانی قاصر ہو اور سوچ کو سوائے تحیّر و درماندگی کے کچھ ہاتھ نہ آئے اور جس کی جستجو میں عقل و خرد گم ہو جائیں لیکن بلندی، عروج اور ماورائیت سے متصف ہونے کے باوجود وہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا و درماں، باعث تسکین قلب و جاں اور متلاشیانِ حق کے لئے ہر آن سکون و طمانیت اور حقیقی راحت کا سامان ہو۔ وہ ذات غالب الارادہ اور متصرف الوجود ہو عطا کرنے والی اور سب کے دامنِ مراد کو مالا مال کرنے والی ہو، اس ذات کے آگے سب مخلوق اپنی جبینِ عبودیت خم کردے۔

حقیقتِ توحید

قبل ازیں مختلف مادہ ہائے اشتقاق کی رو سے لفظ الٰہ کا مفہوم تفصیلاً بیان کیا گیا اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ تصورِ توحید کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے لفظِ الٰہ کے معانی و مطالب کو مدِّنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اب رب العزت کا اسمِ جلالت ''اللہ'' کا معنی و مفہوم بیان کیا جا رہا ہے جس سے حقیقتِ توحید کو سمجھنے میں یقیناً سہولت ہو گی اور قارئین پر

ایک اثر آفریں کیفیت میں عملی توحید کی حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔ انشاء اللہ

لفظ اللہ کا مفہوم

لفظِ الٰہ پر الف، لام داخل کرنے سے لفظ اللہ بن جاتا ہے جس کا مطلب ہے سچا اور حقیقی معبود، اب یہ لفظ بالتخصیص رب العزت کی ذات کے لئے وقف اور مخصوص ہو کر رہ گیا ہے اور اس طرح لفظ اللہ میں معنوی وسعت اور ہمہ گیری کی بناء پر الٰـہ کے تمام مفاہیم شامل ہو گئے ہیں۔

شہادتِ توحید کا مفہوم

اس اعتبار سے شہادتِ توحید کا مفہوم یہ قرار پاتا ہے کہ بندہ دل کی گہرائیوں سے یہ شہادت دے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی ہستی ایسی ہے جس سے بڑھ کر عظمت و رفعت اور شانِ کبریائی کا تصور بھی محال ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی کو قدرت و طاقت حاصل نہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی علیم و خبیر نہیں۔ اس کے سوا کوئی سزاوارِ پرستش نہیں۔ اس کا ارادہ اتنا قوی اور غالب ہے کہ اسے تمام دنیا اور کائنات میں سب مل کر بھی مغلوب نہیں کر سکتے۔ اس کی قدرتیں اور تصرفات حدود و قیود سے باہر اور حیطہءشعور سے ماوراء ہیں۔

لفظ اللہ کا ہر حرف معنوی دلالت میں کامل ہے

بطور اسمِ ذات لفظ اللہ جن حکمتوں کا حامل ہے ان میں ایک حکمت اس کی لفظی ترکیب میں مضمر ہے۔ یہ لفظ اس نادر خوبی کا مالک کہ اگر اس میں سے کوئی حرف حذف کر دیا جائے تب بھی بقیہ حروف معنوی اعتبار سے ذاتِ باری تعالیٰ پر ہی بتمام و کمال دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ کا پہلا حرف ''الف'' حذف کر دیا جائے تو ''للہ'' رہ جاتا ہے جس کا معنی ہے ''اللہ کے لئے''۔ اب پہلا حرف رہنے دیں اور دوسرا حرف ''لام'' گرا دیں تو ''الہ'' رہ جائے گا جو معبود کے معنوں میں مستعمل ہے۔ پہلے دونوں حروف، الف اور لام حذف کر دیں تو ''لہٗ'' رہ جائے گا جس کے معنی ''اس کے لئے'' آتے ہیں۔

اللہ کے پہلے تین حروف الف، لام، لام حذف کر دیئے جائیں تو باقی ''ہ'' رہ جائے گا جو باری تعالیٰ کے اسمِ ذاتی کی نشاندہی کرتا ہے اور ''ھو'' (وہ) کے معنوں میں بطور ضمیر بھی بولا جاتا ہے۔ اہل اللہ اکثر اس کا ذکر بالجہر کرتے ہیں۔ الغرض اپنی ترکیب لفظی میں ''اللہ'' جزوی اور کلی طور پر ذاتِ حق پر دال ہے اور اس کا کوئی حرف بے معنی نہیں۔ کوئی اسم اپنے مسمّٰی پر دلالت کرنے میں اس سے زیادہ کامل تصور پیش نہیں کرسکتا۔

واجب الوجود ہستی

قدیم فلاسفہ حکماء کے نزدیک یہ کائنات دو حصوں میں منقسم ہے:

۱۔ ممکن الوجود

۲۔ واجب الوجود

ممکن الوجود کے زمرے میں وہ سب وجود اور چیزیں شامل ہیں جن کا موجود و معدوم ہونا دونوں ممکن ہوں اور ان کے وجود پر کائنات کا انحصار نہ ہو، گویا دوسرے لفظوں میں ان کا وجود اور عدم برابر یکساں ہو۔ اگر ان مختلف النوع اشیاء کا کائنات میں وجود مان لیا جائے تب بھی درست ہے اور نہ مانا جائے تب بھی درست و جائز ہے۔ اس میں ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کائنات کی ہر چیز شامل ہے جبکہ اس کے برعکس واجب الوجود ہستی سے وہ ذات مراد ہے جس کے وجود پر کائنات کے وجود کا انحصار ہو اور اس کا ہر آن، ہر زمانے اور ہر کیفیت میں ہونا بہرحال ضروری ہو اور اس کے عدمِ وجود کا تصور بھی ناممکن و محال ہو۔ اس بناء پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز واجب ہے تو اس کا معنی لامحالہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ہونا لازمی ہے اور نہ ہونے کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ اس کا اطلاق صرف اور صرف باری تعالیٰ کی ذات مطلق پر ہوتا ہے کہ تنہا وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ازل سے موجود ہے اور ابدالاباد تک قائم و دائم رہے گی اور اسی کے وجود پر تمام کائنات کا دارومدار ہے۔ وہی حی و قدیم ذات ہے جس نے کائناتِ رنگ و بو کو خلعتِ وجود عطا کیا اور اس کے ایک ادنیٰ اشارے سے کارخانہ ہستی کا نظام درہم برہم ہوسکتا ہے۔ پس ایک

واجب الوجود ذات کا بلند و بالا اور برتر و اعلیٰ ہونا لازمی اور ضروری ہوتا ہے جبکہ ممکن الوجود کا پست و ادنیٰ اور ہر لحظہ معرضِ فنا و ہلاکت اور انہدام کی زد میں ہونا ایک امرِ واقعہ کی طرح ناگزیر ہوتا ہے اسی لئے ارشاد فرمایا گیا:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ○

(القرآن، القصص، ۲۸:۸۸)

''اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے حکم اسی کا ہے اور تم (سب) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

پھر فرمایا:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ○ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ○

(القرآن، الرحمٰن، ۵۵:۲۶-۲۷)

''جو کچھ بھی زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والا ہے اور صرف آپ کے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو نہایت بزرگی اور عظمت والی ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ ط

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۱۵)

''پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)''

دلائلِ توحید

مسئلۂ توحید جو ماسواللہ کے وجود کی نفی اور ذاتِ باری تعالیٰ کے اثبات کے مضمون پر دلالت کرتا ہے قرآنِ حکیم کے بنیادی اور اساسی موضوعات میں سے ہے۔ اس مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے متعدد دلائل و براہین قاطعہ جو قرآنِ حکیم سے مستنبط ہیں انہیں بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ توحید کے نظری دلائل

۲۔ توحید کے مشاہداتی دلائل

۱۔ توحید کے نظری دلائل

قرآنِ حکیم نے نظری استدلال کا انداز و اسلوب اختیار کرتے ہوئے اثباتِ توحید کے باب میں متعدد مقامات پر جو ارشاد فرمایا ہے یہاں اس کا محاکمہ مقصود ہے۔

پہلی دلیل

تصورِ توحید کو انتہائی مثبت اور اچھوتے انداز میں قرآنِ حکیم یوں پیش کرتا ہے:

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ○

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۶۳)

اور تمہارا معبود خدائے واحد ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہ) نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے انسان کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ توہماتی طور پر ہر اس وجود کو منصبِ اُلوہیت پر فائز کر کے اس کی بندگی اور پرستش کا خوگر بنا رہا ہے جس سے اس کی ذات کے لئے مادی منفعت کا کوئی پہلو نکلتا نظر آتا ہے۔ ایک نادیدہ خدا کا تصور اس کے لئے عجیب وغریب بات تھی۔ بقول اقبالؒ:

خوگرِ پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

اب اس کائناتِ رنگ و بو میں خدا کی ربوبیت نے جتنے بھی اسباب مہیا فرمائے اور مظاہرِ قدرت پیدا کئے ہیں وہ سب کسی نہ کسی طرح انسان کی خدمت بجا لانے اور اس کے لئے منفعت اندوزی کا سامان مہیا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انسان نے اپنی اس

ازلی اور فطری کمزوری کی بناء پر عناصرِ اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا اور ان کے متعلقات کو جن سے وہ کسی نہ کسی صورت میں تمتع حاصل کرتا رہا مقامِ الوہیت پر لا بٹھایا اور اپنی نادانی و کوتاہ نظری سے انہیں خدا یا خدا تک پہنچنے کا ذریعہ تصور کرتا رہا۔ متذکرہ بالا آیہ کریمہ میں اس باطل تصور کی نفی کرتے ہوئے انسان پر یہ حقیقت واشگاف کی جا رہی ہے کہ وہ ذات جو نفع رساں اور مسلسل اپنی بے پایاں رحمتِ عمومی کے خزانے نچھاور کرنے والی ہے ہی منصبِ الوہیت کی سزاوار اور اس لائق ہے کہ جبین نیاز اسی کے سامنے جھکائی جائے۔ وہی لازوال ہستی جو تمہارے معاش کی حاجتوں کو پورا کرنے والی اور معاد کی ضرورت کو بھی فراہم کرنے والی ہے اس بات کی مستحق ہے کہ تم اپنا سر تسلیم اور جبین بندگی اسی کے سامنے خم کرو اور سبھی معبودانِ باطلہ کی پرستش و بندگی سے باز آ جاؤ۔

دوسری دلیل

قرآنِ حکیم ایک اور مقام پر اسی عقلی و نظری استدلال کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان کو تخلیق کائنات اور اختلافِ لیل و نہار کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُوْلِی الْاَلْبَابِ○

(القرآن، ال عمران، ۳: ۱۹۰)

بے شک زمین اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں عقل سلیم والوں کیلئے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

انسان کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی طرف مبذول کرائی جا رہی ہے کہ یہ کائناتِ ارضی و سماوی تو خود مخلوق ہے لہٰذا یہ الٰہ کیسے ہوسکتی ہے۔ منصبِ الوہیت پر فائز ہونے کی حقدار تو وہی ذات ہوسکتی ہے جو پیدا نہ کی گئی ہو، اس لئے کہ پیدا کی جانے والی ذات حادث تصور ہوگی اور حادث ذات کبھی الٰہ نہیں ہوسکتی۔ یہ بسیط و بیکراں ارضی و سماوی

کائنات محیط ہے اور جو کچھ اس میں ہے محاط ہے۔ محیط ''کل'' ہے اور محاط ''جزو'' ہے اور دونوں میں قدرِ مشترک ان کا مخلوق ہونا ہے۔ جب ''کل'' کو الوہیت کا سزاوار نہیں گردانا جا سکتا تو جزو کو ''الوہیت'' کا حقدار و سزاوار کیسے تصور کیا جا سکتا ہے۔

تیسری دلیل

قرآن مجید میں ایک مقام پر اللہ رب العزت نے اپنی خالقیت و ربوبیت کو اپنی الوہیت و معبودیت کی عقلی دلیل کے طور پر اِن الفاظ میں پیش کیا ہے:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَo الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلاَ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَo

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۱-۲۲)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور اُن لوگوں کو (بھی) جو تم سے پیشتر تھے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمانوں کی طرف سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے تمہارے کھانے کیلئے (انواع و اقسام کے) پھل پیدا کئے، پس تم اللہ کیلئے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم (حقیقتِ حال) جانتے ہو۔

اس آیہ کریمہ میں ''والذین من قبلکم'' تک باری تعالیٰ نے اپنی خالقیت اور ربوبیت کا ذکر کر کے اس بات کی شہادت دی ہے کہ آسمانی اور زمینی کائنات میں بس اسی کی ذات معبود ہونے کے لائق ہے اور اسی نے ہر شئے کو پردۂ کتم سے باہر نکال کر خلعتِ وجود بخشا ہے اور ہر ایک کے لئے مادی و جسمانی ضرورتوں کا سامان فراہم کیا ہے۔

یہاں گویا مقصود اس حقیقت کی نشاندہی ہے کہ بنی نوعِ انسان کے تمام گذشتہ اور آئندہ نسلوں اور انسانیت کے تمام طبقوں کو معرضِ وجود میں لانے والی اور ان کی

ضروریات کی کفالت کرنے والی واحد ہستی ہی اس امر کی مستحق ہے کہ اس کے سامنے سر بندگی اور جبین نیاز خم کی جائے۔ اس اندازِ استدلال سے اس بات کا استشہاد کیا گیا ہے کہ جب سب کو پیدا کرنے والی اور پرورش و تربیت کرنے والی ذات ربِ ذوالجلال کی ہی ہے تو انسان کس برتے پر معبودانِ باطلہ کو اس کے ساتھ عبادت میں شریک کرتا ہے۔ گویا خالقیت و ربوبیت میں یکتا و واحد ہونا اس کی الوہیت و معبودیت میں یکتا و واحد ہونے پر محکم دلیل کا حکم رکھتا ہے کیونکہ یہ بات عقلِ سلیم کے خلاف ہے کہ انسان کو پردہ نیست سے وجود میں لانے والی اور اس کی تمام فطری و جبلی ضرورتوں کی تکمیل و تسکین کا سامان فراہم کرنے والی تو اس کی ذات ہو اور وہ عبادت کسی اور کی کرتا پھرے۔ جب وہ اوّلین و آخرین سب کا خالق و مالک اور پروردگار ہے تو اسے چھوڑ کر کسی مخلوق کی عبادت کرنا یا اللہ کی عبادت کے ساتھ اس کو شریک کر لینا عقل و فہم کی رو سے کب جائز اور رَوا ہو گا۔

۲۔ توحید کے مشاہداتی دلائل

خدا کی ہستی اور اثباتِ توحید پر قرآنِ حکیم کا طرز و اسلوب استدلال اس ہمہ گیر ربوبیت کے نظام میں تعلق و تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے جو اس کائناتِ بسیط میں ایک خاص نظم و قانون میں منسلک ترتیب و قاعدے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن جابجا انسان کو عالم انفس اور آفاق میں تدبر کی دعوت دیتا ہے اور اس سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی اور اس کائنات کی خلقت پر غور و فکر کرے اور دیکھے کہ یہ کارخانہ حیات کس نظم و انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ انسان اگر غور کرے تو خو اپنی پیدائش اور عالمِ گرد و پیش کے مشاہدات اس پر عرفانِ ذات اور معرفتِ توحید باری تعالیٰ کے بہت سے سربستہ راز وا کریں گے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم نے جن دلائل سے ذاتِ باری تعالیٰ کی تائید پر استشہاد کیا ہے ان میں سے چند کا اجمالی تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پہلی دلیل

اگر گوشِ ہوش اور دیدہ بینا کو وا کر کے ہم کائنات کی کھلی کتاب کا مطالعہ کریں تو

اس کے ورق ورق سے ایک پروردگار کے وجود کا اعلان ہوتا دکھائی دے گا۔ اس کے اندر سے یہ پکار سنائی دے گی کہ اس کائنات کی تخلیق بالحق ہوئی ہے۔ انسان بے ساختہ اس بات کے اقرار پر مجبور ہو گا کہ

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً ج

(القرآن، ال عمران،۳: ۱۹۱)

اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا۔

اگر انسان مقصد و غایتِ تخلیقِ عالمِ ارضی و سماوی میں تفکر کرنے لگے تو اس کے وجدان میں یہ غیبی صدا آئے گی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ○

(القرآن، الدخان،۴۴: ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور اس کو جو ان کے درمیان ہے محض تفریع طبع کیلئے نہیں بنایا۔

یہاں تخلیق بالباطل کی نفی کرتے ہوئے اسے لہو ولعب سے تعبیر کیا ہے یعنی اس کائنات کی کوئی شئے بے غرض و بے مدعا پیدا نہیں کی گئی۔

دوسری دلیل

قرآن اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان کائنات میں کارفرما نظامِ ربوبیت کا بے لاگ مطالعہ کرنے بیٹھے اور اس کے وجدان میں ایک رب العالمین ہستی کے ہونے کا یقین انگڑائیاں نہ لینے لگے۔ یہ ممکن ہے کہ انسان سرکشی، تمرد اور غفلت کی بناء پر ہر چیز سے انکار کر دے لیکن وہ اپنی فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کی فطرتِ سلیمہ کے خمیر میں خدا پرستی کا جذبہ خوابیدہ حالت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جب اس کی غفلت کا پردہ چاک ہوتا ہے تو اس کا وجدان خود اس کی رہنمائی کر کے اسے اس

کے مدعا و منتہٰی تک پہنچا دیتا ہے چنانچہ قرآنِ حکیم اس حقیقت کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ○ وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ○

(القرآن، القیامہ، ۷۵: ۱۴-۱۵)

بلکہ انسان خود بھی اپنی حالت پر مطلع ہوگا اگر چہ (اس وقت بھی وہ) اپنے حیلے (بہانے) پیش کرے گا۔

وہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر خود اس کے باطن سے جواب طلب کرتا ہے:

وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْر

(القرآن، یونس، ۱۰: ۳۱)

اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور (کون) نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون ہے جو انتقام فرماتا ہے ہر کام کا۔

تیسری دلیل

قرآنِ حکیم میں ایسے مقامات جن میں ایک وسیع البنیاد (Broad Based) نظامِ ربوبیت سے توحیدِ باری تعالیٰ پر استدلال کیا گیا، بے شمار ہیں۔ یہاں طوالت کے خوف سے صرف چند ارشادات پر اکتفاء کیا جائے گا۔

انسان سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا گیا:

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِہٖٓ ○ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ○ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ○ فَاَنْبَتْنَا فِیْھَا حَبًّا ○

(القرآن، عبس، ۸۰: ۲۴-۲۷)

پس انسان کو چاہئے کہ اپنی غذا کی طرف دیکھے (اور غور کرے) بے شک ہم

نے خوب زور سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے زمین کو پھاڑ کر چیر ڈالا پھر ہم نے اس میں اناج اُگایا۔

یہاں ’’فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ ‘‘ کے ابتدائی کلمات ہی انتہائی فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ انسان ہر چیز سے غافل ہوسکتا ہے لیکن وہ اپنی خوراک کی طرف سے آنکھیں نہیں موند سکتا۔ وہ دانہ گندم پر بیج سے پودا بننے کے نامیاتی عمل پر غور کرے تو نظامِ کائنات کے باطن میں جھلکنے والی ربوبیت اسے اس کارخانہ حیات کے پیدا کرنے والی ہستی کا سراغ دے گی۔

سورہ نحل میں خدا کے کارخانہ ربوبیت کی مثال شہد کی مکھی سے انتہائی بلیغ پیرائے میں دی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ○

(القرآن، النحل، ۱۶: ۶۸)

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں (خیال) ڈال دیا کہ تو بعض پہاڑوں میں اپنے گھر بنا اور بعض درختوں میں اور بعض چھپروں میں (بھی) جنہیں لوگ (چھت کی طرح) اونچا بناتے ہیں۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جسے پرورش کی احتیاج نہ ہو۔ جس طرح ہر چیز جو مخلوق ہے اپنے خالق پر دلالت کرتی ہے اسی طرح ہر چیز جو مربوب ہے اس کے لئے لازمی و لابدی ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہو۔

رحمِ مادر میں پرورش پانے والے جنین (Foetus) کو غذا پہنچانے کے پیچیدہ (Complex) نظام کے مطالعہ سے نظامِ ربوبیت کی وہ کرشمہ سازیاں عیاں ہوتی ہیں جو کسی پرورش کرنے والی ہستی کی خبر دیتی ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہر ایک کو پرورش مل رہی ہو اور پرورش کرنے والی کوئی ذات موجود نہ ہو، تخلیق موجود ہو اور کوئی متصرف الوجود ہستی اس

کی خالق نہ ہو۔ خود بخود تخلیق Spontaneous Creation کے تصور کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں اور اس کی لغویت (Absurdity) اتنی آشکارا (Obvious) ہے کہ غیر جانبدار تعقل و تفکر سے انسان خدا کے وجود کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اثباتِ توحید کے خاموش دلائل

کائناتِ ہست و بود کے نظام میں حرکت پذیر تمام اجرامِ ارضی و سماوی اثباتِ توحید پر خاموش دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ زمین، یہ چاند، سورج، ستارے، شجر و حجر، بادل، لہلہاتے کھیت، مترنم آبشاریں، فلک بوس پہاڑ، سمندر کی لہروں کا تموّج، سب اگرچہ قوتِ گویائی نہیں رکھتے لیکن زبانِ حال سے توحید کی دلالت کرتے اور اس بات کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ اس متوازن اور نظم و ضبط کے تحت چلنے والے کائناتی نظام کے پیچھے ایک ہی ہستی کا دستِ قدرت کارفرما ہے جو ربوبیت، الوہیت کی سزاوار ہے اور ارض و سماوات کی جملہ مخلوقات کی عبادت کے لائق، لیکن کائنات میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جسے ''برھان من ربکم'' کے عنوان سے معنون کیا گیا ہے اور جو الوہیتِ خداوندی پر ناطق دلیل ہے وہ ہے ذاتِ مصطفوی ﷺ پھر جو خدا مخلوق میں ذاتِ مصطفوی ﷺ جیسی بے نظیر اور بے مثیل ہستی پیدا کر سکتا ہے کوئی خود اس کا مثل اور عدیل کیسے ہو سکتا ہے۔ ذاتِ باری کے وجود اور اثبات توحید پر وجودِ مصطفوی ﷺ ایسی ناطق دلیل ہے کہ جس کی توجہات سے خاموش دلیلیں بھی ناطق دلیلوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں مثلاً:

چاند، توحیدِ ذاتِ باری پر خاموش دلیل تھا، انگشت مصطفوی ﷺ سے دو نیم ہو کر ناطق دلیل بن گیا۔

سورج اثباتِ توحید پر ساکت دلیل تھا، اشارہ مصطفوی ﷺ سے غروب ہوتے ہوئے واپس پلٹ آیا اور دلیل ناطق بن گیا۔

ابوجہل کی مٹھی میں کنکریاں توحید باری کی خاموش دلیل تھیں، توجہ مصطفوی ﷺ سے ذکر کناں ہو کر ناطق دلیل بن گئیں۔ یہی نگاہِ مصطفوی ﷺ تھی کہ جس طرف اٹھی

خاموش و ساکت دلائل کو ناطق بنا کر رکھ دیا اور اپنی نسبت ”برھان من ربکم“ کا حق متحقق کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ جو شخص توحید خداوندی پر موجود خاموش دلائل کو مان کر خدا کی ہستی پر ایمان لاتا ہے اور اپنی عقل و فہم سے اس کی معرفت کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کے جادۂ حق سے بھٹک جانے کا امکان و احتمال ہے کیونکہ یہ دلائل نشانِ راہ تو ہیں چراغِ منزل نہیں ہیں لیکن اس کے برعکس وہ شخص جس نے اس واحد دلیل ناطق کو مان کر ذاتِ باری تعالیٰ کی الوہیت و وحدانیت کا اقرار کیا خود اثباتِ توحید پر ناطق دلیل بن گیا اور ہمیشہ کے لئے امکانِ ضلالت و گمراہی سے محفوظ و مامون ہو گیا اس لئے کہ واسطۂ مصطفوی ﷺ سے توحید باری تک رسائی اس تیقن کو پیدا کر دیتی ہے جس کے بعد ریب و تشکیک کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور خدا کا تصور انسان کے وجدان میں شامل ہو کر اس کا جزوِ لاینفک بن جاتا ہے۔

اثبات پر نفی کو مقدم کرنے کی حکمت

اله کا مفہوم اور حقیقتِ توحید واضح کرنے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ کلمہ طیبہ میں اثبات سے پہلے نفی کو کیوں لایا گیا۔ اثبات کو مقدم اور نفی کو موخر بھی تو کیا جا سکتا تھا مگر ایسا کیوں نہیں کیا گیا۔ جان لینا چاہئے کہ یہ امر خالی از حکمت نہیں، فی الحقیقت کلمہ طیبہ میں نفی کی تقدیم اس بات کا اعلان ہے کہ جب تک قلبِ سلیم ماسوااللہ کی کامل نفی نہیں کرتا اور اس سے نفع و نقصان کی تمام تر امیدیں منقطع نہیں کر لیتا اس وقت تک کلمہ طیبہ میں مضمر تصورِ توحید کے اثباتی اثرات قلب پر مترتب نہیں ہو سکتے لہٰذا اگر کوئی شخص چشمۂ عبودیت سے اپنی سیرت و کردار کو سیراب اور نورِ ایمان سے قلب و باطن کو منور کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے تمام معبودانِ باطلہ کا انکار کرے اور بارگہِ الوہیت میں اپنی جبین نیاز جھکا دے۔ اگر وہ اپنے باطن میں معبودانِ باطلہ کو جگہ دیئے ہوئے ہو اور اس نے اپنے نہاں خانہ دل میں طرح طرح کے بت سجا رکھے ہوں تو زبان سے کلمہ طیبہ کا ورد الاپتے رہنا چہ معنی دارد؟ اس کے دعویٰ ایمان کو سوائے منافقت کے اور کس چیز پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بندے کا دل ماسوااللہ کے خوف سے آشنا

ہوتو خدا کی الوہیت کو ماننے کا حق ادا نہیں ہوسکتا اسی لئے پہلے لوحِ قلب کو ہر باطل کی محبت اورخوف سے پاک اور صاف کرنا ضروری ہے کیونکہ جب تک دل باطل کی محبت اور خوف سے آزاد نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر انوارِ الٰہیہ کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ انسان کا دل ہر جھوٹی محبت اور جھوٹے خوف سے بے نیاز ہوکر ہی موردِ الطافِ الٰہی ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ایمان صرف قبولِ حق ہی کا نام نہیں بلکہ ماسوااللہ کی نفی سے بھی عبارت ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ حکیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَاانْفِصَامَ لَهَا

(القرآن، البقرہ،۲: ۲۵۶)

’’سو جو کوئی معبودانِ باطل کا انکار کر دے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے ایک ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کے لئے ٹوٹنا (ممکن) نہیں۔‘‘

کلمہ طیبہ اسی نکتہ کی تعلیم دیتا ہے کہ مومنانہ طرزِ زندگی میں باطل قوتوں کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت و مداہنت کی کوئی گنجائش نہیں۔ مومن کسی بھی حال میں نہ کبھی باطل کے سامنے سرنگوں ہوسکتا ہے اور نہ کبھی اسے تسلیم کرسکتا ہے۔

شرک کا مفہوم اور اس کے مضمرات

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ توحید کی ضد شرک ہے۔ خدا کی ذات و صفات میں کسی اور کو اس کا شریک وسہیم گردانننے کو شرک کہتے ہیں لیکن اگر کسی ہستی کے لئے ایک وصف ثابت ہو مگر کم اور مستعار درجے کا جو اس کی شانِ مخلوقیت کے لائق ہو اور خدا کے لئے وہی وصف ثابت ہو مگر کامل درجے کا اور اس کی شانِ خالقیت کے لائق تو احتمالِ شرک نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر قرآنِ حکیم انسان کو سمیع و بصیر (دیکھنے والا اور سننے والا) قرار دیتا ہے۔

فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا م بَصِیْرًا○

(القرآن، الدھر، ۷۶:۲)

پس ہم نے انسان کو سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے۔

انسان میں بلاشبہ یہ اوصاف سماعت و بصارت موجود ہیں لیکن کم تر اور ناقص درجے کے جبکہ رب العزت کی ذات ان اوصاف سے بالذات متصف ہے اور اس کے یہ اوصاف درجہ کمال پر متحقق ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْر

(القرآن، بنی اسرائیل، ۱۷:۱)

بے شک وہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بابت ارشادِ خداوندی ہوا:

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ

(القرآن، التوبہ، ۹: ۱۲۸)

’’(حضور ﷺ) مومنوں کے لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔‘‘

اور رب العزت نے خود اپنی نسبت بھی ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ

(القرآن، البقرہ،۲: ۱۴۳)

بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت فرمانے والا مہربان ہے۔

علی ہٰذا القیاس نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا

(القرآن، البقرہ،۲: ۱۴۳)

''اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول تم پر گواہ ہو۔''

اور خود اپنی بابت بھی اعلان فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡد

(القرآن، الحج، ۲۲: ۱۷)

''بے شک اللہ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے۔''

مذکورہ بالا صفات اور ان کے علاوہ بھی متعدد اوصاف میں خالق و مخلوق شریک ہیں مگر مختلف درجات و حیثیات کے ساتھ، اسی لئے ان تمام تقابلی صورتوں میں شرک کا احتمام پیدا نہیں ہوتا۔ شرک اس وقت لازم آتا ہے جب مخلوق میں خالق کے مساوی یا اس کے متوازی کوئی وصف تسلیم کیا جائے۔

اس تمہید کی روشنی میں اس اشکال کو رفع کرنا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کے بارے میں علمِ غیب کا عقیدہ رکھنے میں ہرگز ہرگز اس خیال کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ اس وصف میں حضور ﷺ خداوندِ ذوالجلال کے شریک و مساوی ہیں۔ حاشا وکلاّ ایسا اعتقاد کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس صحیح عقیدہ یہی ہے کہ خدا کا علم ذاتی، لافانی، مستقل بالذات، دائمی، ابدی اور غیر محدود ہے اور اس کو زوال و فنا نہیں جبکہ حضور ﷺ کا علم عطائی، وہبی، مستعار اور محدود ہے۔ ذہن میں اس اعتقاد کی کارفرمائی سے شرک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ شرک تو اس وقت ہو گا جب دونوں کے علمِ غیب کو ہم پلہ اور ہم مقدار قرار دیا جائے۔ چنانچہ محض کسی وصف میں خالق و مخلوق کی شرکت موجب شرک نہیں بنتی البتہ کیفیت و کیمیت کے اعتبار سے ان میں یکسانی کا عقیدہ موجب کفر و شرک ٹھہرتا ہے۔

شہادت کا مفہوم

شہادت کا لفظ شہود سے مشتق ہے اور شہود کا معنی بقول امام راغب اصفہانیؒ یہ

ہے:

الحضور مع المشاهدة اما بالبصر او بالبصيرة

(المفردات: ۲٦۷)

کسی چیز کا حاضری کے ساتھ مشاہدہ کرنا خواہ بصر (آنکھ) سے ہو یا بصیرت (عقل کی نگاہ) سے۔

اسی سے لفظ شاہد مشتق ہے اور قانون کی اصطلاح میں شاہد گواہ اس شخص کو تسلیم کیا جاتا ہے جو کسی وقوعہ کے وقت نہ صرف موقعہ واردات پر موجود ہو بلکہ آنکھوں سے اس واقعے کا مشاہدہ بھی کر چکا ہو۔ اگر کوئی شخص موقعہ پر موجود تو ہو لیکن بینائی اور بصارت سے محروم ہو تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی اس لئے یہ لازم ٹھہرتا ہے کہ شاہد اسی کو تصور کیا جائے جس نے واقعہ کا آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کیا ہو۔

دنیا میں حضور نبی اکرم ﷺ سے پہلے جتنے بھی انبیائے کرام تشریف لائے ان کا ایمان محض کلمہ توحید یعنی ''لاالہ الا اللہ'' پر ہوتا تھا۔ رب العزت نے چاہا کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی بھی ہو جس کا توحید پر محض ایمان ہی نہ ہو بلکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے دنیا کے سامنے الوہیتِ خداوندی پر ذاتی شہادت فراہم کرے اور اعلانیہ طور پر عامۃ الناس کو بتلا دے کہ میں یہ سب کچھ محض علم و بصیرت کی بنا پر نہیں بلکہ مشاہدے اور معائنے کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔ یہ مبارک و مسعود ہستی سرورِ کائنات ﷺ کی ہے۔ معراج کی شب آپ کو ملکوت السموت و الارض اور مکان و لامکان کی سیر کرائی گئی۔ کائنات کے ایک ایک ذرے کا مشاہدہ کرایا گیا۔ ان کے خواص و اوصاف پر مطلع کیا گیا اور سب سے آخر میں مشاہدہ رب ذوالجلال سے سرفرازی ہوئی۔ عبدِ کامل اور خالق کے مابین تمام حجابات اٹھا لئے گئے اور بالآخر آپ ﷺ قرب کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام پر جا پہنچے جس کی رفعتوں کا اندازہ بھی چشمِ تصور نہیں کر سکتی۔ جلوہ محبوب میں آنحضور ﷺ کے غایت انہماک اور قرب کا اعلان قرآن ان الفاظ میں کر رہا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی

(القرآن، النجم، ۵۳: ۱۷)

''نہ درماندہ ہوئی چشمِ مصطفیٰ اور نہ حد ادب سے آگے بڑھی۔''

شبِ معراج کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر آپ ﷺ کو کائناتِ ارضی و سماوی کا مشاہدہ کرایا گیا۔ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ رب العزت نے اپنے دست ِ قدرت کو میرے دونوں کندھوں کے درمیان ایسے رکھا کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اور برودت کو اپنے سینے میں محسوس کیا'' پھر فرمایا:

فتجلی لی کل شئ فعرفت۔

(ترمذی، الجامع الصحیح، ۵: ۳٦۸، کتاب تفسیر القرآن، باب فی سورۃ ص، رقم: ۳۲۳۵)

''پس مجھ پر ہر چیز منکشف ہو گئی اور میں نے (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے) سب جان لیا۔''

انہی مشاہدات کی بناء پر آپ کا علم محض سماعی اور قیاسی نہ رہا بلکہ حضوری اور مشاہداتی حیثیت اختیار کر گیا اسی لئے آپ ﷺ موجودات کائنات کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ کر پکار اٹھے کہ میں نے کائنات کو ایک سرے سے دوسرے تک دیکھ لیا ہے اور اس میں موجود ہر ہر ذرے، ہر ہر گوشے، شجر و حجر، جن و انس، ارض و سما، کائنات ِ بحر و بر الغرض کائناتِ عالم کی ہر ہر شئے کی حقیقت کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ میں بربنائے مشاہدہ گواہی دیتا ہوں کہ ان میں کسی میں بھی وصفِ الوہیت نہیں پایا جاتا البتہ اس کائنات میں فقط ایک ہستی ایسی ہے جو ہر قسم کی عبادت و طاعت کی سزاوار و مستحق ہے اور وہی نفع و نقصان کی مالک اور حاجت روا ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی محبت سے دل کی دنیا کو آباد رکھا جائے۔ اسی سے عجز و نیاز کا اظہار کیا جائے، اسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے، اسی کے سامنے جبین نیاز جھکائی جائے اور اسی کو قادرِ مطلق اور خودمختار مانا جائے۔ یہ واحد و یکتا ہستی اللہ رب العزت کی ہے۔ کلمہ شہادت اسی مفہوم سے عبارت ہے۔

حضور ﷺ کی شہادت کے بعد کائنات میں توحید باری تعالیٰ کی شہادت کا حق ادا ہو گیا۔ چنانچہ اب امت کے لئے کلمہ طیبہ ''لاالٰہ الا اللہ'' کہہ دینا ہی کافی ہے کیونکہ حضور ﷺ کی شہادت سب کی طرف سے ہے۔

اقسامِ شہادت

شہادت ہمیشہ دو طرح کی ہوتی ہے۔

☆ اصالتاً ☆ وکالتاً

اصالتاً شہادت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو دیکھ کر اس کے وجود پر شہادت دے، خاتم الانبیاء ﷺ کی شہادت اصالتاً تھی جبکہ دیگر انبیائے کرام اور آپ ﷺ کی امت کی شہادت وکالتاً ہے اسی لئے قرآنِ حکیم میں اعلان فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۴۳)

اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں (اعتدال والی) بہتر امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول تم پر گواہ ہو۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ

(القرآن، النساء، ۴: ۴۱)

پھر اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے حبیب) ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے۔

عقیدہ توحید اور تصورِ وحدت میں امتیاز

سطورِ بالا میں توحید کا مفہوم شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ توحید کے ساتھ ایک اور لفظ بھی بولا جاتا ہے اور وہ ہے وحدت۔ تصورِ وحدت اور عقیدہ توحید بظاہر تو مترادف تصورات دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت اور یکتائی کی شہادت اگر محض اپنے علمِ قیاس اور مشاہدے کی بناء پر دی جائے تو اسے تصورِ وحدت کہیں گے اور یہ شہادت، شہادتِ توحید نہیں ہو گی۔ یہ شہادت عقیدہ توحید اس وقت قرار پائے گی جب یہ شہادت زبانِ مصطفوی ﷺ سے سن کر دی جائے کہ اللہ ایک ہے۔ چنانچہ سورۂ اخلاص جسے سورۂ توحید بھی کہتے ہیں اس مضمون پر تفصیلاً روشنی ڈالتی ہے۔ اس کا آغاز ہی ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ○

(القرآن، الاخلاص، ۱۱۲: ۱)

(اے نبی مکرم) فرما دیجئے وہ اللہ ایک ہے۔

حالانکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے:

هو الله احد

وہ اللہ ایک ہے۔

مگر ایسا نہیں کہا گیا جس کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبر ﷺ کے واسطے اور توسل کے بغیر رب العزت کی وحدانیت کی گواہی عقیدہ توحید تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ تصورِ وحدت، شہادتِ توحید تب بنتا ہے جب ربِ ذوالجلال کی وحدت و کبریائی کی شہادت زبانِ مصطفوی ﷺ پر اعتماد کرتے ہوئے دی جائے گویا اللہ کی وحدانیت کی گواہی بن دیکھے اس وجہ سے دی جائے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کی گواہی دی ہے یہی ایمان بالغیب کا مقتضاء ہے۔

حقیقتِ عبدیتِ محمدی ﷺ

کلمہ شہادت میں لفظِ ''محمد'' ﷺ کے مفہوم اور اس کی معنوی وسعت و حکمت پر مفصل بحث گذشتہ باب میں گزر چکی ہے۔ زیرِ نظر باب میں کلمہ شہادت کے دوسرے حصے میں مذکور لفظ ''عبدہٗ'' پر شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جائے گا تاکہ حضور ختمی مرتبت ﷺ کے مقامِ عبدیت تک کچھ رسائی حاصل ہو سکے اور یہ حقیقت اجاگر ہو سکے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کا عبد (بندہ) ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور بارگاہِ صمدیت میں عبدیتِ مصطفوی ﷺ کس مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔

لفظِ عبد کے مفہوم کے بارے میں مغالطہ اور اس کا ازالہ

عربی زبان میں عبد کا معنی ''غلام'' اور ''بندہ'' آتا ہے اور کسی کے عبد ہونے کو عبدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عبد کے معنی و مفہوم کے بارے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک اشکال اور مغالطہ پایا جاتا ہے۔ غلط العام کے طور پر اس لفظِ عبد کا اطلاق صرف انسان پر کیا جاتا ہے حالانکہ اپنی معنوی وسعت کے اعتبار سے لفظِ عبد جملہ موجوداتِ کائنات کو محیط ہے۔ کائناتِ ارضی و سماوی میں موجود ہر چیز بارگاہِ رب العزت میں عبد کا درجہ رکھتی ہے۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہر وجود جو کتمانِ عدم سے عالمِ ہست میں ظہور پذیر ہوا ہے خدائے ذوالجلال کا مطیع و منقاد ہے اور اس کے نزدیک عبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہر وجود اپنی عبدیت کے اظہار کے طور پر اپنے احوال کی مناسبت سے اپنے خالق کے حضور جبینِ نیاز خم کر رہا ہے اور اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ عبادت، پرستش اور بندگی کے لائق و سزاوار صرف خالقِ کائنات کی ذات ہے جبکہ خلقت کے اعتبار سے عالم ارضی اور عالمِ بالا سے تعلق رکھنے والی ہر شئے جن و انس، ملائکہ و حیوانات، نباتات، جمادات، شجر و حجر غرضیکہ کائنات بسیط کے ہر ہر گوشے میں پائی جانے والی ہر چیز اپنے خالق و مالک کے ساتھ رشتہ بندگی میں منسلک ہے۔ خالق کے ساتھ رشتہ بندگی کے استوار کر لینے کو مقامِ عبدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کائناتِ زیریں و بالا کا ہر وجود خواہ وہ ذی روح ہو یا بے روح، بے شعور ہو یا باشعور، معبودِ حقیقی کے حضور تسبیح و تہلیل اور عبادت و پرستش میں اپنے اپنے حسبِ حال محو و مصروف ہے۔ ارشادِ قرآنی کے مطابق آسمانوں اور زمین میں ہر ایک کو اس کے مقامِ عبدیت سے روشناس اور آگاہ کر دیا جائے گا۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا○

(القرآن، مریم، ۱۹: ۹۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی (آباد) ہیں (خواہ فرشتے ہوں یا جن و انس) وہ اللہ کے حضور محض بندہ کے طور پر حاضر ہونے والے ہیں۔

متذکرہ صدر آیۂ کریمہ سے اس امر کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کائناتِ ارضی و سماوی میں پائے جانے والی ہر نوع کی مخلوق اپنے مقام کی مناسبت سے درجۂ عبدیت پر فائز ہے۔

قرآنِ حکیم میں باری تعالیٰ نے ایک مقام پر کفار و مشرکین کے اس غلط عقیدے کا بطلان بڑے واضح لفظوں میں کیا ہے جس کے مطابق وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ○

(القرآن، الانبیاء، ۲۱: ۲۶)

بلکہ وہ (فرشتے اللہ کے) معزز بندے ہیں۔

کلمہ شہادت میں عبدیتِ محمدی ﷺ کا تقدم

یہ امر محتاجِ وضاحت نہیں کہ خالق کائنات نے اپنی جملہ مخلوق میں حضرتِ انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا اور اشرفیت کا تاج اس کے سر پر رکھ کر اسے عبدیت میں دوسروں سے ممتاز و سرفراز فرمایا۔ قطع نظر اس کے کوئی انسان جاہل ہے یا عالم، حاکم ہے یا

محکوم، کمزور ہے یا طاقتور، نیکوکار ہے یا بدکار، اس کی عبدیت کو دوسری تمام مخلوق سے متمیز کرتے ہوئے بلند تر درجہ پر فائز کر دیا گیا ہے۔ اس کے لئے لازمی و لابدی ہے کہ وہ اپنے مقامِ عبدیت سے کما حقہٗ آگاہ ہو اور اس بات کا بشرحِ صدر اقرار بھی کرے کہ اس کی عبدیت دوسری تمام مخلوق کے مقابلے میں تقدم اور اولیت کے مرتبے کی حامل ہے۔

سرورِ دوجہاں ﷺ کی ذاتِ گرامی تمام بنو آدم کے مقابلے میں عبدِ کامل کے مقام و مرتبہ پر فائز ہے۔ یہاں یہ امر محلِ غور ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی رسالت کے اقرار و اعلان سے پہلے آپ ﷺ کے مقامِ عبدیت کے تقدم کو جزوِ ایمان ٹھہرایا گیا لہٰذا دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے ہر ایک پر لازم ہے کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے آپ کی عبدیت کی شہادت اپنی زبان سے اِن کلمات کو ادا کرتے ہوئے دے۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

روایات و آثارِ دورِ نبوت سے بالتواتر ثابت ہے کہ دورانِ نماز حالتِ تشہد میں کلمہ شہادت ادا کرنے کے علاوہ حضور نبی اکرم ﷺ اکثر لوگوں کے سامنے یہ کلمہ پڑھا کرتے تھے یعنی آپ ﷺ اپنی نبوت و رسالت کے اعلان سے پہلے اپنی عبدیت کا اقرار فرماتے۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ مقامِ عبدیت و رسالت میں گہرا ربط و تعلق کارفرما ہے جس کی تفہیم تصورِ توحید کی اساس ہے۔

یہ بات جان لینا از بس ضروری ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کا وصفِ عبدیت اللہ جل مجدہ کی عطا ہے جبکہ آپ ﷺ کا مقامِ رسالت آپ پر خدائے بزرگ و برتر کا خاص انعام اور عطیہ ہے۔ اسی بناء پر نبی اکرم ﷺ اپنے مقامِ عبدیت کا خصوصیت کے ساتھ سب سے پہلے ذکر فرماتے اور پھر اس کے بعد اس عظیم انعام و عطیہ خداوندی کا تذکرہ فرماتے جو بارگاہِ صمدیت سے رسالت کی صورت میں آپ ﷺ کو ارزانی ہوا تھا۔

شہادتِ رسالت پر شہادتِ عبدیت کو مقدم کرنے کے اسباب

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ عبدیت اور رسالت آقائے دو جہاں ﷺ کی دو امتیازی شانیں ہیں جن کا کلمہ شہادت میں ذکر کیا گیا ہے لیکن ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلمہ شہادت میں ذکرِ عبدیت کو مقدم اور ذکرِ رسالت کو موخر کرنے کے کیا اسباب ہیں۔غور کرنے سے اس کے تین اسباب سامنے آتے ہیں۔

پہلا سبب

حضور نبی اکرم ﷺ کے مقامِ عبدیت ورسالت کے باہمی ربط کو سمجھ لینے سے یہ نکتہ واضح طور پر آشکار ہو جائے گا کہ عبدیت کا تعلق کلیتًا ذاتِ خداوندی سے ہے اور غیر اللہ سے اس کی کوئی نسبت نہیں۔ اس کے برعکس رسالت کا تعلق ایک طرف براہِ راست مخلوقِ خداوندی سے ہے تو دوسری طرف ذاتِ خداوندی سے بھی ہے۔ گویا رسالت خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہے۔ چونکہ عبدیت کا مطمع نظر سب علائقِ دنیوی منقطع کر کے خالقِ حقیقی سے ایسا یک گونہ تعلق استوار کر لینا ہے کہ اسی کی ذات بندے کے کامل انہماک اور توجہ تام کا مرکز ومحور بن جائے۔ اس بناء پر کلمہ شہادت میں اس کے ذکر کو اولیت دی گئی ہے۔ اس کے باوصف منصبِ رسالت، اُلوہی پیغام کو نوعِ انسانیت تک پہنچانے کا متقاضی ہے۔ رسول ﷺ کا کام بندگانِ خدا کی رشد و ہدایت ہے تاکہ وہ گمراہی و ضلالت کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و ایقان کے نور سے بہرہ ور ہو جائیں۔ مقامِ عبدیت پر جہاں توجہ الی اللہ کا رنگ غالب ہوتا ہے وہاں مقامِ رسالت پر توجہ الی الخلوق کی کیفیت کا اثر بغائت درجہ گہرا رہتا ہے کیونکہ رسول ﷺ کو اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ خلقِ خدا کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے منصبِ رسالت پر فائز کیا جاتا ہے۔

دوسرا سبب

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ مقامِ رسالت ایک عبد کے مقابلے میں

بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے لیکن جہاں تک عبدیت کا تعلق ہے رسول ﷺ کی ذات خدا سے اپنا رشتہ عبودیت محکم طور پر قائم کرنے کو اولیت و ترجیح دیتی ہے۔ آقائے دو جہاں ﷺ کا ایک ارشادِ گرامی اس مضمون پر دلالت کرتا ہے کہ اے میرے رب! میں تیرا رسولِ برحق ہوں اور میری رسالت تیرے گمراہ بندوں کو رشد و ہدایت سے بہرہ ور کرنے کے لئے ہے لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ اول و آخر تیرا بندہ رہوں۔ یہی سبب تھا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے کلمہ شہادت میں اپنے مقامِ بندگی کا بالتخصیص پہلے ذکر فرمایا اور رسالت کا بعد میں۔ عبدیت اور بندگی کے مقام میں جو لذت و حلاوت اور سرشاری کی کیفیت پنہاں ہے اس کا ذکر اقبالؒ نے کیا خوب کیا ہے:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

تیسرا سبب

کلمہ شہادت میں مقامِ عبدیت کو اوّلیت دینے کی تیسری حکمت یہ ہے کہ بنو آدم کے قلوب و اذہان میں از رہِ تعلیم یہ نکتہ جاگزیں کر دیا جائے کہ جب آقائے دوجہاں صاحبِ لولاک ﷺ سے بڑھ کر کائنات میں کسی فرد کو بارگاہِ صمدیت میں عظمت و رفعت کا وہ مقام حاصل نہیں جو

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کا مصداق ہونے کی بناء پر آپ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کو حاصل ہے اور آپ ﷺ ان سب عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہونے کے باوجود اپنے مقامِ بندگی سے دستبردار نہیں ہوئے تو اور کوئی کس قطار و شمار میں ہوسکتا ہے۔ گویا نکتۂ توحید کو قلبِ انسانی میں راسخ کرنے کے لئے عبدیتِ مصطفوی ﷺ کو اس تخصص کے ساتھ متحقق کیا گیا کہ جب معراج میں قاب قوسین کے مقام پر آپ ﷺ کی عبدیت میں سرِ مو کوئی فرق نہیں

آیا تو اور کونسی ہستی خدا کے بعد الوہیت اور معبودیت کی مستحق اور سزاوار ہو سکتی ہے۔ کلمہ شہادت میں ذکرِ عبودیت کے تقدم میں اس حکمت کی کارفرمائی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔

حقیقتِ مقامِ عبدیت

مقامِ عبدیت کی اصل اور حقیقت کیا ہے؟ اس کی نشاندی اقبال نے بزبانِ شعر

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی

کہہ کر مجملاً کر دی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بندگی بارگاہِ رب العزت میں بغایت درجہ عاجزی، فروتنی، بے مائیگی اور کمال تذلل کا نام ہے اور مقامِ عبدیت اس احساس سے بدرجہ اتم سرشار ہونے سے عبارت ہے۔ بندہ جوں جوں حریمِ نازِ خداوندی میں فرطِ عجز و نیاز سے جھکتا چلا جاتا ہے تو اس کا جوہر زندگی کھلنے لگتا ہے اور وہ مقامِ عبدیت میں پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے۔ جب بندہ خود کو عاجز، بے بس، قصور وار و خطا کار سمجھ کر انفعال و ندامت کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے تو بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہوتے ہی اس کے قلب و باطن میں عبدیت کا نور بھر دیا جاتا ہے اور انوارِ الٰہیہ اس کی باطنی کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس کی جبینِ بندگی جس قدر فرطِ عجز و انکسار سے خالقِ کائنات کے حضور خم ہوتی ہے اس کا مقامِ عبدیت نئی بلندیوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

وما تواضع احد للّٰہ رفعه اللّٰہ

(مسلم، الصحیح، ۴: ۲۰۰۱، کتاب البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع، رقم: ۲۵۸۸)

''جو کوئی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ کریم اسے رفعت و بلندی عطا کرتا ہے۔''

یہ فرمودہ مصطفوی ﷺ ہم سب کے لئے حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔ کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ نشۂ پندار میں بدمست ہو کر ہم خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں اور

مخلوقِ خداوندی کو حقیر و ادنیٰ سمجھتے ہیں۔ کیا اس غرور و رعونت پر مبنی طرزِ عمل اپنا کر ہم اس حقیقت سے نا آشنا نہیں کہ خدا کی نظر میں ہم کتنے گر چکے ہیں اور دنیا میں ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ بارگاہِ خداوندی میں حقیقی عزت اس کی بارگاہِ بے ہمتا کے آگے جھکنے اور بندگانِ خدا سے تواضع، خاکساری اور عجز و انکسار کا انداز اختیار کئے رکھنے میں مضمر ہے۔ یاد رہے کہ جو شجر جتنا ثمردار ہوتا ہے وہ اتنا ہی جھکا ہوا ہوتا ہے۔

قصہ آدم علیہ السلام میں نیابتِ خداوندی کا تصور

نسل انسانی کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام سلسلہ آفرینش کے وہ پہلے فرد ہیں جنہیں خالقِ کائنات نے بر روئے زمین اپنی خلافت و نیابت کے لئے منتخب فرمایا اور ان کی تخلیق سے پہلے فرشتوں کو اپنے ارادے سے حسبِ ارشاد قرآنی ان الفاظ سے آگاہ کیا:

وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَةِ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً ط

(القرآن، البقرہ،۲: ۳۰)

''اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔''

خلیفہ کسی نائب یا قائم مقام کو کہا جاتا ہے۔ عام دستور ہے کہ جب کوئی مقتدر اور بااختیار شخصیت کسی کو اپنی نیابت سپرد کرنا چاہتی ہے تو اس کی نگاہِ انتخاب ایسی ہستی پر پڑتی ہے جو بہمہ وجوہ اس اعلیٰ و ارفع منصب کی اہل ہو اور اس کی صلاحیت و استعداد پر کامل طور پر بھروسہ کیا جا سکتا ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام اور صدورِ نسیاں

حضرت آدم علیہ السلام کو خلافتِ ارضی کی ذمہ داریاں سونپتے وقت خالقِ کائنات سے کسی غلطی کے صدور کا امکان خارج از بحث ہے کہ وہ ذات ہر قسم کی بھول چوک اور خطاء سے یکسر پاک ہے اور یہ بات حیطۂ گمان میں بھی نہیں لائی جا سکتی کہ منصبِ خلافت

کے لئے وہ کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کرے جس سے حکم عدولی اور نافرمانی کا ارتکاب ممکن ہو۔ بتقاضائے بشریت یہ بات انسانوں سے تو ممکن ہوسکتی ہے کہ ان کی فطرت اور سرشت میں محدود علم کی بناء پر غلطی اور خطاء کا امکان ہمہ وقت موجود ہوتا ہے لیکن خدائے علیم وخبیر کے بارے میں ایسا قیاس کرنا محال و ناممکنات میں سے ہے۔ قصہ تخلیقِ آدم کے باب میں قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد فرمانا کہ:

وَ عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی○

(القرآن، طہ، ۲۰: ۱۲۱)

اور آدم سے اپنے رب کے حکم (کو سمجھنے) میں فروگذاشت ہوئی سو وہ (جنت میں دائمی زندگی کی) مراد نہ پا سکے۔

ایک عجیب طرفہ تماشا اور کائناتی معمہ وعقدہ ہے جس کی گرہ کشائی عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ خلیفۃ اللہ اور نائبِ الٰہی سے عصیاں اور حکم عدولی کا صدور اور شجر ممنوعہ کا ثمر کھانے کی پاداش میں ان کا جنت سے اخراج چند در چند حکمتوں اور مصلحتوں کا حامل ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ قابل توجہ ہے کہ جہاں قرآن نے حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی سرزد ہونے کا ذکر فرمایا وہاں اس بات کا تذکرہ بھی مناسب جانا۔

فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا

(القرآن، طہ، ۲۰: ۱۱۵)

سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں بالکل (نافرمانی کا کوئی) ارادہ نہیں پایا۔

محولہ بالا آیت سے یہ مفہوم مترشح ہے کہ ثمر ممنوعہ کھانے میں حضرت آدم علیہ السلام سے نسیان سرزد ہوا اور انہوں نے بالارادہ غلطی کا ارتکاب نہیں کیا۔ گویا اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے صرف بھول چوک ہوئی اور ان کے دل میں حکم عدولی کا کوئی قصہ اور ارادہ نہ تھا۔

شریعتِ اسلامیہ کی رو سے ایسا عمل جس کے پیچھے ارادہ کارفرما نہ ہو خطا اور

لغزش پر تو محمول کیا جا سکتا ہے لیکن اسے گناہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یاد رہے کہ ارادے کی عدم موجودگی میں کوئی عمل لائق سرزنش نہیں ٹھہرتا۔ مثال کے طور پر رمضان میں بھولے سے سیر ہو کر بھی کھا لیا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا جبکہ بالقصد ایسا کرنے سے کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی لائق توجہ ہے:

إنمَا الْأعمال بالنيات

(بخاری، الصحیح، ۱:۳، کتاب بدء الوحی، رقم:۱)

بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

خلافتِ ارضی کے لئے تربیتِ آدم کے حکمت آموز پہلو

قرآنِ حکیم کی متذکرہ صدر دو آیاتِ کریمہ میں ایک آیت حضرت آدم علیہ السلام کی حکم عدولی کا ذکر کرتی ہے تو دوسری آیت میں ان سے بھول چوک اور نسیان منسوب کر کے انہیں مبرا عن الخطاء قرار دیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دونوں آیات میں تضاد اور تعارض پایا جاتا ہے حالانکہ کلامِ الٰہی کسی قسم کے تضاد سے یکسر پاک ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ’’**فعل الحكيم لا يخلو عن الحكمة**‘‘ (حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا) کے مصداق مذکورہ ارشاداتِ ربانی چند حکمتوں پر مبنی ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خلافت و نیابتِ الٰہی کے باب میں باری تعالیٰ نے اپنی مشیتِ کاملہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی ذہنی وفکری تربیت اس نہج پر کرنا چاہی تاکہ انہیں عبدیت کے بلند مقام پر سرفراز کیا جا سکے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ تربیت دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے جس میں ایک اس کا ظاہری پہلو ہوتا ہے اور دوسرا باطنی۔ مربی (تربیت دینے والے) کی ذات چاہتی ہے کہ اپنے مربوب (جسے تربیت دی جا رہی ہے) میں پوشیدہ حکمتوں کو بروئے کار لا کر کامل صلاحیت اور استعداد پیدا کر دی جائے جس کا متقاضی وہ عظیم منصب ہے جس پر اسے فائز کیا جانے والا ہے۔

واقعہ آدم علیہ السلام میں یہ لطیف نکتہ مضمر ہے کہ جہاں ایک طرف حضرت آدم علیہ السلام

کی لغزشِ محض کو عصیاں سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہاں دوسری طرف اس بات کی شہادت بھی خود ذاتِ خداوندی فراہم کر رہی ہے کہ ان سے یہ فعل نادانستہ بھول چوک کے نتیجے میں سرزد ہوا اور ان کا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سرشتِ آدم میں خطاء و نسیان کے یہ دونوں پہلو اس خصوصی تربیت کا لازمی حصہ تھے جن سے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی عبدیت کی تکمیل کے لئے گزارا جانا تھا تاکہ ان کے اور ان کی وساطت سے بنو آدم کے دل و دماغ میں یہ تصور کامل طور پر راسخ کر دیا جائے کہ انسان خطاء و نسیان کا پتلا ہے اور اس کا مقامِ بندگی اس وقت اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ جب اس میں احساسِ خطاء سے شرمندگی، انفعال اور ندامت کی کیفیات پیدا ہوتی ہے۔ اسی بناء پر جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے اور روئے ارض ان کا مسکن اور مستقر ٹھہرا تو اس تقصیر کی وجہ سے جو ان سے بے ارادہ سرزد ہوئی ان پر اس درجہ احساسِ ندامت طاری ہوا کہ مسلسل گریہ و زاری اور استغفار ان کا شیوہ اور وظیفہ حیات بن گیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کا مقام عبدیت

جب مسلسل گریہ وزاری اور آہ و فریاد سے حضرت آدم علیہ السلام کے شب و روز عبارت ہو گئے اور خدا کے دامنِ رحمت سے لپٹ کر عفو طلبی ان کا شعار بن گیا تو ان کا مقامِ عبدیت بلندیوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہو گیا۔ قرآنِ حکیم نے حضرت آدم علیہ السلام کے توبہ و استغفار کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ○

(القرآن، الاعراف، ۷:۲۳)

اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو نے ہم کو نہ بخشا اور ہم پر رحم (نہ) فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا یہ رونا دھونا اور اپنی تقصیر پر احساسِ ندامت کا اظہار بارگاہِ رب العزت میں اتنا محبوب اور پسندیدہ ہوا کہ انہیں ان کے منصبِ خلافت کے شایانِ شان عبدیت کے بلند تر مقام پر فائز کر دیا گیا۔ پھر انہیں دربارِ خداوندی میں جو شرفِ باریابی عطا ہوا اس کا ذکر قرآنِ حکیم میں اس طرح کیا گیا ہے:

ثُمَّ اجۡتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى○

(القرآن، طہ، ۲۰: ۱۲۲)

پھر ان کے رب نے انہیں چن لیا اور ان پر (عفو و رحمت کی خاص) توجہ فرمائی اور منزلِ مقصود کی راہ دکھا دی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ اس شان سے شرفِ قبولیت سے بہرہ ور ہوئی کہ رشد و ہدایت کے ارفع و اعلیٰ مقام پر متمکن کر دیا گیا۔ یہ مقام انہیں اس امتحان اور ابتلاء سے گزرنے کے بعد نصیب ہوا جو خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر فائز کرنے سے پہلے ان کی تربیت کے لئے ضروری اور ناگزیر تھا۔

کلمہ شہادت میں عبدیتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے جدِ امجد نسل انسانی اور ابوالانبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے مقامِ عبدیت کا اجمالی تذکرہ قارئین کرام کی نظر سے گزر چکا۔ اب ہم چند برگزیدہ انبیائے کرام اور پاکانِ امت کے مقامِ عبدیت کا اپنی اپنی جگہ مختصر جائزہ لیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام اور مقامِ عبدیت

قرآنِ حکیم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جس برگزیدہ نبی کا ذکر تواتر کے ساتھ آیا ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں جن کی زبان سے نکلی ہوئی بددعا ان کی قوم کے حق میں ایسے عذاب کا پیش خیمہ بنی جس میں مبتلا ہو کر وہ قوم صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ حضرت نوح علیہ السلام جب اپنے رب کے حضور دعا کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ عجز و نیاز اور تضرع و خاکساری کا پیکر دکھائی دیتے ہیں جن کی نظرِ پیہم اپنی لغزشوں اور

خطاؤں پر ہے اور وہ خدا کے دامنِ کرم سے لپٹے ہوئے انتہائی عاجزی و زاری سے اپنی مغفرت کے لئے قرآنی الفاظ میں یوں سراپا سوال ہیں۔

وَاِلَّا تَغْفِرْلِیْ وَ تَرْحَمْنِیْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

(القرآن، ھود، ۱۱: ۴۷)

''اور اگر تو مجھے نہ بخشے گا اور مجھ پر رحم (نہ) فرمائے گا (تو) میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔''

بارگاہِ صمدیت میں وہ اپنی پیغمبرانہ معصومیت اور عظمت پر نازاں نہیں ہوتے بلکہ عفو و رحمت طلبی کے لئے دست بدعا ہیں۔ ان کی نظر خدا کے بے پایاں الطاف وعنایات پر ہے جن سے محرومی خسارہ ونقصان کا موجب بنتی ہے۔ مقامِ غور ہے کہ اگر نوح علیہ السلام جیسے صاحبِ عظمت نبی کا اظہار بندگی اس کیفیت کا حامل ہے تو ہم رو سیاہ اور معصیت کوش بندے کس شمار و قطار میں ہیں۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجا و تا بکجا است

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مقام عبدیت

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے وہ محبوب پیغمبر ہیں جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کثرت سے وارد ہوا ہے۔ انہیں سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِ امجد ہونے کا شرف و امتیاز بھی حاصل ہے۔ وہ پہلے نبی ہیں جن کا دائرۂ نبوت عالمگیر حیثیت کا حامل ہے آپ ایسے بلند پایہ عظیم المرتبت نبی تھے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''أبی إبراھیم'' کہہ کر فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعاؤں کا ثمرہ ہوں۔ بارگاہِ خداوندی میں وفورِ عجز و نیاز، انکساری وتضرع سے التجا کیا کرتے تھے۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلِیْ خَطِيْٓئَتِیْ يَوْمَ الدِّيْنِ

(القرآن، الشعراء، ۲۶: ۸۲)

اور اسی سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ قیامت وہ میری خطائیں معاف فرما دے گا۔

اللہ رب العزت کی شانِ رحیمی اور اوصافِ کریمانہ سے وہ یہ امید وابستہ کئے ہوئے تھے کہ قیامت کے دن ان کی خطائیں معاف کی جائیں گی اور ان سے ان کی لغزشوں کے بارے میں باز پرس اور مواخذہ نہ کیا جائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ بندگی اپنی عظمتوں اور رفعتوں کے باوصف یہ حقیقت آشکارا کر رہا ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں بے مائیگی، عاجزی اور تذلّل کا احساس ہی بندے کو عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے اور وہاں تکبر، غرور، تفاخر اور جاہ پسندی کا اظہار قابلِ قبول نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور مقامِ عبدیت

حضرت سلیمان ں کو جو شان و شوکت، کر و فر اور دبدبہ حکومت عطا ہوا اور اَزل سے اَبد تک کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ اللہ کے اس جلیل القدر نبی کی حکومت کا دائرہ اور اختیار کا تصرف جن و انس اور ہواؤں پر بھی محیط تھا۔ اتنے بڑے انعام اور عطیہ الٰہی کے باوجود جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے بے مثال عظمت و مرتبہ پر دلالت کرتا ہے ان کا مقامِ بندگی نہایت درجہ عاجزی و فروتنی اور نیاز مندی کا آئینہ دار نظر آتا ہے اس کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ملکہ سبا بلقیس کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے لکھا تھا اور جس کا آغاز قرآنی الفاظ کے مطابق اس طرح کیا تھا۔

اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

(القرآن، النمل، ۲۷: ۳۰)

بے شک وہ (خط) سلیمان کی جانب سے (آیا) ہے اور وہ اللہ کے نام سے شروع (کیا گیا) ہے جو بے حد مہربان بڑا رحم فرمانے والا ہے۔

یہ اندازِ تحریر جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی قسم کا سابقہ، لاحقہ یا امتیازی شان کا حامل لقب اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کیا بلکہ سیدھے سادھے طریقے سے خط

کو خدا کے پاک نام سے شروع کیا یہ اس بات کا غماز ہے کہ خدا کی ذاتِ کبریا کے آگے حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا صاحبِ جاہ و سلطنت بادشاہ بھی محض بندہ بے بس ہے اور ان کا حد سے بڑھتا ہوا عجز و نیاز ان کے مقامِ عبدیت کے ترفع کا آئینہ دار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مقام عبدیت

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ اولوالعزم صاحبِ ہمت نبی ہیں جنہیں ان کی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم اور استحصال سے نجات دلانے کے لئے مبعوث فرمایا گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے قومِ فرعون سے تعلق رکھنے والا ایک قبطی فرد غیر ارادی طور پر قتل ہوگیا تو وہ اپنے اس اِضطراری فعل پر اس درجہ نادم ہوئے کہ اپنے رب کے حضور تضرّع اور زاری سے دعائیں مانگنے لگے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّی ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡلِیۡ

(القرآن، القصص، ۲۸: ۱۶)

''(موسیٰ) عرض کرنے لگے اے میرے رب بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا سو تو مجھے معاف فرما دے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہونے کی بناء پر کلیم اللہ کے لقب سے نوازا گیا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام میں وہ واحد نبی ہیں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزوی طور پر اپنے مماثل قرار دیا ہے۔ انہوں نے ''رب ارنی'' کی درخواست گزار کر دیدارِ الٰہی کی درخواست کی۔ ایسے بلند پایہ اور عالی مرتبت نبی کا مقامِ عبدیت خوف و خشیتِ خداوندی سے اس درجہ مملو ہے کہ وہ قبطی کے نادانستہ قتل پر خدائے قدوس سے معافی کے خواستگار رہتے تھے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مقام عبدیت

سرورِ دوجہاں، تاجدارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کا مثیل اَزل سے ابد تک کائنات کا کوئی

متنفس نہیں، ایسے متہم بالشان اور کمال کی انتہاؤں کو چھونے والے مقامِ عبدیت کے حامل ہیں جو انتہائی نیاز مندی، فروتنی اور احساسِ بندگی سے عبارت ہے۔ یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ اگر کوئی امتی ایسے خیالات کو حضور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اپنے گوشہ دل میں جگہ دے جو آپ ﷺ اپنے اظہارِ عقیدت کے طور پر زبان مبارک پر لاتے تھے تو وہ اپنے ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

تواتر کے ساتھ روایات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ آقائے دوجہاں ﷺ کا مقامِ بندگی اس اِنتہاء درجے کو پہنچا ہوا تھا کہ آپ ﷺ عبادت کے لئے ساری ساری رات کھڑے رہتے یہاں تک کہ پاؤں مبارک متورّم ہو جاتے۔ آپ ﷺ پر اکثر شدتِ گریہ کی وہ کیفیت طاری ہوتی کہ آپ ﷺ کا رُوّاں رُوّاں کانپنے لگتا۔

ایک دفعہ اسی کیفیت کا غلبہ تھا کہ خدائے ذوالجلال نے جبرائیل امین کے توسط سے اپنے محبوب ﷺ کے پاس یہ پیغام بھیجا:

طٰهٰ ۝ۚ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ۝

(القرآن، طٰہٰ، ۲۰: ۱-۲)

طٰہٰ (اے محبوب مکرم) ہم نے آپ پر قرآن (اس لئے) نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔

یہ تو محبّ کا اپنے محبوب سے اظہارِ محبت کا معاملہ تھا مگر بایں ہمہ حضور ﷺ کا شغفِ عبادت اس کمال درجے کا تھا کہ بادیدہ گریاں بارگاہِ صمدیت میں حاضر ہو کر عرض کرتے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اکثر دعا مانگتے کہ اے باری تعالیٰ! مجھے اپنی یاد میں رونے والی آنکھیں اور محبت میں مگن رہنے والا دل عطا فرما۔ صحابہ رضی اللہ عنہم، حضور نبی اکرم ﷺ کے کثرتِ گریہ کو دیکھ کر عرض پرداز ہوتے کہ آقا! آپ تو محبوبِ خدا ہیں اور آپ کی ذات تو وہ ذات ہے جس کے دامن میں گناہگار امتیوں کو بھی مژدہ مغفرت عطا ہوتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیک وسلم کے اضطراب اور کثرتِ گریہ کا سبب کیا ہے؟

آپ ﷺ احساسِ عبدیت سے سرشار ہو کر فرماتے:

افلا اکون عبدا شکورا

(مشکوۃ المصابیح: ۱۰۹)

کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین

ہادی دو جہاں ﷺ کی صحبت کا رنگ ان کے جاں نثار اصحاب ﷺ پر اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کو جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ تربیتِ مصطفوی ﷺ کا اثر ان کی زندگیوں میں کس حد تک سرایت کر چکا تھا اس کا نقشہ قرآنِ حکیم ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ

(القرآن، ال عمران،۳: ۱۹۱)

’’یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اس کی عظمت اور حسن کے جلووں) میں فکر کرتے رہتے ہیں۔‘‘

حضور ﷺ کے صحابہ ﷺ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنہیں خدائے قدوس نے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا اور انہیں بخشش و مغفرت کا مژدہ جانفزا بارگاہِ رب العزت کی طرف سے ملا۔ ان کے بارے میں خود آقائے دو جہاں ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ اگر کسی نے دنیا میں اہلِ جنت کا نظارہ کرنا ہو تو وہ میرے صحابہ ﷺ کو دیکھ لے۔

صحابہ ﷺ کی للّٰھیت، خدا خوفی اور کروٹ کروٹ یادِ الٰہی میں مگن رہنے کا حال

قرآنِ حکیم نے کھول کر بیان کیا ہے۔ وہ منتخب روزگار ہستیاں ہمہ وقت رضائے الٰہی کے حصول کے لئے مصروفِ جدوجہد رہتیں اور ان کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کیفیت سے خالی نہیں تھا۔ ان کا مقامِ عبدیت اس درجے کا تھا کہ صحبتِ مصطفوی ﷺ کے فیض سے مالامال اور سرتاپا نیکیوں کا پیکر ہونے کے باوجود انہیں اپنے اعمال پر کوئی فخر نہ تھا بلکہ وہ خشیتِ الٰہی سے لرزہ براَندام رہتے ہوئے قرآن کے الفاظ میں رضائے خداوندی کے حصول کو اپنا مطمعِ نظر بنائے رکھتے۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللهِ وَ رِضْوَانًا

(الفتح، ۴۸: ۲۹)

وہ اللہ سے اس کے فضل اور اس کی رضا مندی کے طلبگار رہتے ہیں۔

اپنے اعمالِ صالحہ پر فخر و تعلّی کا اظہار تو درکنار وہ عذابِ جہنم کے خوف سے لرزاں و ترساں اپنے رب کے حضور دست بدعا رہتے۔

سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(آل عمران، ۳: ۱۹۱)

’’تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔‘‘

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو زندگی گزارنے کا یہ قرینہ بارگاہِ مصطفوی ﷺ سے عطا ہوا تھا اور ان کے شب و روز حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے۔

اب ہم مشتے نمونہ اَز خروارے کے طور پر صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم میں سے چند ایک نادرۂ روزگار ہستیوں کے مقامِ بندگی کا طائرانہ جائزہ لیتے ہیں۔

سیدنا حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ

یہ وہ دوسرے خلیفہ راشد ہیں جن کی ہیبت و دبدبے سے قیصر و کسریٰ لرزہ بر

اَندام تھے اور ان کا نام سن کر سلاطینِ عجم کا پتّہ پانی ہوتا تھا۔ ان کے مقامِ عبدیت کا ایک انتہائی سبق آموز واقعہ کتبِ تاریخ میں درج ہے۔

ایک رات مدینے کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر دیکھا کہ امیر المومنین اپنی پشت پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے ہوئے اپنے خادم سے کہہ رہے ہیں کہ ''اُٹھ اور درہ ہاتھ میں لے کر عمر کو اہل حاجت کے دروازوں پر لے جا''۔ وہ خادم اپنے آقا کی یہ حالت دیکھ کر لرز گیا اور بچشمِ نم عرض کرنے لگا کہ ''آپ خود تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ مجھے حکم دیجئے کہ میں حاجتمندوں کے گھروں میں ان کی ضرورت کی چیزیں پہنچا آؤں''۔ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ ''نہیں میں نے آج اپنے نفس کو سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج مجھے لحظہ بھر کے لئے یہ خیال آ گیا تھا کہ میں اتنا بڑا حکمران ہوں کہ عرب وعجم کے لوگ میرا نام سن کر تھر تھرا اٹھتے ہیں۔ اب اس نفس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں ایک سقّے کی طرح پانی کا مشکیزہ اٹھائے لوگوں کے گھروں میں جا کر صدائیں دوں کہ تمہارے شہر کا سقہ پانی لئے حاضر ہے''۔

خاتونِ جنت حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس لختِ جگر کا مقامِ بندگی ہمارے طبقہ نسواں کے لئے انتہائی سبق آموز ہے۔ وہ بلاشبہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں جن کی سیرت قیامت تک آنے والی خواتین کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کے قدموں پر دونوں جہاں کی نعمتیں نثار تھیں ان کے شب و روز خدا کی عبادت اور محنت و مشق کے ماحول میں بسر ہوتے تھے۔ موسمِ سرما کی طویل راتوں میں وہ سجدے میں سر رکھتیں تو وہ سجدہ اتنا طویل ہوتا کہ فجر کی اذان سنائی دینے لگتی۔ وہ سرد آہ بھر کہتیں کہ ''مولا! تو نے راتیں کتنی چھوٹی بنائی ہیں کہ جی بھر کر تیرا سجدہ بھی ادا نہیں ہوتا''۔ یہ اس خاتون کا مقامِ عبدیت ہے جس کے بارے میں روایت درج ہے کہ روزِ قیامت جب میدانِ حشر برپا ہو گا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا کہ ''لوگو! اپنی آنکھیں نیچی کر لو خاتونِ جنت کی سواری

گزرنے والی ہے''۔

پاکانِ امت اور عرفائے کاملین

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں ایسے ایسے باکمال اولیاء وصلحاء گزرے ہیں جن کی عبدیت کا درجہ خلق خدا میں انتہائی رفعت و بلندی پر تھا۔ اللہ کے ان برگزیدہ اور صالح بندوں کے فیوض و برکات سے آج بھی ایک عالم بہرہ ور ہو رہا ہے اور سچ پوچھئے تو دنیا کا وجود ان کے دم قدم سے قائم ہے۔ ان کی عبدیت کے جواہر پارے آج بھی اس تیرہ و تار کائنات میں ضیاء پاشیاں کرتے ہیں۔ ان کے آستانے سے حرماں نصیبوں کو آج کے اس مادی دور میں بھی گوہرِ مراد مل جاتا ہے۔ ان بزرگوں کے مقامِ بندگی کے بے شمار واقعات ہیں۔ یہاں طوالت کے خوف سے چند ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کشف المحجوب میں ایک ولی کامل کے باب میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ایک دفعہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی ''اے فلاں! کیا تو نے اپنے آپ کو اتنا پاک سمجھ لیا ہے کہ میرے گھر میں حاضری کے قابل ہو گیا ہے''۔ وہ یہ آواز سن کر ٹھٹک گئے اور ان کے قدم وہیں رک گئے۔ تھوڑی دیر بعد آگے قدم اٹھایا تو پھر آواز آئی ''کیا تجھے اس مقام تک رسائی حاصل ہو گئی ہے کہ میرا حق بندگی ادا کر سکے''؟ وہ حیران و ششدر یہ سمجھ کر کہ اس بارگہِ ناز کے قابل نہیں، پیچھے ہٹنے لگے تھے کہ پھر آواز آئی ''کیا تو اس قدر سرکش ہو گیا ہے کہ میرے آستانے سے منہ موڑ کے جا رہا ہے''؟ یہ سن کر وہ بے اختیار آہ و زاری کرنے لگے تو صدا آئی ''کیا تو مجھ سے شکوہ کرنے لگا ہے''؟ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے تو ندا آئی ''کیا لبوں پر مہرِ سکوت لگا کر تو اپنے آپ کو مقامِ صبر پر فائز سمجھ بیٹھا ہے''؟ اللہ کا ولی یہ سن کر بیہوش ہو گیا اور دیر تک یہ کیفیت رہی۔ جب ہوش آیا تو عرض کرنے لگا ''مولا! میں کچھ نہیں جانتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ میں تجھ سے تیری ہدایت کا طلبگار ہوں کہ تیرا حق بندگی کیسے ادا کروں؟''

ایک ولی کامل کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں لوگوں کو اس لئے حلقہ ارادت میں شامل کرتا ہوں کہ شاید میرے مریدوں میں کوئی ایسا شخص شامل ہو جس کا بیعت کرنا کل قیامت کے دن میرے لئے وسیلہ نجات بن جائے۔

ان پاکباز، صالح اور متقی بزرگوں کی انکساری، عاجزی اور فروتنی کی شان بیان کرتے ہوئے قرآنِ حکیم ارشاد فرماتا ہے:

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا○

(القرآن، الفرقان، ۲۵:۶۳)

اور (خدائے) رحمان کے (مقبول) بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل (اکھڑ) لوگ (ناپسندیدہ) بات کرتے ہیں تو وہ سلام کہتے (ہوئے الگ ہو جاتے) ہیں۔

یہ متواضع، خلیق اور انتہائی نرم روی سے خدا کی زمین پر چلنے والے بندے پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ وہ کسی سے زیادتی نہیں کرتے اور اگر کسی جاہل کندہ ناتراش شخص سے ان کا سامنا ہو جائے تو ''صاحب سلامت'' کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ تواضع اور خاکساری ان کا چلن اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانا ان کا شعار ہے۔ عبدیت کا یہ جوہر ہی اسلام کی روح ہے جس کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے لیکن اس خار زار وادی سے عافیت کے ساتھ گزر جانا انتہائی جان جوکھوں کا کام ہے۔ مقامِ عبدیت میں یہی مشکل مرحلہ ہے جس کے بارے میں اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

عبدیتِ مصطفوی ﷺ اور کم فہموں کی کوتاہ نظری

وہ اہل علم اور دانشور جو قرآن و حدیث کا سطحی نظر سے مطالعہ کرتے ہیں اکثر و

بیشتر آقائے دوجہاں ﷺ کے مقامِ عبدیت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھانے لگتے ہیں۔ قرآن فہمی کے لئے جس بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے فقدان کے باعث حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ان کے درمیان قیل وقال اور بحث ونزاع کا موجب بن جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں جنابِ رسالتمآب ﷺ کا ذکر دو حوالوں سے آیا ہے۔ ایک حوالہ وہ ہے جس کے پیشِ نظر حضور نبی اکرم ﷺ

بعد اَز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کے مصداق بلندی اور رفعت کے اس مقام پر نظر آتے ہیں کہ کائنات کی تمام عظمتیں اور رفعتیں ایک ہی نقطے پر مرتکز ہوگئی ہیں جو سید المرسلین ﷺ کے مقامِ محبوبیت کا آئینہ دار ہے جس میں اَزل سے اَبد تک کوئی آپ کا ہمسر نہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی پیغمبرانہ شخصیت کا دوسرا پہلو آپ کا مقامِ عبدیت ہے جس پر کوتاہ نظر بہک گئے اور اپنی نام نہاد علمیت کی رو میں بہہ کر حضور نبی اکرم ﷺ کی وسعتِ علم کو موضوعِ بحث بنا لیا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ نادان اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی انتہاء تک پہنچی ہوئی عبادت گزاری، محویت و استغراق، تضرع اور حد سے بڑھی ہوئی گریہ و زاری، آپ کی عبدیت کا وہ رخ ہے جس پر آپ ﷺ خدا کے سراپا شکر و سپاس بندے نظر آتے ہیں لیکن آپ ﷺ کا حقیقی مقام وہ ہے جس میں آپ محبوب رب العالمین کی حیثیت سے انتہائی اَرفع و اعلیٰ مقام پر متمکن ہیں۔ آپ کے اس مقامِ محبوبیت پر یہ حدیثِ قدسی دلالت کرتی ہے:

لولاک لما خلقت الافلاک

اگر آپ ﷺ کو پیدا نہ کیا ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔

آپ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات ہی وجہ تکوینِ کائنات ہے اور بقول اقبالؒ

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

حضور ﷺ کے مقامِ عبدیت اور مقامِ محبوبیت کی تفہیم ہم سے اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم آپ کے حقیقی مقام کو جو کہ مظہریتِ حق کا آئینہ دار ہے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور آپ کی شان میں تخفیف کا مرتکب ہو کر اپنے ایمان کو کمزور اور مضمحل نہ بنائیں۔ یہ بات ذہن میں مستحضر کر لی جائے کہ عبدیت و محبوبیت کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور حضور نبی اکرم ﷺ عبدِ کامل ہونے کے ناطے خدا کے محبوب ہیں۔

مقامِ عبدیت اور عبد کی اقسام

آخر میں ہم عبد کی درجہ بندی کرتے ہوئے مقامِ عبدیت کی بحث کو سمیٹتے ہیں۔ عبد کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ عبدِ آبق
۲۔ عبدِ رقیق
۳۔ عبدِ ماذون

ان کا اجمالی تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ عبدِ آبق

اس بھاگے ہوئے غلام کو کہتے ہیں جو اپنے آقا سے دور چلا گیا ہو، تمام کفار و مشرکین اس زد میں آتے ہیں۔

۲۔ عبدِ رقیق

ایسا غلام جو ہر وقت اپنے آقا کی خدمت گزاری کے لئے کمربستہ رہے عبدِ رقیق کہلاتا ہے۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے سب افراد عبدِ رقیق کا درجہ رکھتے ہیں۔

۳۔ عبدِ ماذون

عبدِ ماذون اس غلام کو کہتے ہیں جو حلقہ بگوش ہو کر بندگی کے اس درجہ کمال کو پہنچ

جائے کہ وہ اپنے سارے اختیارات کی باگ ڈور اپنے مالک کے ہاتھ میں دیدے اور اس کے ہر قول و فعل میں ہمہ وقت اس کے آقا کی رضا شامل ہو۔ عبدِ ماذون مختلف درجات طے کر کے خدا کے ہاں مقامِ محبوبیت پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ ماذونیت کے بلند ترین مقام پر ہیں اور آپ ﷺ ہی کی عبدیت معراج سے سرفراز ہوئی۔

شانِ عبدیت اور شانِ محبوبیت کا تقابل

شانِ عبدیت

سرورِ کائنات فخر موجودات ﷺ کی عبادت گزاری بغایت درجہ مجاہدہ و مشقت، خلوتِ شب میں طویل قیام، تسبیح و تہلیل اور نفلی عبادات میں یک گونہ استغراق و محویت سے عبارت تھی۔ دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے آپ ﷺ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے، کلامِ پاک کی تلاوت اتنا طول کھینچتی کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے لئے کھڑے رہنا دوبھر ہو جاتا۔ جب کثرتِ عبادت کی یہ کیفیت غلبہ و شدت اختیار کر گئی تو اللہ جل مجدہ کے حریمِ ناز سے جبرئیل امین علیہ السلام اس پیغام کے ساتھ آپ ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے:

مَا اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى

(القرآن، طہٰ، ۲۰:۲)

’’(اے محبوب مکرم) ہم نے آپ پر قرآن (اس لئے) نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔‘‘

اس آیہ کریمہ کے مفہوم پر غور کرنے سے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے دو پہلو اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ایک پہلو آپ ﷺ کی عبدیت اور دوسرا محبوبیت کا ہے۔ مذکورہ آیت میں واضح طور پر عبدیت کے پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس پر فائز ہو کر آپ ﷺ رضائے خداوندی کے حصول کی خاطر سر تا پا عجز و نیاز کا پیکر اور انکساری و تواضع کا مرقع دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شانِ بندگی پیہم سوز و ساز، اضطراب و

التہاب، گریہ و زاری اور درد و گداز کا نام ہے جس کے بارے میں اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

یہ مقامِ بندگی کے لئے بے پایاں لذت و حلاوت کا خزینہ اور متاعِ گراں بہا ہے۔ یاد رہے کہ خدا کی ذات اس سے وراء الوراء ہے اور اس کی الوہیت ان چیزوں سے یکسر مستغنی اور بے نیاز ہے۔

کمالِ عبدیتِ مصطفوی ﷺ

قرآن و حدیث کی روشنی میں جب ہم حضور ﷺ کے مقامِ عبدیت کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو آپ ﷺ بندگی کے بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں۔ عبادت گزاری، خشوع وخضوع عاجزی اور تضرع و زاری میں جو درجہ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کو حاصل ہے۔ عالمِ زیریں و بالا میں موجود کوئی مخلوق اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ گویا آپ کی عبدیت پر خود عبدیت کو ناز ہے۔ عبدیت کے اس اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہو کر حضور نبی اکرم ﷺ کثرتِ عبادت اور مجاہدے میں اس قدر منہمک اور مشغول رہتے تھے کہ کوئی متنفس اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ طویل قیام اللیل کے دوران قدمین شریفین پر ورم کا آ جانا، تبلیغ و دعوتِ دین اور جہاد کے میدان میں دشمنوں کے ہاتھوں جسمِ اقدس کا لہولہان ہو جانا، فاقے کاٹنا، پے در پے صعوبتیں اور تکلیفیں اٹھانا، غاروں میں جا جا کر رونا اور کثرتِ گریہ و زاری سے ریش مبارک کا آنسوؤں سے تر ہو جانا حضور نبی اکرم ﷺ کے کمالِ عبدیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ آپ ﷺ کی شانِ عبدیت کی دلیل ہے نہ کہ شانِ محبوبیت۔ کون چاہتا ہے کہ اس کے محبوب کو پتھر لگیں اور پھر حضور نبی اکرم ﷺ تو محبوبِ رب کائنات ٹھہرے جن کے سر پر تاجِ **لولاک لما** سجایا گیا اور محبوبیت کے علوِ مرتبت کا جو مقام آپ کو نصیب ہوا وہ ابدالآباد تک آپ ہی کا حصہ ہے کہ آپ ہی ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کے مصداق ہیں۔

سرکارِ دوجہاں ﷺ کی شانِ عبدیت اس درجہ کی ہے کہ ساری ساری رات بارگاہِ صمدیت میں کھڑے ہو کر مصروفِ عبادت رہنے کے باوجود عرض پرداز ہوتے۔

ماعبدناک حق عبادتک

میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔

اس مقامِ عبدیت پر فائز ہو کر جہاں آپ ﷺ کے نعلینِ پاک سے عرفاء و صلحاء کو معرفت عطا ہوتی ہے اور اس حقیقت کے باوصف کہ آپ سے بڑا ذات و صفاتِ حق کا کوئی عارف نہیں۔ بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے:

ما عرفناک حق معرفتک

میں تیری معرفت کا حق ادا نہیں کر سکا۔

یہ شانِ عبدیت جب اپنے کمال پر جلوہ گر ہوئی اور مسلسل مجاہدے اور مشقت سے طبعِ مبارک پر تھکن اور درماندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو فرمایا: کہ اے محبوب اپنی جانِ عزیز پر اتنی مشقت کا بارِ گراں نہ اٹھایئے۔

شانِ عبدیت پر ایک تمثیل

اوپر درج کردہ آیہ کریمہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے جن دو پہلوؤں کا اجمالاً ذکر ہوا انہیں ایک عام فہم مثال کے ذریعے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض کیجئے شفیق اور جان چھڑکنے والے ماں باپ کا بیٹا سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لئے رات گئے تک جاگتا ہے، جب بھی ان کی آنکھ کھلتی ہے اور وہ اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ تیاری میں مصروف دیکھتے ہیں تو سمجھانے کے انداز میں کہتے

ہیں ’’بیٹا! اب کچھ سو جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ اتنی دیر تک جاگنا خرابی صحت کا موجب بن جائے‘‘۔ بیٹے کے سامنے ایک مقصد ہے جسے وہ رات دیر تک جاگنے کے جواز کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن ماں باپ بوجوہ محبت کے تقاضوں کے مجبور ہو کر بیٹے کے صحت و سلامتی کے لئے فکر مند رہتے ہیں۔

بلاتمثیل ذاتِ خداوندی ماں کی ماں تا اور باپ کی شفقت کے تصور سے بدرجہا بلند ہے۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ عبدیت کے تقاضوں کو کماحقہ بجا لانے کے لئے بارگاہِ خداوندی میں مصروفِ عبادت ہوتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ رات کی ساعتیں پھیل کر دامنِ قیامت تک دراز ہو جائیں لیکن باری تعالیٰ کی ذات چاہتی ہے کہ اس کا محبوب رات کا کچھ حصہ آرام بھی کر لے۔

یہ نکتہ محبت ذہن میں راسخ کرنا از بس ضروری ہے۔ روحِ اسلام اور معرفتِ دین سے بے بہرہ ہمارے نام نہاد مبلغ الا ماشاء اللہ اکثر و بیشتر اس نکتۂ محبت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اور وہ دین اسلام کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو خشک اور جذبہ محبت سے عاری ہوتی ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے حوالے سے قرآن و حدیث کا مطالعہ اس نکتے کو اجاگر کرتا ہے کہ اگر ایک طرف سرکارِ دوجہاں ﷺ کی شانِ عبدیت کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ بارگاہِ ایزدی میں عاجزی، تواضع اور گریہ و زاری کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے جھکتے چلے جاتے ہیں تو دوسری طرف آپ ﷺ کی شانِ محبوبیت اس بات کی متقاضی ہے کہ باری تعالیٰ آپ کو جملہ خلائق میں اٹھاتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ آپ ﷺ بلندیوں اور رفعتوں کے مقام منتہا پر دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ میں آ جائے تو نور و بشر کے سارے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں لیکن یہ بصیرت اور سوجھ بوجھ ہر کسی کو کہاں میسر آ سکتی ہے۔ بقولِ شاعر:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اس نکتے کی تفہیم صرف اسی وقت ممکن ہے جب کوئی جہالت اور نادانی کی پٹی اپنی آنکھوں سے اتار پھینکے۔

شانِ محبوبیت

سرورِ کائنات ﷺ کی شانِ محبوبیت پوچھنا ہو تو خالق کائنات سے پوچھئے۔ قرآن کریم کے آئینے میں جھانک کر دیکھیں تو دیکھنے والی آنکھ کو کئی مقامات پر حضور نبی اکرم ﷺ کا مقامِ محبوبی عیاں نظر آئے گا۔ ارشادِ ربانی ہے:

لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ○ وَ اَنْتَ حِلٌّ م بِهٰذَا الْبَلَدِ○

(القرآن، البلد، ۹۰:۱-۲)

''میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں درآنحالیکہ (اے محبوب ﷺ!) آپ اس شہر میں رونق افروز ہیں۔''

آیہ کریمہ میں شہرِ محبوب (مکۃ المکرّمہ) کی قسم اسی نکتہ محبت کے باب میں کھائی جا رہی ہے۔ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں کہ اس شہرِ بے مثال کی قسم میں اس لئے نہیں کھاتا کہ یہاں میرا گھر ہے۔ صفا و مروہ، حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم ہے حالانکہ یہ سب نسبتیں اپنی جگہ عزت وتکریم کی مستحق ہیں لیکن

خوش تر آں شہرے کہ آنجا دلبر است

کے مصداق یہ شہر اس لئے قسم کھانے کے لائق ہے کہ وہاں میرے محبوب کے تلوے لگے ہیں اور اس کے گلی کوچوں میں وہ محوِ خرامِ ناز ہوتا ہے۔

شانِ عبدیت اور شانِ محبوبیت ...... زاویہ نگاہ کا فرق

رسولِ مکرم ﷺ کی شانِ عبدیت اور شانِ محبوبیت آپ ﷺ کی شخصیت مقدسہ کے دو رخ ہیں۔ جب مقامِ عبدیت درپیش ہوتا ہے تو حضور نبی اکرم ﷺ اپنے

تمام کمالات کی نفی کرتے ہوئے خود کو بارگاہِ رب العزت میں جھکاتے ہیں اور ہر کمال کو اپنے مولا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس کے باوصف جب خدا کو اپنے محبوب ﷺ کی شانِ محبوبیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو وہ انہیں اٹھا اٹھا کر ان بلندیوں اور رفعتوں سے ہمکنار کر دیتا ہے جہاں تک رسائی کسی فرد کے بس میں نہیں۔

یہ دو مختلف زاویہ ہائے نگاہ ہیں کہ جب حضور نبی اکرم ﷺ سے ان کے علم کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو مقامِ عبدیت پر وہ علم کو خدا کی ذات سے منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''میں نہیں جانتا علیم و خبیر ذات فقط اللہ تعالیٰ کی ہے''۔ جب یہی سوال باری تعالیٰ سے کیا جاتا تو اپنے محبوب ﷺ کے علم کے بارے میں قرآنِ حکیم کے الفاظ میں جواب یوں مرحمت ہوتا ہے:

وَ عَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَ کَانَ فَضْلُ اللہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا

(القرآن، النساء، ۴: ۱۱۳)

''اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔''

مقامِ عبدیت پر حضور نبی اکرم ﷺ اپنے آپ کو پیکرِ عجز و نیاز اور ادنیٰ و بے کس بندہ بے بس بنا کر پیش کرتے ہیں اور مقامِ محبوبیت پر خدا آپ کی ذاتِ گرامی کو کبھی ''**رحمة للعالمین**'' کبھی ''**شاهدا و مبشرا و نذیرا**'' اور کبھی ''**داعیا الی الله**'' کہہ کر متعارف کراتا ہے اور کہیں ''**سراج منیرا، عزیز علیه ما عنتم**'' اور ''**رؤف الرحیم**'' جیسے توصیفی کلمات سے روشناس کراتے ہوئے اپنی ساری نعمتیں اپنے محبوب ﷺ کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا ضروری و لابدی ہے کہ مقامِ عبدیت پر جو کچھ حضور نبی اکرم ﷺ اپنی ذاتِ ستودہ صفات کی طرف منسوب فرماتے ہیں وہ فقط آپ کا حق ہے اور کسی کے لئے روا نہیں کہ وہ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے مصداق انہی کلمات کو

اپنی زبان پر لائے جو آپ ﷺ نے اپنی نسبت اظہارِ بندگی کے طور پر ادا فرمائے تھے۔ یہ حق کسی کو حاصل نہیں کہ وہ مقامِ عبدیت پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے کلمات کے پیمانے پر آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کو ناپنے لگے۔ مقامِ بندگی کے مظہر کلماتِ عجز و نیاز کی بنیاد پر حضور نبی اکرم ﷺ کی پیغمبرانہ عظمت کا تعین کرنے بیٹھنا، اہل ایمان کا حق نہیں بلکہ ان کا شیوہ تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ حضور رسالتمآب ﷺ کا ذکر باری تعالیٰ کے تتبع میں، رحمۃ للعالمین، حامل فضل عظیم، صاحبِ خلق عظیم اور صاحب حق مبین جیسے قرآنِ حکیم میں فرمائے ہوئے توصیفی پیرایہ ہائے بیان میں کرے۔

شانِ محبوبیت ...... حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں

یہاں ہم آقائے دوجہاں ﷺ کے چند ارشاداتِ گرامی درج کریں گے تاکہ آپ ﷺ کی شانِ محبوبیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

انما انا قاسم و الله یعطی

(بخاری، الصحیح، ۱: ۳۹، کتاب العلم، باب من یرد اللہ خیراً یفقھہ فی الدین، رقم: ۷۱)

''اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور تقسیم ہم ہی کرتے ہیں۔''

الکرامة و المفاتیح یومئذ بیدی

(دارمی، السنن، ۱: ۳۹، رقم: ۴۸)

''قیامت کے روز کرامت اور تمام خزانوں کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی۔''

انا قائد المرسلین و لا فخر وانا خاتم النبیین و لا فخر و انا اوّل شافع و اوّل مشفع و لا فخر

(دارمی، السنن، ۱: ۴۰، رقم: ۴۹)

''میں تمام نبیوں کا قائد ہوں لیکن کوئی فخر نہیں ہے۔ میں خاتم النبیین ہوں اور

کوئی فخر نہیں ہے۔ میں شفاعت کرنے والا ہوں اور میری شفاعت قبول ہونے والی ہے لیکن کوئی فخر نہیں۔''

انا اوّلھم خروجا و انا قائدھم اذا وفدوا و انا خطیبھم اذا انصتوا وانا مشفعھم اذا حبسوا و انا مبشرھم اذا ایسوا و الکرامة و المفاتیح یومئذ بیدی و انا اکرم ولد ادم علی ربی یطوف علی الف خادم کانھم بیض مکنون او لؤلو منثور

(دارمی، السنن، ۱:۳۹، رقم: ۴۸)

''روزِ محشر مجھے سب سے پہلے اٹھایا جائے گا اور میں تمام لوگوں کے وفود کا قائد ہوں گا اور جب سب خاموش ہوں گے تو میں ان کا خطیب ہوں گا اور جب وہ مشکل میں پھنسے ہوں گے میں ان کی شفاعت کروں گا اور جب وہ ناامید ہوں گے میں انہیں بشارت دوں گا۔ تمام کرامتیں اور (خدائی خزانوں) کی چابیاں اس دن میرے ہاتھ میں ہوں گی۔ مجھے میرے رب کی قسم میں بنی آدم میں سے افضل پیدا کیا گیا ہوں اور میرے اِردگرد ایک ہزار خدام طواف کرتے ہوں گے وہ ایسے ہوں گے جیسے سفید موتی یا چمکتے ہوئے دُرِمنثور۔''

اعلی درجة فی الجنة لا ینالھا الا رجل واحد و ارجو ان اکون انا ھو

(ترمذی، الجامع الصحیح، ۵: ۵۸۶، کتاب المناقب، باب فی فضل النبی ﷺ، رقم: ۳۶۱۲)

''جنت میں ایک ایسا اعلیٰ مقام ہے جہاں کسی کی رسائی نہ ہوگی مگر ایک ہستی کی اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ میں ہوں گا۔''

اذا کان یوم القیامة کنت امام النبیین و خطیبھم و صاحب شفاعتھم غیر فخر

(ترمذی، الجامع الصحیح، ۵: ۵۸۶، کتاب المناقب، باب فی فضل النبی ﷺ، رقم: ۳۱۱۳)

’’جب قیامت کا دن آئے گا تو میں نبیوں کا امام، ان کا خطیب اور ان کی شفاعت کروں گا بغیر فخر کے۔‘‘

شانِ عبدیت کے علی الرغم حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو رہا ہے کہ جب آپ ﷺ شانِ محبوبیت میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو خدا کی ذات آپ ﷺ کو کمالات کی بلندیوں کی انتہاء سے ہمکنار کرنے لگتی ہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے مقام کی عظمت و رفعت کا اندازہ لگانا بھی کسی فردِ بشر کے بس کی بات نہیں۔ گویا شانِ محبوبیت میں خدا اپنے محبوب کو بلند سے بلند تر مقامات عطا کرتا چلا جاتا ہے جبکہ شانِ عبدیت میں حضور نبی اکرم ﷺ خود کو بغایت درجہ جھکا جھکا کر عجز و نیاز کا پیکرِ اتم بنا کر پیش کرتے ہیں۔

شانِ محبوبیت اور شانِ عبدیت کا باہمی تعلق

خالق کائنات نے چند در چند حکمتوں کی بناء پر اپنے محبوب میں عبدیت اور محبوبیت کی دونوں شانیں یکجا فرما دیں۔ ان کی اہمیت Significance اور باہمی ربط و تعلق Relevance کو سمجھ لینا از بس ضروری ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کو شانِ محبوبیت سے اس لئے نوازا گیا کہ ہم دنیادار انسان آپ ﷺ کی حیثیت وعظمت کو سمجھ کر اپنے عقائد درست کر سکیں جبکہ شانِ عبدیت آپ ﷺ کو اس لئے عطا ہوئی کہ ہم اپنے اخلاق و اعمال کی اصلاح کر کے اپنی زندگیوں کو سنوار لیں۔ محبوبیت اور عبدیت کی یہ دونوں شانیں بحیثیت مجموعی حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کو تشکیل دیتی ہیں۔

شانِ محبوبیت اور شانِ عبدیت کے باب میں آخری نکتہ سمجھ لینے سے وہ سارے جھگڑے اور تنازعے ختم ہو سکتے ہیں جو بدقسمتی سے نادانی و جہالت کی بناء پر امتِ مسلمہ میں پیدا ہو گئے ہیں۔ صوفیاء اور اہلِ طریقت کے ہاں عروج اور نزول کی دو اصطلاحیں مروج ہیں۔ عروج وہ مقام ہے جو اللہ کا برگزیدہ بندہ درجہ بہ درجہ کمالات طے کر کے حاصل کرتا ہے جبکہ نزول وہ مقام ہے جہاں بندۂ خدا اپنے کمالات کی بلندیوں سے نیچے

اتر کر عام انسانوں کی سطح پر آ جاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا انتہائی ضروری ہے کہ کوئی بھی خدا کا بندہ اس وقت تک اپنی شخصیت میں کامل نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنی ذات کو عروج اور نزول کے اوصاف سے متصف نہ کرے۔ ان اوصاف کو کردار و عمل میں متحقق کئے بغیر انسانی شخصیت بہمہ وجوہ نامکمل اور ادھوری رہتی ہے۔

حقیقتِ رسالتِ محمدی ﷺ

گذشتہ صفحات میں حقیقتِ عبدیتِ مصطفوی ﷺ پر بحث کرتے ہوئے ہماری گفتگو کا اختتام مقامِ عبدیت کے حوالے سے عبد کی اقسام پر ہوا۔ اس ضمن میں عبد کے تین درجات کا اجمالاً ذکر ہوا۔ ان میں مقربِ الٰہی ہونے کی بناء پر عبدِ ماذون مقامِ محبوبیت پر فائز ہے۔ ایک علم انسان اور عبدِ ماذون میں یہ بنیادی فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر نفس اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر بغاوت اور سرکشی کی راہ پر چل نکلتا ہے اور اسے قربِ خداوندی سے محروم کر دیا جاتا ہے جبکہ آخرالذکر خدا کے قربِ خاص کی بناء پر بے پایاں انعامات و نوازشات کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ عبدِ ماذون عالمِ رنگ و بو کی رعنائیوں اور دلکشیوں میں کھو کر نہیں رہ جاتا بلکہ اس کا مدعا اور منتہائے مقصود محبوبِ حقیقی کی رضا اور خوشنودی ہوتا ہے جس کے حصول کے پیش نظر وہ قدم قدم پر بچھے ہوئے حرص و آرزو کے دام سے سالم و محفوظ گزر جاتا ہے۔ اس کی تمام تر زندگی اطاعت و حلقہ بگوشی سے عبارت ہوتی ہے جس کے صلے میں وہ بندگی میں اتنا پختہ اور یگانہ ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مشیتِ ایزدی کا ترجمان ہوتا ہے اور بقول مولائے رومؒ:

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

عبدیتِ کاملہ کے مدارج

ایک عام انسان کی عبدیت ناقص و نامکمل رہتی ہے لیکن درجہ ماذونیت پر فائز ہو کر بتدریج ارتقاء کے نتیجے میں بندہ مقامِ محبوبیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے جس کے آگے

عبدیتِ کاملہ کی منزل آتی ہے۔ عبدیتِ کاملہ کے دو مدارج ہوتے ہیں جس کے اعلیٰ درجے پر تمام حضراتِ انبیاء علیھم السلام فائز ہوتے ہیں جبکہ ادنیٰ درجے میں حفظِ مراتب کے لحاظ سے اولیائے کرام اور صلحائے امت شامل ہیں۔ اس مقام تک رسائی میں مجاہدے اور مشقت و ریاضت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے لیکن جہاں تک عبدیتِ کاملہ کے اعلیٰ و ارفع مقام کا تعلق ہے یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ یہ منزل اکتسابی نہیں کہ جس تک رسائی ہرکس و ناکس کو مجاہدہ و ریاضت کے ذریعے نصیب ہو سکے بلکہ یہ سراسر عطیہ خداوندی اور انعامِ الٰہی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ جسے چاہیں وہبی طور پر نبوت و رسالت کے بلند منصب کے لئے منتخب فرما لیں۔ چنانچہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک انبیاء و رسل کا سلسلہ بنی نوعِ انسان کی رشد و ہدایت کے لئے من جانبِ اللہ مامور رہا اور ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یہ تمام نفوسِ قدسیہ عبدیتِ کاملہ کے مقامِ رفیع سے سرفراز ہوئے۔

مقام رسالت کے مدارج

اولیاء و صلحاء اور بندگانِ حق کی طرح انبیاء و رسل کے بھی اپنے اپنے درجے ہیں جن کا تعین خالصۃً من جانبِ اللہ ہوتا ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور صاحبِ عظمت و دبدبہ نبی بھی تھے جو زندگی بھر رضائے الٰہی کے حصول کے لئے مصروفِ جدوجہد رہتے ہوئے اپنی دعاؤں میں قرآنِ حکیم کے الفاظ میں اس بات کی آرزو اور جستجو کرتے رہے۔

اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَo

(القرآن، النمل، ۲۷: ۱۹)

''اور میں ایسے نیک عمل کرتا رہوں جن سے تو راضی ہوتا ہے اور مجھے اپنی قرب والے نیکوکار بندوں میں داخل فرما لے۔''

منصبِ رسالت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے صاحبِ جبروت بادشاہ اعمالِ صالحہ کی توفیق اس لئے طلب کرتے رہے کہ انہیں خدا کی رضا حاصل ہو جائے۔ اس رضائے الٰہی کے حصول کے لئے انہوں نے زندگی بھر جہدِ مسلسل کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

لیکن رسالت و نبوت کا ایک ایسا درجہ اور مقام بھی ہے جس پر فائز ہو کر محبوبیت کا وہ مقام نصیب ہوتا ہے جہاں خدا خود اس کی رضا کا طالب بن جاتا ہے۔ یہ ارفع اور بلند ترین مقام تمام کائنات میں ابتدائے آفرینش سے تا ابدالاباد صرف امام المرسلین اور آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصے میں آیا جن کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

وَ لَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى

(القرآن، الضحیٰ، ۹۳: ۵)

''اور آپ کا رب عنقریب آپ کو (اتنا کچھ) عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔''

یہ مقامِ محبوبیت وہ مقام ہے جہاں محبّ و محبوب کی رضا ایک ہو جاتی ہے۔ محبوبیت میں کمال اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ محبوب کا ہر عمل مشیتِ ایزدی کے سانچے میں ڈھل جائے اور دونوں کی رضا کامل ہم آہنگی اور مطابقت اختیار کر جائے۔

تحویلِ کعبہ...... مقام رضا کا مظہر

مقامِ محبوبیت پر فائز انبیاء میں بعض متلاشیانِ رضائے حق وہ بھی تھے جو خدا کا گھر تعمیر کرنے کے لئے معمارِ کعبہ بنے لیکن وہ جن کے لئے محبوبیت کا بلند ترین مقام مختص تھا اس جگہ کو جدھر ان کی نگاہیں مشتاقانہ اٹھ گئیں ابدالاباد کیلئے قبلہ بنا دیا گیا۔

ہجرت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ مکۃ المکرّمہ میں کعبہ کی

طرف رخ کر کے نمازیں ادا کرتے تھے۔ مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد حکمِ خداوندی کی تعمیل میں مسلمان بیت المقدس کی سمت رخ کر کے نمازیں پڑھنے لگے اور یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں آنحضور ﷺ کے قلبِ انور میں یہ آرزو کروٹ لینے لگی کہ بیت المقدس کی بجائے کعبۃ اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا جائے۔ اس آرزو کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حضور ﷺ بار بار آسمان کی طرف وحی الٰہی کے انتظار میں اشتیاق بھری نظروں سے تک رہے تھے کہ جبرائیل امین اس پیغامِ حق کے ساتھ بارگاہِ مصطفوی ﷺ میں حاضر ہوئے:

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۴۴)

”(اے حبیب) ہم بار بار آپ کے رخ انور کا آسمان کی طرف پلٹنا دیکھ رہے ہیں سو ہم ضرور بالضرور آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں۔“

حضور ﷺ کا اپنی چشمانِ مقدس سے آسمان کی جانب نگاہ کرنا، قبلہ کی تبدیلی کا پیش خیمہ بن گیا اور اس تحویلِ قبلہ کا حکم بارگاہِ خداوندی سے فقط اس لئے نازل ہوا کہ محبوب کی رضا یہی تھی۔ گویا یہ وہ نقطہ کمال تھا جہاں محبوبیت اور مقربیت باہم متصل ہو گئیں اور محبّ و محبوب کی رضا ایک دوسرے میں ڈھل گئی۔

تاہم یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ باوجود اتنے بلند ترین مقام محبوبیت پر فائز ہونے کے جہاں ارض و سماء کے خزانوں کی کنجیاں حضور ﷺ کے ہاتھوں میں دے دی گئیں اور آپ تاجدارِ هَلْ اَتٰی اور دنیا و آخرت کی نعمتوں کے قاسم قرار پائے، آپ اپنے مقامِ عبدیت سے سرِ مو نیچے نہ آئے بلکہ رفیع الدرجات ہونے کے باوصف آپ کا مقامِ عبدیت اور احساسِ بندگی بدرجہا اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اسی بناء پر حضور ﷺ اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑے کمال خشوع و خضوع اور عجز و نیاز کا پیکرِ اتم نظر آتے ہیں حالانکہ وہ ذات جس کے آگے آپ ﷺ حاضر ہیں حضور ﷺ کی طالب بھی ہے اور مطلوب بھی۔

گویا اس نقطہ کمال پر عبدِ کامل اور معبودِ حقیقی کے مابین ایک ایسا لطیف اور وجد انگیز تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ خدا کی ذات اپنے کامل بندے کی اور بندہ کامل اپنے رب کی رضا کا متلاشی رہتا ہے۔ محبوبیت کا یہ کمال عبادت گزاری سے نصیب ہوتا ہے اور اس کیفیت میں شدت بلند تر درجات کی حامل بن جاتی ہے۔

حضور ﷺ کو اپنی ذات پر قیاس کرنا متاعِ ایمان کو غارت کر دیتا ہے

یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی امتی کو حق نہیں پہنچتا کہ سید عالم ﷺ کے غایت درجہ عجز و نیاز، تواضع و انکسار اور خشوع و خضوع کے پیش نظر آپ ﷺ کے مقامِ رسالت کا تعین کرنے لگے اور آپ ﷺ کے مظاہر بندگی سے دھوکہ کھا کر آپ ﷺ کے معیارِ رسالت کو ایک عام بشر کے درجے پر لے آئے۔ حضور ﷺ کے بارے میں ایسے سطحی اور کمتر خیالات کو دل میں جگہ دینا متاعِ ایمان کو غارت کر کے رکھ دے گا۔

آنحضور ﷺ کے مقامِ عبدیت کو ایک سادہ عام فہم مثال سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی باپ اپنے باشعور بچوں کے سامنے اپنے بوڑھے والد بزرگوار کی خدمت میں انتہائی مؤدب اور متواضع انداز اختیار کئے رہتا ہے۔ اس کے پاؤں دباتا ہے، جوتے سیدھے کرتا ہے اور اس کی خدمت گزاری اور ناز برداری میں کوئی کسر اٹھائے نہیں رہتا تو کیا اس کے بچوں کے لئے اپنے باپ کو خادم کا درجہ دینا روا ہو گا؟ اگر بچوں کی تربیت صحیح نہج پر ہوئی ہے تو وہ اپنے باپ کی اس تواضع اور خدمت گزاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے لائق تقلید سمجھیں گے۔

اسی طرح ایک استاد کا اپنے شاگردوں کے سامنے اپنے سن رسیدہ استاد کی خدمت اور تعظیم و تکریم کرنا

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

کے مصداق ان کے دل میں استاد کی قدر و منزلت بڑھانے اور استاد کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرے گا۔ اسی تمثیل سے حضراتِ انبیاء اور آقائے نامدار ﷺ کی عبادت

گزاری اور اظہارِ عجز و نیاز کو دیکھ کر کسی امتی کا ان کی شان کے منافی سوءِ ادب کے کلمات زباں پر لانا اس کے ایمان کو معرضِ خطر میں ڈال دے گا۔

بندگانِ خدا عبدیت کے ارتقائی مدارج طے کر کے جب کمال حاصل کرتے ہیں تو انہیں مقامِ شکر تک رسائی نصیب ہوتی ہے جس پر انہیں بارگاہِ ایزدی سے یہ مژدہ جانفزا سنایا جاتا ہے:

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ

(القرآن، ابراہیم، ۱۴: ۷)

اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم پر (نعمتوں میں) ضرور اضافہ کروں گا۔

گویا سپاس و تشکر بجا لانا عنایاتِ خداوندی کے مزید در کھول دینے کا موجب بنتا ہے۔ اس قولِ خداوندی کی تائید ایک حدیثِ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

وَمَا تَوَاضع اَحدٌ لِلّٰہِ اِلَّا رَفعَهُ اللہ

(مسلم، ۴: ۲۰۰۱، رقم: ۲۵۸۸)

(ترمذی، ۴: ۳۷۶، رقم: ۲۰۲۹)

(دارمی، ۱: ۴۸۶، رقم: ۱۶۷۶)

(موطا امام مالک، ۲: ۱۰۰۰، رقم: ۱۸۱۷)

''جو اللہ کے لئے (تضرع و زاری اور) تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس (کے مراتب) کو بلند کر دیتا ہے۔''

آنحضور ﷺ کے اس قولِ مبارکہ سے مترشح ہے کہ بندہ جوں جوں بارگہِ خداوندی میں جھکتا چلا جاتا ہے توں توں اس کے درجات بلند سے بلند تر کر دیئے جاتے ہیں۔

ذکرِ مصطفیٰ ﷺ ہر چیز سے بلند تر ہے

خالقِ کائنات نے اپنے حبیبِ لبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خُلقِ عظیم، عجز و

انکسار اور مقامِ عبدیت میں درجہ کمال تک پہنچنے کے باعث آپ کے ذکر کو حسبِ ارشاد قرآنی دنیا کی ہر چیز پر بلندی و رفعت کا مورد ٹھہرایا۔

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ

(القرآن، الم نشرح، ۹۴:۴)

''اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند فرما دیا۔''

اس ارشادِ خداوندی کی توضیح اور تصدیق و تائید ایک حدیثِ مبارکہ کے مضمون سے بخوبی ہو جاتی ہے جس میں حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام سے استفسار فرمایا کہ خدا کے ہاں میرے ذکر کا بلند ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ اس سے منشائے خداوندی یہ ہے:

اِذَا ذُکِرْتُ ذُکِرْتَ مَعِی

(ابن کثیر، ۴: ۵۲۴)

''جب میرا ذکر ہوگا تو آپ کا ذکر بھی میرے ساتھ ہوگا۔''

باری تعالیٰ کا ارشاد اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اے محبوب ﷺ! مجھے ہرگز گوارا نہیں کہ کسی جگہ میرا ذکر ہو رہا ہو اور آپ کا ذکر وہاں نہ ہو۔ گویا رب العزت نے اپنے ذکر کی قبولیت کی لازمی شرط یہ رکھی ہے کہ اس کے حبیب ﷺ کے ذکر کو کبھی اس کے ذکر سے جدا نہ کیا جائے بصورتِ دیگر وہ ذکر شرفِ پذیرائی سے محروم ہوگا اور ایسا کرنے والے کا عمل سعی نامشکور کی ذیل میں آئے گا۔

حلقہ بگوشی مصطفیٰ ﷺ ......محبوبیت کا پہلا زینہ

اگر کوئی بندہ خدا کا محبوب بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے اطاعت و اتباعِ مصطفوی ﷺ اختیار کرنا اولین شرط ہے۔ مقامِ محبوبیت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے حضور ﷺ کی حلقہ بگوشی میں آنا لازمی و لابدی ٹھہرایا گیا جیسا کہ قرآنِ حکیم میں بصراحت ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(القرآن، آل عمران، ۳: ۳۱)

’’(اے حبیب) آپ فرما دیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا۔‘‘

اس آیہ مبارکہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہے کہ حضور ﷺ کی اتباع و اطاعت کے بغیر خدا کی اطاعت اور محبت کا دعویٰ کرنا محض خام خیالی ہے۔ خدا اور محبوبِ خدا کی محبت و اطاعت لازم و ملزوم ہے۔ گویا عبدیت کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن نے وہ تمام امتیازات یکسر مٹا دیئے جن سے خدا اور رسول کے درمیان دوئی یا مغائرت کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

خدا و مصطفیٰ ﷺ کے باہمی تعلق پر قرآنی ارشادات

قرآنِ حکیم میں ایسے مقامات بے شمار ہیں جن میں ایمان، اطاعت اور محبت کے باب میں باری تعالیٰ نے اپنا اور اپنے محبوب ﷺ کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔ اس ضمن میں بعض ارشاداتِ خداوندی کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱ – اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ

(القرآن، الحجرات، ۴۹: ۱۵)

’’بے شک مومن (تو) وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (دل و جان سے) ایمان لاتے ہیں۔‘‘

۲ – وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔

(القرآن، الانفال، ۸: ۱)

’’اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیا کرو اگر تم ایمان والے ہو۔‘‘

۳– وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا

(القرآن، النساء، ۴: ۱۴)

’’اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کے حدود سے تجاوز کرے اسے وہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔‘‘

۴– وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ

(القرآن، الانفال، ۸:۱۳)

’’اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بے شک اللہ (اسے) سخت عذاب دینے والا ہے۔‘‘

۵– اَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ

(القرآن، التوبہ، ۹:۶۳)

’’کیا وہ نہیں جانتے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے لئے دوزخ کی آگ (مقرر) ہے۔‘‘

۶– وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ

(القرآن، التوبہ، ۹:۲۹)

’’اور نہ ان چیزوں کو حرام جانتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔‘‘

۷– اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ

(القرآن، المائدہ، ۵:۳۳)

’’بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں۔‘‘

۸– وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ

(القرآن، التوبہ، ۹:۵۹)

’’اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ لوگ اس پر راضی ہو جاتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے عطا فرمایا تھا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے۔‘‘

۹ – وَمَا نَقَمُوْا اِلَّا اَنْ اَغْنٰـهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُـهٗ مِنْ فَضْلِـهٖ

(القرآن، التوبہ، ۹: ۷۴)

’’اور وہ (اسلام اور رسول کے عمل میں سے) اور کسی چیز کو ناپسند نہ کر سکے سوائے اس کے کہ انہیں اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا تھا۔‘‘

۱۰ – سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلِـهٖ

(القرآن، التوبہ، ۹: ۵۹)

’’عنقریب ہمیں اللہ اپنے فضل سے اور رسول (مزید) عطا فرمائے گا۔‘‘

۱۱ – وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِـهٖ

(القرآن، التوبہ، ۹: ۳)

’’(یہ آیات) اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان (عام) ہے۔‘‘

۱۲ – بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِـهٖ

(القرآن، التوبہ، ۹: ۱)

’’اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بیزاری (و دست برداری) کا اعلان ہے۔‘‘

۱۳ – فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَـرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

(القرآن، النساء، ۴: ۵۹)

’’پھر اگر کسی مسئلہ میں تم باہم اختلاف کرو تو اسے (حتمی فیصلہ کے لئے) اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف لوٹا دو۔‘‘

۱۴ – اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ

(القرآن، الاحزاب، ۳۳: ۳۶)

’’جس پر اللہ نے احسان فرمایا ور آپ نے بھی احسان کیا (یعنی اس کو وہ چیز دی جو اس کے حوصلہ سے زیادہ تھی)‘‘

۱۵ – وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

(القرآن، الاحزاب، ۳۳: ۳۶)

''اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ فرما دے تو پھر ان کا اپنے معاملے میں کچھ اختیار (باقی) رہ جائے۔''

کوئی عملِ خیر نسبتِ مصطفوی ﷺ کے بغیر مقبول نہیں

متذکرہ بالا تمام قرآنی ارشادات میں اللہ رب العزت نے اپنا اور اپنے محبوب ﷺ کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے حالانکہ ہر مقام پر نسبت کسی ایک کے ساتھ بھی ہو سکتی تھی۔ دونوں کو یکجا کرنے سے باری تعالیٰ لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور راسخ کرنا چاہتے ہیں کہ میرے محبوب ﷺ کو درمیان میں لائے بغیر کوئی عمل مقبول اور کوئی سعی مشکور نہیں ہوسکتی۔ خدا کو تو یہ بھی گوارہ نہیں کہ وہ عمل جس کی نسبت براہِ راست اس کی ذات سے ہے جیسے قربانی، جو خالصتاً خدا کے لئے دی جاتی ہے اس کے حبیب ﷺ کی مسابقت میں کیا جائے۔ روایات میں ہے کہ ایک دفعہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی قربانی کا جانور آقائے دوجہاں ﷺ سے پہلے ذبح کر لیا۔ ان کا یہ عمل بارگاہِ خداوندی میں ناپسندیدہ ٹھہرا اور انہیں جملہ اہل ایمان کے ساتھ قرآن حکیم کے ذریعے یہ سرزنش سنائی گئی:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ

(القرآن، الحجرات، ۴۹: ۱)

''اے ایمان والو! تم اللہ و رسول سے (کسی معاملہ میں) سبقت نہ کیا کرو۔''

اس آیہ کریمہ میں ان اہل ایمان کو جنہوں نے یہ عمل خیر (قربانی) نادانستہ حضور ﷺ سے پہلے سرانجام دیا متنبہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ تمہارا قربانی کرنے کا عمل خالصتاً اللہ کے لئے ہے اور خدا کا رسول بھی اسی کے لئے قربانی کرتا ہے لیکن جان لو کہ تمہارا یہ

عمل رائیگاں گیا کہ کسی معاملہ میں خدا اور رسول ﷺ سے پہلے کرنا شرفِ قبولیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان اصحابِ رسول کو دوبارہ قربانی دینے کا حکم ہوا۔

آقائے دوجہاں ﷺ کے ذکر کو خدا کے ساتھ جو نسبت تھی اس کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پورا ادراک تھا۔ ان کا یہ معمول تھا کہ جب کبھی وہ ذکرِ خدا کرتے تو ذکرِ رسول کو اس سے جدا نہ کرتے۔ وہ حضور ﷺ کے مقامِ محبوبیت سے کماحقہ آشنا تھے کہ خدا کے بعد بزرگی و یکتائی میں کوئی آپ کا شریک و ہمسر نہیں۔ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس امر کی تواتر کے ساتھ تائید ملتی ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آقا و مولا ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنا سارا مال و منال لے کر بارگاہِ اقدس میں حاضر ہو گئے تو حضور ﷺ نے اپنے اس جانثار رفیق سے دریافت فرمایا:

مَا أَبْقَيْتَ لِأَهْلِکَ يَا أَبَابَکْر

(جامع الترمذی، ۵:۶۱۴، رقم: ۳۶۷۵)
(سنن دارمی، ۱: ۴۸۰، رقم: ۱۶۶۰)

''اے ابوبکر! اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ کر آیا ہے؟''

تو پروانہ چراغِ مصطفوی ﷺ نے جو جواب دیا وہ حدیث کی کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے:

أَبْقَيْتُ لَهُم اللّٰهُ وَرَسُوْلَهُ

(جامع الترمذی، ۵:۶۱۴، رقم: ۳۶۷۵)
(سنن دارمی، ۱:۴۸۰، رقم: ۱۶۶۰)

''میں ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول چھوڑ آیا ہوں۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کی جناب رسالتمآب ﷺ سے ذاتی وابستگی و شیفتگی اور حضور ﷺ پر ایمان اس درجے کا تھا کہ اثنائے گفتگو جب کوئی ایسا معاملہ زیر بحث آتا جس کے بارے میں انہیں علم نہ ہوتا تو وہ بے ساختہ پکار اٹھتے واللہ اعلم و رسولہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔

واسطہ رسالت ہی توحید باری تعالیٰ کی اولین و آخریں دلیل

خدا کی ذات واحد و یکتا ہے لیکن اس امر سے کسی کو انکار نہیں کہ کوئی انسانی آنکھ خدا کے وجود کا مشاہدہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتی اور کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنے ذاتی علم سے ذاتِ باری تعالیٰ کی الوہیت و وحدانیت کا ادراک اور عرفان حاصل کر سکے۔ چونکہ باری تعالیٰ کی توحید کا اثبات بغیر واسطہ رسالت ممکن ہی نہیں اس لئے جب بعثت کے بعد حضور ﷺ نے کفار و مشرکین مکہ کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے آپ ﷺ سے توحید باری تعالیٰ پر جو دلیل طلب کی اس کا جواب قرآنِ حکیم نے حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے یوں کہلوایا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○

(القرآن، یونس، ۱۰: ۱۶)

''بے شک میں اس (قرآن کے اترنے) سے قبل (بھی) تمہارے اندر عمر (کا ایک حصہ) بسر کر چکا ہوں سو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔''

حضور ﷺ نے توحید باری تعالیٰ پر اپنی چالیس سالہ زندگی کو بطورِ دلیل پیش کر کے ایسا چیلنج دیا جس کا دنیائے کفر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آپ کی قبل از بعثت پوری زندگی کفار و مشرکین کے سامنے کھلی کتاب تھی جس کا کوئی ورق ایسا نہ تھا جس پر سیرت و کردار کا کوئی نقص اور دھبہ ہوتا، اگر آپ ﷺ کی صاف و شفاف زندگی کے دامن پر کوئی داغ ہوتا تو معاندین حق کبھی اس کی اعلانیہ نشاندہی سے باز نہ رہتے لیکن آپ ﷺ کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی بعثتِ مبارکہ سے قبل کی زندگی پر انگشتِ اعتراض بلند نہ کر سکا۔ اس طرح اثباتِ توحید پر حضور ﷺ کی حیات طیبہ اتنی بڑی دلیل اور برہانِ قاطع ہے کہ آج تک عالمِ کفر حتمیت وقطعیت کے ساتھ اس کا رد نہیں کر سکا۔ بلاشک و ریب قرآن حکیم نے کفر و اسلام اور منافقت و ایمان کے باب میں حضور ﷺ کی ذات کو حتمی اور دائمی معیار کے طور پر پیش کیا ہے اور ایمان و اسلام کی پرکھ اسی حوالے سے ہو سکتی ہے۔ گروہِ منافقین کی پہچان کراتے ہوئے قرآنِ حکیم ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا قِیۡلَ لَھُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَا اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنَافِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا

(القرآن، النساء، ۴: ۶۱)

’’اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف اور رسول (ﷺ) کی طرف آ جاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کی طرف رجوع کرنے) سے گریزاں رہتے ہیں۔‘‘

اس آیہ کریمہ میں منافقین کا یہ شیوہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ذاتِ رسالتمآب ﷺ کی اطاعت و اتباع سے روگردانی اور انحراف کی روش اختیار کئے رہتے ہیں۔ منافقوں کا وجود روزِ اول سے اسلام کے روشن ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

ایمان بالرسالت ایمان بالتوحید کے لئے لازمی شرط ہے

یہ بات الم نشرح ہے کہ ذاتِ رسالتمآب ﷺ پر ایمان لائے بغیر مجرد توحید باری تعالیٰ پر ایمان کا دعویٰ لغو اور بے حقیقت ہے۔ جب تک دہلیزِ مصطفیٰ ﷺ پر سرِ تسلیم خم نہ کیا جائے خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کا دعویٰ محض خام خیالی ہوگا۔ چنانچہ جو کوئی توحید ہی کو اسلام اور ایمان کا مرکز ومحور قرار دیتا ہے اس کا یہ فعل قرآن کی نظر میں منافقت متصور ہوتا ہے جو کہ کفر سے بھی بدتر ہے۔

قرآنِ حکیم نے ان بد باطن اور کج فطرت لوگوں کے بارے میں جو حضور ﷺ کی ذات کو مطاع اور اپنے اختلافی معاملات میں بشرحِ صدر اپنا حکم تسلیم نہیں کرتے بڑے واشگاف الفاظ میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

فَلاَ وَ رَبِّکَ لاَ یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَھُمۡ ثُمَّ لاَ یَجِدُوۡا فِیۡ اَنۡفُسِھِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَ یُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا

(القرآن، النساء، ۴: ۶۵)

”پس (اے حبیب) آپ کے رب کی قسم یہ لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں آپ کو حاکم بنا لیں پھر اس فیصلہ سے جو آپ صادر فرما دیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور (آپ کے حکم کو) بخوشی پوری فرمانبرداری سے قبول کر لیں۔“

حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی تمام امت کے لئے مطاع کا درجہ رکھتی ہے اور ہر ایک پر بلااستثناء واجب ہے کہ وہ دل سے آپ ﷺ کی اطاعت بجا لائے۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللهِ

(القرآن، النساء، ۴: ۶۴)

”اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ رسول کی اطاعت ہی خدا کی اطاعت ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا متصور نہیں کیا جا سکتا۔ ارشادِ ربانی ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ

(القرآن، النساء، ۴: ۸۰)

”جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ (ہی) کا حکم مانا۔“

ظاہر و باہر ہے کہ حضور ﷺ کے حلقہ غلامی میں آئے بغیر جو کوئی ایمان کا دعویٰ کرے گا وہ اس کے منہ پر مار دیا جائے گا۔ ایسے دعوے کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کا اپنے ذکر کے ساتھ اپنے حبیب ﷺ کے ذکر کو ملزوم کر دینا اس بات کی بین دلیل ہے کہ ایمان و اتباع کے باب میں دونوں سے بیک وقت اور ایک ساتھ نسبت قائم کرنا ہی اسلام کا اساسی تصور ہے جسے دل و دماغ میں راسخ کرنا مبادیاتِ ایمان میں سے ہے۔ اس تصور کو قرآنِ حکیم ایک اور مقام پر مزید وضاحت سے بیان فرماتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَo

(القرآن، التوبہ، ۹:۶۲)

''حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہے کہ اسے راضی رکھا جائے اگر یہ لوگ ایمان والے ہوتے۔''

متذکرہ صدر آیہ کریمہ میں یہ بات خصوصی توجہ کی محتاج ہے کہ کلمہ یرضوہ میں **ہٗ** کی ضمیر واحد مذکر استعمال کی گئی جبکہ اس سے پہلے آیت کے حصے میں ''اللہ'' اور ''رسول'' کا ذکر کیا گیا ہے اور عربی قواعد کی رُو سے اس کے لئے صیغہ تثنیہ میں ''ھما'' کی ضمیر آنی چاہیئے تھی لیکن دونوں ہستیوں کے لئے ایک ہی ضمیر کا لانا اس امر کا غماز ہے کہ جب اللہ اپنے محبوب کا ذکر اپنی نسبت سے کر رہا ہے تو اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ کو راضی کرنا بدرجہ اولیٰ اس بات کا متقاضی ہے۔ پہلے اس کے رسول کو راضی کیا جائے۔ قرآنِ حکیم نے یہ منفرد اور اچھوتا انداز اور پیرایہ بیان اختیار کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان دوئی کے ہر تصور کو کلیتاً ختم کر دیا اور قلبِ انسانی میں یہ حقیقت جاگزیں کر دی کہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کا معاملہ درپیش ہو تو دونوں حقیقت میں ایک ہی شمع کا پرتو ہو گا۔ اس بنا پر رسول کی ناراضگی خدا کی ناراضگی متصور ہو گی۔ اس نکتے کو قرآنِ حکیم ایک اور مقام پر انتہائی بلیغ اور جامع و مانع انداز سے بایں الفاظ بیان کرتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰىo

(القرآن، النجم، ۵۳:۳-۴)

''اور وہ اپنی (یعنی نفس کی) خواہش سے بات ہی نہیں کرتے وہ تو وہی فرماتے ہیں جو (اللہ کی طرف سے) ان پر وحی ہوتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔''

یہ آیہ کریمہ بصراحت اس نکتے کو بیان کر رہی ہے کہ رسولِ مقبول ﷺ اپنی

خواہش سے ایک لفظ بھی نہیں بولتے اور ان کی گفتار سراسر وحی الٰہی کے تابع ہے۔ اگر وہ کلامِ لفظی جبرائیل امین علیہ السلام کے توسط سے ہے تو اسے وحی متلو اور قرآن کہیں گے۔ اگر وہ کلامِ نفسی جبرئیل علیہ السلام کے واسطے کے بغیر ہے تو اسے وحی غیر متلو اور حدیث سے تعبیر کیا جائے گا۔ قرآن لفظاً اور معناً کلامِ الٰہی ہے۔ اس کے برعکس حدیث وہ کلام ہے جس کے معنی اللہ کی طرف سے القاء ہوئے ہیں لیکن الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے ہیں۔ تاہم یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں علومِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مظہر و آئینہ دار ہیں اور ان کا سرچشمہ و منبع وحی الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کے بارے میں اللہ رب العزت کا یہ ارشاد غور وفکر کا متقاضی ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ

(القرآن، التکویر، ۸۱: ۱۹)

’’بے شک یہ (قرآن) بڑی عزت و بزرگی والے رسول کا (پڑھا ہوا) کلام ہے۔‘‘

قرآن و سنت میں ایک کا انکار دوسرے سے انکار کے مترادف ہے

قرآن کلامِ الٰہی ہے جبکہ سنت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال کا وہ مستند ریکارڈ ہے جس کی تدوین وتسوید احادیثِ مبارکہ کی صورت میں عمل میں آئی۔ بعض نام نہاد اہل علم اور کوتاہ نظر دانشور یہ کہہ کر احادیث کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن کافی ہے۔ ہمیں سنتِ مبارکہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ نادان اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ قرآن کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ اطہر پر نازل ہوا اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سند پر بلا چوں و چرا قرآن تسلیم کرلیا۔ کیا کسی فردِ بشر نے اپنی آنکھ سے

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حضور ﷺ کی طرف قرآن لاتے ہوئے دیکھا؟ اگر نہیں دیکھا تو کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس قول کو جس کی نسبت حضور ﷺ اپنی طرف کر رہے ہیں حدیث کہہ کر کم اہم سمجھے اور اس کی حجیت سے انکار کر بیٹھے۔ کم علموں کا یہ اندازِ فکر استدلال کی کمزوری پر مبنی ہے۔ ان کے پاس احادیثِ صحیحہ کی ثقاہت سے انکار کا کوئی عقلی و نقلی جواز نہیں ہے۔ ذخیرہ احادیث ہمارے اسلاف اور اکابرین کی برسوں کی محنتِ شاقہ اور تحقیق و تفحص کا نتیجہ ہے۔ ان کی اساس پر جو سنتِ مبارکہ مدون کی گئی اس سے تمسک کئے بغیر قرآنِ حکیم کے مطالب و معارف تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔

توحید و رسالت ایک ہی نورِ لم یزل کی شعاعیں ہیں

دین اسلام کی حقانیت اور قرآن وسنت کی قطعیت وحتمیت کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ ایمان کے اس اساسی اور بنیادی تصور کو قلب و باطن میں جاگزیں کر دیا جائے کہ توحید و رسالت ایک ہی شمع کی کرنیں ہیں اور دونوں کے انوار ایک ہی منبع و سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں۔ توحید باری تعالیٰ تک رسائی رسالت کے راستے ہی سے ممکن ہے اور یہی وہ منہاج ہے جو بنی نوعِ انسان کو توحید باری تعالیٰ کی منزل تک لے جاتا ہے۔ درِ رسالت پر پہنچے بغیر مجرد عقیدہ توحید کا دعویٰ خام اور بے بنیاد و غیر معتبر ہے۔ رسول کی نسبت کو درمیان سے نکال دینے سے دین اسلام کی عمارت دھڑام سے نیچے گر جائے گی اور انسان ضلالت و گمراہی کے اندھیروں میں سرگرداں پھرتا رہے گا۔

عقیدہ توحید کے باب میں قرآنِ حکیم حضرت یعقوب علیہ السلام کا تذکرہ کرتا ہے کہ جب ان کے وصال کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو بلا کر پوچھا:

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۳۳)

''تم میرے (انتقال کے) بعد کس کی عبادت کرو گے؟''

فرزندانِ یعقوب نے بیک زبان قرآنی الفاظ میں یوں جواب دیا:

نَعۡبُدُ اِلٰـهَکَ وَ اِلٰـهَ اٰبَـآءِ کَ اِبۡرٰهٖـمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۳۳)

''ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے۔''

بیٹوں کے اس جواب سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی تسلی وتشفی ہوگئی۔ اس سے یہ عقدہ حل ہوا کہ انبیائے کرام کے واسطے کے بغیر کسی انسان کے لئے معبودِ حقیقی کی پہچان اور معرفت ممکن نہیں۔ اگر کوئی نبوت و رسالت کے بغیر خدا کی معرفت تک رسائی کی کوشش کرے گا تو وہ عقل وخرد کی بھول بھلیوں میں گم ہوکر ضلالت وگمراہی کا شکار بن جائے گا۔

توحید و رسالت کا باہمی ربط وتعلق انتہائی نازک نوعیت کا ہے جس کی تفہیم میں بہت سے اہل فکر ونظر دھوکہ کھا گئے اور منزلِ مقصود سے بھٹک کر دور ہو گئے۔

نسبتِ رسالت ...... خدا کی نظر میں

کائنات کے خالق و مالک کو اپنے محبوب ﷺ کی نسبت کتنی عزیز ہے اس کا اندازہ بیعتِ رضوان کے واقعہ سے ہوتا ہے۔ جب سرورِ دوجہاں ﷺ اپنے صحابہؓ سے بیعت لے چکے تو باری تعالیٰ نے ان کے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو قرآنِ حکیم کے الفاظ میں اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا قرار دیا، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ یَدُاللّٰهِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡهِمۡ

(القرآن، الفتح، ۴۸: ۱۰)

''(اے رسول) بلاشبہ جو لوگ آپ سے (آپ کے ہاتھ پر) بیعت کرتے ہیں فی الحقیقت وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں (گویا) اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔''

اسی طرح غزوہ بدر کے موقع پر جب حق و باطل کا معرکہ بپا ہونے والا تھا تو حضور ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں لشکرِ کفار کی طرف پھینکیں تو اللہ رب العزت نے حسبِ ارشاد قرآنی کنکریاں پھینکنے کے اس واقعہ کو اپنی طرف منسوب کیا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى

(القرآن، الانفال، ۸: ۱۷)

’’اور (اے حبیب محتشم) جب آپ نے (ان پر سنگریزے) مارے تھے (وہ) آپ نے نہیں مارے تھے بلکہ (وہ تو) اللہ نے مارے تھے۔‘‘

اس سے ظاہر ہوا کہ باری تعالیٰ کو اپنے محبوب ﷺ کی نسبت اتنی عزیز ہے کہ وہ آپ ﷺ کے ہر قول و فعل کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ یہ نکتہ عقیدہ توحید کی اساس ہے جسکو سمجھ لینے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ توحید و رسالت ایک ہی حقیقتِ ثابتہ کے دو جزو ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔

حرفِ آخر

شہادتِ توحید و رسالت کی اس بحث کا خلاصہ اور لبِ لباب یہ ہے کہ ایمان و اسلام وہی کامل ہے جس میں توحید کی منزل تک رسائی رسالت کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ واسطہ رسالت کے بغیر مجرد ایمان کا تصور انسان کو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا اس لئے کہ

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

رسالت سے تعلق منقطع کر کے عقیدہ توحید منافقت کے مترادف ہے جو خدا کی نظر میں کفر سے بھی بدتر ہے۔

مقامِ نبوت کی دو جہتیں

عبدیت اور رسالت

کلمہ شہادت میں ''عبدہ ورسولہ'' کے حوالے سے حضورِ اکرم ﷺ کی دو صفتوں اور جہتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک عبدیت او دوسری رسالت۔ یہ دونوں صفتیں اور جہتیں آپ ﷺ کے مقام و منصب کی مظہر ہیں۔حضور ﷺ کے مقامِ عبدیت کے باب میں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ اس دورِ زوال میں جب بگاڑ کے نتیجے میں علمی اور دینی تصورات اپنی اصل شکل اور ہیئت کھو چکے ہیں، لوگوں نے دین کو کھیل تماشا بنا لیا ہے، علم کی کمی اور نادانی و جہالت کے باعث لوگ اعلیٰ و ارفع تصورات و معتقدات کو بھی متنازعہ فیہ بنا کر ان کی عظمت سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کوتاہ نظروں اور کم فہموں نے حضور ﷺ کے بارے میں نور و بشر کا جھگڑا کھڑا کر کے آپ ﷺ کی عبدیت کو بشریت کے درجے پر لے آنا اور اپنا سارا زورِ بیاں آپ ﷺ کے بشر ہونے کو ثابت کرنے پر لگانا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ کتنی بڑی نادانی ہے کہ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ بشریت اور شئے ہے اور عبدیت اور شئے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ عبدیت کا مقام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ مجرد بشریت تو درکنار عالمِ بشریت و عالمِ نورانیت کے تمام کمالات بھی یکجا و مجتمع کر لئے جائیں تب بھی وہ مقامِ عبدیت کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

آنحضور ﷺ جب معراج سے سرفراز فرمائے گئے تو شبِ اسریٰ عالمِ بشریت کے جملہ کمالات بیت المقدس پر تمام ہو گئے اور عالمِ نورانیت کے مقامات و کمالات سدرۃ المنتہیٰ پر ٹھٹک کر رہ گئے لیکن پیکرِ محمدی ﷺ اپنے تمام تر جلوؤں کے ساتھ ''قاب قوسین'' پر حاوی ہو گیا۔ یہ شان، شانِ عبدیت ہے جس کے ہمسری بشریت اور نورانیت مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ کی عبدیت

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى○

(القرآن، النجم، ۵۳: ۱۰)

’’پھر (اللہ رب العزت نے بلاواسطہ) اپنے بندہ کو جو وحی فرمانا تھی فرمائی (جو دینا تھا دیا جو بتانا تھا بتایا)‘‘

کی مصداق ہے جس کی حقیقی معرفت تک رسائی نہ عالمِ بشریت کا کوئی فرد حاصل کر سکتا ہے اور نہ عالمِ روحانیت میں کسی کو اس کی کامل معرفت نصیب ہو سکتی ہے۔

باعتبارِ توجہ نبوت کی دو جہتیں

رورِ کائنات فخر موجودات ﷺ کی ذاتِ اقدس کی دو جہات، جہتِ عبدیت اور جہتِ رسالت، پیکرِ نبوت کی دو جہات کی نشاندہی کرتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ اپنے شرعی مفہوم کے اعتبار سے نبوت دو جہات سے عبارت ہے۔ ایک توجہ الی الخالق ہے اور دوسری توجہ الی الخلق۔ ذیل میں ان کا تذکرہ قدرے شرح و بسط سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ توجہ الی اللہ

نبوت کا ایک رابطہ براہِ راست بارگاہِ الوہیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ربط و تعلق جو نبوت کو بارگاہِ رب العزت سے ہوتا ہے اسے عبدیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۔ توجہ الی الخلق

نبوت کی ایک جہت خالق کی طرف متوجہ ہونا ہے تو دوسری جہت مخلوق پر توجہ مرکوز کرنا ہے۔ گویا نبوت خالق اور خلق کے مابین باہمی رابطے کا ذریعہ اور واسطہ ہے۔ نبوت کا وہ ربط جو عالمِ خلق کے ساتھ استوار ہوتا ہے اسے رسالت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسالت عبارت ہے اس پیغامِ رشد و ہدایت سے جسے لے کر کوئی نبی عالمِ بشریت میں مخلوق کی طرف آتا ہے۔

حضور ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات توجہ الی اللہ کی جہت میں بارگاہِ الوہیت سے فیض حاصل کر کے توجہ الی الخلق کی جہت میں مخلوقِ خداوندی کو منتقل کر دیتی ہے۔ یہ

عبدیت کا ربط جسے آج کا مادیت پرست انسان ایک معمولی چیز سمجھتا ہے نبوت کا عروج ہے جبکہ نبی کی رسالت اس کی نبوت کا نزول ہے۔ یہ عروج اور نزول تصوف کی دو اصطلاحات ہیں جن سے ہمارے صوفیاء وعرفاء حضور ﷺ کی نبوت کے دو کمال اور صفتیں بیان کرتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے۔

نبوت کی جہتِ عروج

عروج کا مفہوم تمام بلندیوں اور رفعتوں کے مالک اللہ کی طرف جانا ہے۔ اس میں تکمیل ذات کی صفت پائی جاتی ہے۔ برگزیدہ بندگانِ خدا میں کچھ حال مست ایسے بھی ہیں جو بارگاہِ الوہیت میں جاتے ہیں تو اپنی ذات میں گم ہوکر وہیں کے ہوکر رہ جاتے ہیں۔تقرب الی اللہ کی منزل تک پہنچ کر اور اسکے فیوضات اپنے اندر جذب کر کے وہ عالمِ جذب ومستی میں لازوال حسن مطلق کے نظاروں میں اتنے منہمک ومستغرق ہو جاتے ہیں کہ اپنی اس حالت کو چھوڑ کرانہیں واپس پلٹنا گوارانہیں ہوتا۔ یہ عروج کا وہ مقام ہے جس میں کچھ بندگانِ خدا مست ایسے سرشار وسرمست ہوتے ہیں کہ اپنے اوپر مجذوبیت کا لبادہ اوڑھ کر وہیں اسیر ہوکر رہ جاتے ہیں۔

نبوت کی جہتِ نزول

عروج کے مقام پر اللہ کے کچھ خاص اور محبوب بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں مبداءِ فیض بہت بڑا ظرف دے کر پیدا کرتا ہے۔ وہ جب اپنی تکمیل ذات کا سفر طے کر لیتے ہیں تو بارگاہِ خداوندی سے انہیں حکم ملتا ہے کہ اب اسی مقام میں گم ہوکر نہ رہ جاؤ بلکہ میری اس مخلوق کے پاس جاؤ جوپستی کے گڑھوں میں گری ہوئی ہے اور اس کا ربط وعلاقہ مجھ سے کٹ چکا ہے۔ اس گری پڑی مخلوق کو پستیوں سے نکالنا اور اس کا تعلق پھر سے میری ذات کے ساتھ قائم کرنا تمہارا کام ہے۔

وہ محبوبانِ خدا جب بلندیوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں تو متوجہ الی الخالق

کے درجے پر فائز ہوتے ہیں اور جب وہ وہاں سے الوہی پیغام کے ساتھ واپس ہوتے ہیں تو متوجہ الی الخلق ہو جاتے ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ایک صالح بزرگ ہو گزرے ہیں۔ وہ اس کی توضیح اپنی مثال سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ شبِ معراج مقامِ قاب قوسین پر پہنچے اور بارگاہِ الوہیت سے حسن مطلق کا جلوہ کر کے واپس لوٹ آئے۔ اگر مجھے وہاں جانا نصیب ہوتا تو کبھی لوٹ کر نہ آتا۔ مقصد ان کا یہ کہنا تھا کہ عروج کے سفر میں تجلیاتِ الٰہیہ سے سیراب ہونے کے بعد مجھے تکمیلِ ذات کی طرح منزل تک رسائی نصیب ہوجاتی تو میں اس مقام سے پلٹنے کا نام نہ لیتا۔ یہ عروج کی کیفیت کمالِ تمام کی مظہر نہیں اس لئے کہ وہ جو اپنی ذات کی تکمیل ہی کو منزلِ مقصود سمجھتے ہیں ان کا کمال ناقص رہتا ہے۔

حضور ختمی مرتبت ﷺ کا کمال اپنے لئے نہیں بلکہ تمام خلق کے لئے تھا اس لئے کہ وہ خود تو مکمل تھے اور نامکمل انسانیت کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی

ان اللہ بعثنی لتمام مکارم الاخلاق

(مشکوٰۃ المصابیح: ۵۱۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا۔

اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ہی فضائلِ اخلاق کا منبع و مبداء ہیں اور ساری اخلاقی قدریں آپ کے وجودِ پاک سے جنم لیتی ہیں۔ عالمِ بشریت میں انہیں ناتمام و نامکمل اخلاقی اقدار کے اتمام و تکمیل کے لئے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ عروج کے مقام پر پہنچ کر اس کی لذتوں اور کیف آفرینیوں میں بھی اپنی امت کو نہ بھولے اور اس لمحہ بھی جب اپنی امت کو بہمہ حال یاد رکھا اس لئے کہ عروج کے بعد ان کا نزول بھی ہونا تھا۔ چونکہ نبوت کی یہ دونوں جہتیں اپنے کمال کی انتہاء پر تھیں اس لئے آپ جلوہ ذاتِ حق میں مستغرق ہو کر خود فراموش نہ ہوئے بلکہ اپنی گنہگار اور عصیاں کار امت کو یاد رکھا۔

گنہگار اور صالح بندوں کو مژدۂ سلامتی

معراج میں جلوہ ہائے حسنِ ایزدی کے روبرو بھی آپ اپنی معصیت کوش امت کو نہ بھولے۔ بارگاہِ الوہیت سے جب آپ کو ہدیہ و ارمغانِ اسلام اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ کی صورت میں مل رہا تھا تو آپ ﷺ خدا کا دامنِ رحمت تھام کر عرض پیرا ہوئے اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِیْنَ آپ ﷺ نے سفارش فرمائی کہ باری تعالیٰ اپنے ان بندوں کو جو صالح ہیں سلامتی سے نواز دے اور رہ گئے وہ گنہگار بندے جو زمرہ عِبَادُ اللهِ الصَّالِحِیْنَ میں شامل نہیں ہیں اور نیکوکاری و صالحیت کے فقدان کے باعث تیری سلامتی کے حقدار نہیں تھے انہیں میں اپنے ساتھ اپنی معیت میں شامل کر کے ان کی سلامتی کے لئے تیری بارگاہِ بیکس پناہ میں درخواست گزار رہا ہوں۔ تو اپنے صالح بندوں کے درجات میرے سبب سے بلند کر دے اور وہ جو میری امت کے گنہگار ہیں انہیں بھی میری محبت کے باعث اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔

عروج اور نزول کے حوالے سے یہاں یہ نکتہ بیان کرنا مقصود ہے کہ سیرت کے کمال کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہے کہ صاحبِ سیرت کی ذات اپنی تکمیل کے بعد دوسروں کے لئے نفع کا باعث بنتی ہے یا نہیں۔ وہ سیرت جس میں اپنی ذات کے مفاد ہی کو پیش نظر رکھا جائے مکمل سیرت نہیں گردانی جا سکتی۔ سیرتِ نبوی ﷺ کا پیغام یہ ہے کہ سیرت تب سیرت بنتی ہے جب انسان اپنے ذاتی مفاد جس میں خود پسندی اور خودغرضی کا پہلو نکلتا ہے سے ماوراء ہو کر دوسروں کے مفاد اور منفعت کے بارے میں متفکر اور متردّد ہونے لگے۔ انبیائے کرام کی سیرت ان نقائص اور خامیوں سے مبرا اور پاک ہوتی ہے جو عام دنیا دار انسانوں کا طرہ امتیاز ہیں۔

آنحضور ﷺ کی عبدیت کے پہلو میں جو عروج ہے اس سے آپ ﷺ کی فوقیت وفضیلت کا ظہور ہوتا ہے اور نزول میں آپ ﷺ کی شانِ مثلیت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجئے کہ عروج میں چونکہ اللہ کی طرف جانا ہوتا ہے اور طبیعت کا

میلان اپنی ذات کی طرف زیادہ مرکوز ہوتا ہے اس لئے اس میں فضیلت وفوقیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس نزول میں چونکہ نفع رسانی کے لئے توجہ اور دھیان دوسروں پر مرتکز ہوتا ہے اس لئے مثلیت یعنی اپنے جیسے ہونے کی شان کو نکھار ملتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ذات میں تکمیلِ نبوت کے لئے یہ دونوں شانیں یکجا ومجتمع کر دی گئی ہیں اس لئے آج کے دورِ کم نہاد میں جہاں ہر کام افراط وتفریط سے عبارت ہے بہت سی غلط فہمیوں نے جنم لے لیا ہے۔

حضور ﷺ کی مثلیت وفضیلت اور غلط فہمیوں کا ازالہ

اس نکتہ کی تفہیم بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دے گی کہ جہاں عروجِ فضیلت و فوقیت اور نزولِ مثلیت کے ظہور کا آئینہ دار ہوتا ہے وہاں نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے اندر دونوں شانیں اس طرح مجتمع کر دی گئی ہیں کہ ایک کو دوسری سے جدا اور الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے آپ ﷺ کی ذات کو خلقِ خدا کے لئے مبداء ومصدرِ فیض بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اس میں فضیلت اور مثلیت کی شانیں پہلو بہ پہلو یکجا رکھ دی جائیں کہ اس طرح نبوت کا کام تکمیل کو پہنچتا ہے۔

نبی کی ذات کو دیکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اقرار اور دوسرے انکار کی آنکھ سے دیکھنے والے۔ ایک طرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف ابوجہل کی آنکھ جب پیکرِ نبوت کو دیکھتی ہے تو دونوں پر فضیلت اور مثلیت کی شانیں عیاں ہوتی ہیں۔ چاند کا دوٹکڑے ہونا نہ صرف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ، سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دوسرے غلاموں کو نظر آیا تھا بلکہ ابوجہل اور دوسرے معاندین کی آنکھیں بھی دیکھ رہی تھیں لیکن جن کے دل میں روگ تھا ان کی نگاہ کو آپ ﷺ کی مثلیت کا وہ پہلو جس کا تعلق کھانے پینے، شادی بیاہ، بازاروں میں چلنے پھرنے اور خون بہنے وغیرہ معاملات سے ہے نظر آتا تھا لیکن دوسرا ہر پہلو وہ یکسر نظر انداز کر دیتے تھے۔ مثلیت کے پہلو پر وہ اس لئے زور دیتے تھے کہ اس سے نبوت کا انکار لازم آتا تھا۔

یہ بات وضاحت سے سمجھی جانے کے لائق ہے کہ کسی چیز کا اقرار کرنا اور بات ہے اور اس سے انکار کرنا اور بات۔ جب کسی ایک جہت پر اصرار ہوتا ہے تو لامحالہ وہ دوسری جہت کے انکار کو مستلزم ہوتا ہے۔ اب نبوت کا انکار کرنے والے دبی زبان سے فضیلت و فوقیت کو مانتے تو ہیں لیکن اصرار وہ مثلیت پر ہی کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اس پر اِن الفاظ سے استشہاد کرتا ہے:

مَا نَرَاکَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلَنَا

(القرآن، ہود، ۱۱: ۲۷)

ہمیں تو تم ہمارے اپنے ہی جیسا ایک بشر دکھائی دیتے ہو۔

چونکہ مثلیت پر اصرار کرنے سے حضور ﷺ کے کمالِ نبوت کی نفی ہوتی ہے اور نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔ ابوجہل اور اس قبیل کے لوگ دبے لفظوں میں پیکرِ نبوت کی فضیلت و فوقیت کا اقرار تو کرتے ہیں مگر بہرحال ان کا اصرار آپ ﷺ کی مثلیت پر ہی ہوتا ہے، اس کے برعکس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر پروانہ ہائے جمالِ مصطفوی ﷺ، عشاق کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے حضور ﷺ کی مثلیت کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن ان کا اصرار آپ ﷺ کی فضیلت پر ہی ہے۔ وہ مثلیت کا اقرار تو اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے کرتے ہیں لیکن اصرار تمام تر آپ ﷺ کی فضیلت و فوقیت پر ہی کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں خود حضور ﷺ کی زبانِ حق ترجمان سے دونوں شانیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ

(القرآن، الکہف، ۱۸: ۱۱۰)

فرما دیجئے میں تو صرف (بخلقتِ ظاہری) بشر ہونے میں تمہاری مثل ہوں (اس کے سوا اور تمہاری مجھ سے کیا مناسبت ہے ذرا غور کرو) میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

اگر قرآنِ حکیم کی روشنی میں حضور ﷺ کی ان دونوں شانوں کا کما حقہ ادراک ہو جائے تو بہت سی الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ یہ دین جھگڑوں اور مجادلوں کا محل نہیں۔ اس سے ملتِ اسلامیہ کو پہلے بہت نقصان پہنچ چکا ہے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ اہل ایمان حضور ﷺ کی مثلیت و بشریت کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن آپ ﷺ کی فضیلت و فوقیت پر بغیر کسی ذہنی تحفظات کے اصرار کرتے ہیں کہ اس سے آپ ﷺ کا کمال نبوت متحقق ہوتا ہے۔ اوپر بیان کردہ آیہ کریمہ بغیر کسی ابہام کے یہ حقیقت بیان کر رہی ہے۔ حضور ﷺ سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اے محبوب ﷺ! لوگوں کو بتا دیجئے کہ میں نفسِ بشریت میں تمہارے جیسا تو ہوں کہ نبوت کی شانِ مثلیت کا یہی تقاضا ہے لیکن مجھ میں اور تم میں یوحی الی کا فرق ہے لہٰذا تم مجھے محض اپنے جیسا نہ سمجھ بیٹھنا۔ میری شانِ فضیلت یہ ہے کہ مجھ پر پیکرِ بشریت میں خدا کا کلام بصورتِ وحی اترتا ہے۔ میرا قلبِ اطہر اللہ کے اس کلام کا مہبط ہے جس کے متحمل پہاڑ بھی نہ ہو سکے اور جس امانت کا بوجھ کوئی فرشتہ یا اللہ کی دوسری مخلوق نہ اٹھا سکی۔

کلامِ الٰہیہ کی مثال تو پھولوں کی خوشبو کی سی ہے کہ جس کی صحبت اور ہم نشینی سے مٹی جیسی ناچیز شئے بھی مہکنے لگتی ہے۔ بقولِ سعدی شیرازیؒ مٹی زبانِ حال سے گویا ہوتی ہے:

بگفتا من گلِ ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

تو جس طرح مٹی پھولوں کی سنگت میں رہ کر معطر و معنبر ہو جاتی ہے اسی طرح کلام اللہ کی خوشبو جب پیکرِ بشریت میں رچ بس جاتی ہے تو ۲۳ سال تک اس سرمدی خوشبو سے ہم کنار رہنے سے اس کی کایا پلٹ جاتی ہے اور وہ پیکرِ بشریت اس تعلق کے نتیجے میں نورانیت سے بھی لطیف تر ہو جاتا ہے۔ وہ سب بشروں سے جدا اور متمیز ہو جاتا

ہے۔ پھر اسے عام بشر سمجھنا کم نظری اور کج فہمی کی دلیل ہے۔ اس پیکرِ بشریت کی لطافتوں کا عالم تو یہ ہو جاتا ہے کہ عالمِ بشریت تو درکنار عالمِ نورانیت کا کوئی فرد بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ جن راستوں سے گزرتا ہے انہیں معطر کرتا جاتا ہے۔ نابیناؤں کو بینائی عطا کرتا ہے، ہاتھ کے صحت بخش لمس سے بیماروں کی مسیحائی ہوتی ہے اور مردوں کو حیاتِ نو ملتی ہے۔

مثلیت اور فضیلتِ حضور ﷺ کی دو شاخیں ہیں جن میں بتقاضائے ایمان فضیلت کو برتری اور فوقیت حاصل ہے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے:

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۵۳)

یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

انبیاء و رسل میں فضیلت کی بات کرتے ہوئے قرآنِ حکیم آگے اس کی توجیہہ یوں بیان فرماتا ہے:

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۵۳)

ان میں سے کسی سے اللہ تعالیٰ نے (براہ راست) کلام فرمایا اور کسی کو درجات میں (سب پر) فوقیت دی (یعنی حضور اکرم ﷺ کو جملہ درجات میں سب پر بلندی عطا فرمائی)

محولہ بالا آیہ کریمہ میں جہاں جزوی فضیلت کا بیان ہوا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باب میں ذکر کیا گیا کہ انہیں دوسرے انبیاء کے مقابلے میں یہ فوقیت ملی کہ ان سے اللہ نے کلام کیا اور کلیم اللہ کے لقب سے معنون ہوئے وہاں آیت کے دوسرے حصے و رفع بعضھم درجات میں کلی فضیلت کا معنی بھی مذکور ہے۔

مثلیت وفضیلت کی جہتیں اور ایمان کا تقاضا

اہل ایمان کو اگر ایمان بالرسالت کا حق ادا کرنا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ حضور ﷺ کی مثلیت کو نبوت کی ایک شان سمجھ کر اس کا اقرار کریں لیکن دھیان نبوت کی شانِ فضیلت وفوقیت کی طرف ہی رہے کہ اسی سے کمالِ نبوت کی معنویت قلب و دماغ میں جاگزیں ہوسکتی ہے۔ اگر دھیان مثلیت کی طرف ہی رہا تو جان لیجئے کہ اس سے کمالِ نبوت کی نفی ہو جائے گی اور تمہارا خرمنِ ایمان غارت ہو جائے گا۔

اللہ عزوجل نے اپنے محبوب ﷺ کو یہ دو شانیں کیوں عطا فرمائی ہیں اس نکتے کی تفہیم اس مثال سے ہوسکتی ہے کہ فیض دینے اور فیض لینے والے کے درمیان ایک مناسبت اور متجانست و مماثلت کا ہونا ضروری اور لابدی ہوتا ہے۔ جس طرح پرائمری جماعت کے طلباء کو امریکہ یا لندن پلٹ، پی ایچ ڈی عالم فاضل سطح میں اتنا بڑا فرق ہونے کی بناء پر وہ فیض نہیں پہنچا سکتا جو ایک عام درجے کا استاد خواہ وہ پی ٹی سی ہی کیوں نہ ہو پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر نبی کی شان میں مثلیت کا عنصر نہ ہوتا تو ایک حد تک متجانست ومماثلت نہ ہونے کی وجہ سے مخلوق فیض حاصل نہ کرسکتی اس لئے باری تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو قاب قوسین او ادنی کے مقام پر عروج سے ہمکنار فرمایا لیکن چونکہ مقصد محض آپ ﷺ کی عظمت کو برقرار رکھنا نہ تھا بلکہ اس فیض کو عام مخلوقِ خدا تک منتقل کرنا تھا اس لئے آپ ﷺ کو نزول کا درجہ بھی عطا فرما دیا تا کہ مخلوق کی سطح کے قریب ہو کر یک گونہ مثلیت پیدا ہو جائے۔ گویا حضور ﷺ کو مثلیت کا عطا کیا جانا بندوں پر ایک قسم کا احسان تھا ورنہ عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کا مقام پوچھنا چاہتے ہو تو جان لیجئے کہ ان کا قد و قامت اتنا بلند تھا اور ہے کہ جبرائیل امین علیہ السلام ان کے قدموں کے تلوؤں کو بھی نہ چھو سکے۔ وہ تو اپنی گنہگار امت کی خاطر اس کے قریب آئے، شادیاں کیں، عیال دار ہوئے، دانت شہید کرائے اور اپنے جسمِ اطہر کو لہولہان کیا تا کہ غیریت اور بیگانگی کا احساس باقی نہ رہے اور باہمی میل ملاپ کی صورت میں فیض نبوت منتقل کیا جا سکے۔

مقامِ مصطفوی ﷺ کی وضاحت کے لئے ایک مثال

اس ضمن میں ایک مثال کے ذریعے اس نکتے کو بآسانی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی غریب آدمی اپنی حاجت لے کر کسی بڑے صاحبِ منصب شخص کے دروازے پر جاتا ہے۔ دستک دینے پر وہ شخص باہر آتا ہے، اس کا مدعا پوچھتا ہے اور کھڑے کھڑے اس کا کام نپٹا کر اسے فارغ کر دیتا ہے اور گھر کے اندر چلا جاتا ہے۔ اس غریب کے واپس جانے پر لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ تم نے اس بڑے آدمی کو کیسا پایا؟ وہ جواب دیتا ہے کہ اس نے جس مقصد کے لئے میں اس کے پاس گیا تھا پورا تو کر دیا لیکن جس انداز سے وہ مجھے ملا اس سے بڑائی، تکبر ورعونت اور نخوت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکن، گردن میں اکڑاؤ اور چہرے پر خشونت آمیز سنجیدگی تھی۔ میں دوبارہ اس کے پاس جانے سے پہلے کئی بار سوچوں گا۔

وہی غریب آدمی ایک اور صاحبِ حیثیت و مرتبہ شخص کے پاس کسی کام سے جاتا ہے اور لوگوں کے استفسار پر اس کے احوال یوں بتاتا ہے کہ اس نے اپنے طرزِ عمل اور گفتار و کردار سے میرا دل موہ لیا ہے۔ وہ مجھے انتہائی خندہ پیشانی اور تپاک سے ملا۔ مجھے عزت سے بٹھایا اور میری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے نہ صرف میرا کام کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ آئندہ جب کبھی ضرورت پڑے تو بلاتکلف قدم رنجہ فرمائیے گا۔

اس سے یہ نکتہ کھلا کہ اصل بڑائی تواضع اور جھک کر ملنے میں ہے۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ کائنات کی عظیم ترین ہستی ہونے کے باوصف جب عامیوں سے جھک کر ملتے ہیں تو سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ان کا کرم اور ان کی محبت و رافت ہے ورنہ وہ ذات تو

بعد اَز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کی مصداق ہے۔

باب دوم

فلسفہ نماز

جزوِ اوّل

نماز کی فرضیت و اہمیت

نماز اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اسلامی نظام العبادات میں اس کی حیثیت و اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں کم و بیش سات سو مقامات پر اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر ہوا ہے جن میں سے اَسّی (۸۰) مقامات پر صریح حکم وارد ہوا ہے۔

اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شہادتِ توحید و رسالت کے بعد جس فریضے کی بجا آوری کا حکم قرآن و سنت میں بہ نصِ قطعی تاکید کے ساتھ آیا ہے وہ نماز ہی ہے۔

حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله و اقام الصلوة و ایتاء الزکوة و حج البیت و صوم رمضان

(بخاری، الصحیح، ۱:۱ ۶)

(خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۲)

اسلام کی بناء پانچ ارکان پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج بیت اللہ کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

کفر و ایمان کے درمیان نماز ہی حدِ فاصل ہے

نماز وہ امتیازی عمل ہے جو ایک مومن کو کافر سے ممتاز کرتا ہے۔ قرآن و سنت

کی تعلیمات بصراحت اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ فریضہ نماز کی بجا آوری دین کی تعمیر اور اس کا ترک کر دینا دین کی بربادی اور انہدام کا موجب ہے۔ حضور ﷺ کے متعدد ارشادات سے (جن کا ذکر آگے آئے گا) یہ بات ثابت و متحقق ہے کہ کفر و ایمان کے مابین نماز ہی حدِ فاصل کا درجہ رکھتی ہے۔

صلوٰۃ کا لغوی مفہوم

نماز کی فرضیت و اہمیت کے مفصل بیان سے پہلے مناسب ہو گا کہ لغوی اعتبار سے لفظ **صلوٰۃ** کے معنی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

لفظِ **صلوٰۃ** عربی لغت میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن محاورہ عرب کی رو سے وہ معنی جو اصطلاح سے قریب تر ہے ذکر و انقیاد اور دعا و عبادت کا ہے۔ اس اعتبار سے ذاتِ باری تعالیٰ کی بارگاہِ صمدیت میں اس کے بے پایاں جود و کرم اور فضل و رحمت کے لئے کمال خشوع و خضوع کے ساتھ سراپا طلب و التجا بنے رہنے اور اس کے حقِ بندگی کو بجا لانے کو صلوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو کائناتِ ارضی و سماوی کی ہر مخلوق اپنے اپنے حسبِ حال بارگاہ خداوندی میں صلوٰۃ اور تسبیح و تحمید میں مصروف نظر آتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط

(القرآن، النور، ۲۴: ۴۱)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ (سب) اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں اور پرندے (بھی فضاؤں میں) پر پھیلائے ہوئے (اس کی تسبیح کرتے ہیں) ہر ایک (اللہ کے حضور) اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے۔

عملِ صلوٰۃ میں خالق و مخلوق کا باہمی تعلق

صلوٰۃ ایک ایسا امتیازی عمل ہے جس میں ذاتِ خداوندی اپنی صفت خالقیت کے

باوصف مخلوق کے ساتھ شریک ہے لیکن خالق ومخلوق کی صلوۃ میں بہرحال یہ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جہاں مخلوق کی صلوۃ اپنی شکستہ حالی اور کسمپرسی کے مداوا کے لئے اللہ رب العزت کے حضور رحمت جوئی اور درماں طلبی سے عبارت ہے وہاں خالق کی صلوۃ اپنے ناتواں اور عاجز و درماندہ بندوں پر اپنی بے پایاں رحمتوں کے خزانے نچھاور کرنے اور فضل وکرم کی راہوں کو نور دانِ حق کے لئے کشادہ کر دینے کا مژدہ جانفزا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

(القرآن، الاحزاب،۳۳: ۵۶)

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (یعنی جان بوجھ کر عبادت کے طور پر درود وسلام بھیجا کرو)۔

واقعہ معراج کے باب میں امام عبدالوہاب شعرانیؒ ایک حدیث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ عرشِ معلیٰ اور سدرۃ المنتہیٰ سے ماوراء سرِ لامکاں اس مقام پر جلوہ گر ہوئے جہاں ذاتِ خداوندی اپنے انوار و تجلیات اور صفات کی شان مظہریت کے ساتھ جلوہ فگن تھی تو معاً ایک سمع نواز صدا سنائی دی۔ کوئی انتہائی شیریں اور دلآویز لہجے میں کہہ رہا تھا:

قف یا محمد ان ربک یصلی

(عبدالوہاب شعرانی، الیواقیت والجواہر،۲: ۳۵)

اے محمد ﷺ! ٹھہر جایئے آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ پر صلوٰۃ بھیج رہا ہے۔

بعض علماء ومحدثین اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ عالمِ لامکان کی بلندیوں اور رفعتوں کو طے کرتے ہوئے عروج کے اس مقام پر پہنچے جو انوار و

تجلیاتِ خداوندی کا براہِ راست مرکز ہے تو یہ وہ استقبالیہ کلمات تھے جن سے خدا کی ذات، کمال اندازِ دلربائی سے اپنے حبیب ﷺ کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ گویا خدا تعالیٰ کے درود پڑھنے کو صلوۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس حدیثِ قدسی کے اندازِ بیاں سے کمال درجہ اندازِ دلربائی کے ساتھ یہ مفہوم مترشح ہو رہا ہے کہ ''اے میرے محبوب ﷺ! ذرا ٹھہر جایئے تا کہ میں درود پڑھ کر آپ کا استقبال کروں''۔

خدا کی صلوٰۃ اس کی ذات کے مناسبِ حال اور اس کی شان کے شایان ہے جبکہ فرشتوں اور انسانوں کا عملِ صلوٰۃ ان کے جداگانہ اَحوال کی مناسبت سے ہے۔ پس صلوٰۃ ایک ایسا منفرد عمل ہے جس میں خالق کی اپنی مخلوق کے ساتھ شرکت جاری ہے۔ قطع نظر اس سے کہ خالق اور مخلوق کی صلوٰۃ میں بے شمار امتیازات ہیں۔

صلوٰۃ، توحید و رسالت پر ایمان کا معیار ہے

یہ بات ذہن نشین رہے کہ توحید و رسالت کی شہادت اور اس کی عملی تصدیق کا پہلا قدم نماز ہی ہے۔ توحید و رسالت کی شہادت کا اقرار زبانی شہادت فراہم کرنے سے ہوتا ہے جبکہ اس کی عملی تصدیق و توثیق نماز کے ذریعے ہی متحقق ہوتی ہے۔ اس طرح عملِ نماز انسان کو ایمان کے اعلیٰ مدارج کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ نے نماز کی اسی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لا ايمان لمن لا صلوة له و لا صلاة لمن لا وضوء له

(ازدی، الجامع الصحیح مسند الامام الربیع، ۱:۵۴، رقم: ۹۱)

''جس شخص کی نماز نہیں اس کا ایمان نہیں اور اسی طرح جس شخص کا وضو نہیں اس کی نماز بھی نہیں۔''

مذکورہ بالا ارشادِ مصطفوی ﷺ کی رو سے خدا کی الوہیت اور جملہ انبیائے کرام کی رسالت پر ایمان کا انحصار اس عملی شہادت پر ہے جو انسان احکامِ خداوندی کی بجا آوری میں نماز ادا کرنے سے فراہم کرتا ہے۔ لاریب اسی عمل کی مداومت پر ہی اس کے دعویٰ

ایمان کی صداقت کا دارومدار ہے۔ اگر اسی عمل میں کوتاہی واقع ہوگئی اور کسی نے ترکِ نماز کو اپنا شعار بنا لیا تو گویا اس نے اپنے عمل سے اپنے دعویٰ ایمان کی نفی وتکذیب کر دی۔ بنا بریں تارکِ صلوٰۃ کا ایمان بارگاہِ رب العزت میں نامقبول اور غیر معتبر ٹھہرتا ہے۔ حضور ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے:

بین الرجل و بین الشرک و الکفر ترک الصلوۃ

(مسلم، الصحیح، ۱:۸۸، رقم:۸۲)

''آدمی اور شرک وکفر کے درمیان حدِ فاصل نماز ہی ہے۔''

ایک اور مقام پر یہی بات ان اَلفاظ کے ساتھ ارشاد فرمائی گئی ہے:

لیس بین العبد و بین الکفر الا ترک الصلوۃ

(نسائی، السنن، ۱:۲۳۲، رقم:۴۶۴)

''بندے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑنے کا فاصلہ ہے۔''

کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ عامۃ المسلمین نے نماز کو محض ایک رسم (Ritual) کا درجہ دے کر اس سے پہلوتہی کو اپنا شعار بنایا ہوا ہے اور وہ اس کے حقیقی تقاضوں کو بجا لانے میں ذرہ بھر متردّد اور متفکر نہیں ہوتے۔

عمداً ترکِ صلوٰۃ کفر ہے

نبی اکرم ﷺ نے صریحاً نماز ہی کو مسلمان اور کافر کے درمیان فارق ومتمیّز قرار دیا ہے:

من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر

(طبرانی، المعجم الاوسط، ۳:۳۴۳)

''جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی اس نے (گویا) کھلا کفر کیا۔''

ایک اور مقام پر اسی مفہوم کی توضیح اس طرح فرمائی گئی ہے:

العهد الذی بیننا و بینهم الصلوة فمن ترکھا فقد کفر

(نسائی، السنن، ۱: ۲۳۱، رقم: ۴۶۳)

''ہمارے اور ان کے درمیان جو عہد ہے وہ نماز ہے پس جس نے نماز کو ترک کیا (گویا) اس نے کفر کیا (عہد سے منہ موڑ لیا)۔''

ان ارشاداتِ گرامی سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو شخص دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اس عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نماز ترک کر دیتا ہے وہ خدا اور رسول کے ہاں اپنے دعویٰ ایمان میں اس بناء پر کاذب ٹھہرتا ہے کہ کافر تو سرے سے کسی ایسے عہد کا مکلّف اور مومن ہونے کا دعویدار ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس توحید و رسالت پر ایمان لانے کا مدعی اگر بالفعل اپنے اس عہد پر کاربند نہ رہا جو اس نے ایمان کا اقرار کرتے ہوئے کیا تھا اور عملاً وہ اس عہد سے منحرف ہو گیا تو گویا اس نے اپنے عمل سے ہی اپنے دعویٰ کی تکذیب کر دی اور اس بناء پر شارعِ اسلام کے نزدیک وہ بمنزلہ کافر کے ہے۔ اس سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ شہادتِ توحید و رسالت کی عملی توثیق و تصدیق نماز کے ذریعے ہی متحقق ہوتی ہے اور ترکِ نماز اسلام کی کھلم کھلا تکذیب اور کفر کے مترادف ہے۔

نماز دین کے لئے بمنزلہ ستون کے ہے جیسا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لکل شئ عمود و عمود الدین الصلوة و عمود الصلوة الخشوع و خیرکم عند اللہ اتقکم

(الأزدی، الجامع الصحیح، مسند الامام الربیع، ۱: ۱۲۰، رقم: ۲۸۵)

''ہر شئے (عمارت) کے کچھ ستون ہوتے ہیں دین کا ستون نماز ہے جبکہ نماز کا ستون خشوع و خضوع ہے اور تم میں سے اللہ کے ہاں بہتر وہ ہے جو متقی ہے۔''

نماز ہر نبی کی شریعت کا جزوِ لاینفک رہی ہے

ارکانِ اسلام میں سے یہ خصوصیت و امتیاز صرف نماز ہی کو حاصل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیائے کرام کے ادوار میں ہر امت اور ہر ملت پر یہ یکساں طور پر فرض رہی ہے اور سلسلہ انبیاء کا کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں گزرا جس کی شریعت میں نماز کو قطعیت کے ساتھ فرضیت کا درجہ حاصل نہ رہا ہو۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ شریعتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں بہت سے امور ایسے ہیں جنہیں تخصیص کے ساتھ امتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض کیا گیا جبکہ پہلے انبیاء کی شریعتوں میں یہ فرض نہیں تھے۔ اسی طرح متعدد چیزیں پہلی شریعتوں میں فرض تھیں جنہیں شریعتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منسوخ کر دیا لیکن نماز اپنی منفرد حیثیت میں ہر رسول اور ہر نبی کی تعلیمات کا لازمی جزو رہی ہے اور کسی بھی زمانے میں کوئی ایسا نبی مبعوث نہیں کیا گیا جس نے اپنی شریعت میں نماز کو برقرار نہ رکھا ہو۔ چنانچہ ترکِ نماز یا نماز کے عدم وجوب کا کوئی تصور کسی بھی سابقہ شریعت میں موجود نہیں۔ نماز زمانی و مکانی اعتبار سے نظام العبادات کا جزوِ لاینفک رہی ہے چنانچہ ہر برگزیدہ نبی اعلیٰ مقامات پر فائز ہونے اور قرب و وصال کی نعمتوں سے سرفراز ہونے کے باوجود بارگاہِ خداوندی میں نماز کے ثمرات اور فیوض سے متمتع ہونے کا زیادہ سے زیادہ خواہاں اور متمنی نظر آتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ ایزدی میں عرض پرداز ہوتے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ

(القرآن، ابراہیم، ۱۴: ۴۰)

”اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم رکھنے والا بنا دے۔ اے ہمارے رب! اور تو میری دعا قبول فرما لے۔“

قرآنِ حکیم نے حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم کی مخاصمت و عناد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

قَالُوۡا یٰا شُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَأۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَاؤُنَا

(القرآن، ھود، ۱۱: ۸۷)

’’وہ بولے اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں یہی حکم دیتی ہے کہ ہم ان (معبودوں) کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں۔‘‘

اس سے مترشح ہوا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا شعارِ حیات بھی نماز تھی۔ ایک اور مقام پر قرآنِ حکیم میں مذکور ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَ اۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ انۡہَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَا اَصَابَکَ

(القرآن، لقمان، ۳۱: ۱۷)

’’اے میرے بیٹے! نماز قائم رکھ (خود بھی اللہ کی بندگی کا پابند رہ) اور دوسروں کو بھی اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور برے کام سے منع کیا کر اور جو مصیبت تجھ کو پہنچے اس پر صبر کر۔‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا جانے والا نماز کا حکم قرآن حکیم میں بایں الفاظ مذکور ہے

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ

(القرآن، طٰہٰ، ۲۰: ۱۴)

’’اور میری یاد کی خاطر نماز قائم کیا کرو۔‘‘

اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کی تخصیص

قرآنِ حکیم میں جن مقامات پر ادائیگی نماز کا حکم وارد ہوا ہے وہاں اکثر و بیشتر نماز کی تلقین واقیموا الصلوۃ (اور نماز قائم کرو) کے کلمات سے کی گئی ہے۔ یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے میں کونسا بنیادی فرق ہے کہ

قرآن صرف نماز پڑھنے کے حکم پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ بالتاکید نماز قائم کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔ اس کے پس پردہ کارفرما حکمت یہ ہے کہ اگر نماز پڑھنے کا حکم ہوتا تو زندگی بھر کے لئے ایک آدھ بار نماز کا ادا کر لینا ہی کافی ہوتا لیکن قرآنِ مجید میں متعدد حکمتوں کی بناء پر نماز قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے؟

قرآنِ حکیم میں جو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے وہ بے شمار حکمتوں کا حامل ہونے کی بناء پر متعدد مفاہیم پر دلالت کرتا ہے۔

اولاً اقامتِ صلوٰۃ کے حکم میں مداومت کا پہلو مضمر ہے جس کا معنی یہ ہے کہ نماز اس طرح ادا کی جائے کہ اسے ترک کرنے کا تصور بھی باقی نہ رہے۔ قرآن اسے ’’محافظت علی الصلوۃ‘‘ سے تعبیر کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۳۸)

’’سب نمازوں کی محافظت کیا کرو اور بالخصوص درمیانی نماز کی اور اللہ کے حضور سراپا ادب و نیاز بن کر قیام کیا کرو۔‘‘

ثانیاً اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کا معنی یہ ہے کہ نماز کو تمام تر ظاہری اور باطنی آداب ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کیا جائے یعنی اسے محض رسماً نہیں بلکہ جملہ تقاضوں کو لفظاً اور معناً ملحوظ رکھتے ہوئے بطریق احسن بجا لایا جائے تاکہ اس کی روح بہمہ حال اس کے اندر جاری و ساری رہے۔ باطنی آداب کے بغیر نماز کا فرضیت کی حد تک تو ادا ہو جانا ممکن ہے لیکن اس کے مطلوبہ اثرات انسانی زندگی پر مترتب نہیں ہو پاتے۔

ثالثاً نماز قائم کرنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ پورے اسلامی معاشرے میں نظامِ صلوٰۃ برپا کیا جائے اور اس کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے کو ایسے ہمہ گیر

انقلاب سے آشنا کیا جائے کہ معاشرے کی ہمہ جہت ترقی اصلاحِ احوال اور فلاحِ دارین کے امکانات پیدا ہوتے رہیں۔

نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کے بارے میں قرآنی حکم

قرآنِ مجید میں باری تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے حکمرانوں اور صاحبانِ اختیار و اقتدار کے فرائضِ منصبی گنواتے ہوئے سب سے پہلا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ کے حکماً نفاذ کا ذکر کیا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

(القرآن، الحج، ۲۲: ۴۱)

''(یہ اہلِ حق) وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں اقتدار دے دیں (تو) وہ نماز (کا نظام) قائم کریں اور زکوٰۃ کی ادائیگی (کا انتظام) کریں اور (پورے معاشرے میں نیکی اور) بھلائی کا حکم دیں اور (لوگوں کو) برائی سے روک دیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

اسلامی حکومت پر اقامتِ صلوٰۃ کے بعد ہی دیگر فرائض عائد کئے گئے ہیں جن میں ایتائے زکوٰۃ اور اوامر ونواہی کی پابندی کے احکام خاص طور پر مذکور ہیں۔

ایک اور مقام پر قرآنِ حکیم میں اللہ رب العزت نے اپنے ایک برگزیدہ پیغمبر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا

(القرآن، مریم، ۱۹: ۵۵)

''اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے رب کے

حضور مقام مرضیہ پر (فائز) تھے۔‘‘

اس سے یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ فریضہ نماز کی بجا آوری کا حکم صرف لازم ہی نہیں بلکہ متعدی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی انسان خود نماز پڑھ لینے کے مجرد عمل سے اس فریضے کی بجا آوری سے سبکدوش نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لئے لازم اور لابدی ٹھہرایا گیا کہ وہ اپنے اہل و عیال، متوسلین اور ان سب کو جن کی پرورش اور کفالت کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے نماز ادا کرنے کا حکم دے اور اس کی طرف راغب کرتا رہے۔ اس ضمن میں جملہ اہل ایمان کو عمومیت کے ساتھ متنبہ فرمایا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا

(القرآن، التحریم، ٦٦: ٦)

’’اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ۔‘‘

ہر راعی اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے

اسلامی معاشرے میں ہر فرد کی حیثیت اپنی جگہ راعی کی ہے اور اس کے وابستگان و متوسلین بمنزلہ رعیت کے ہیں۔ ہر راعی کو اپنے اپنے دائرہ اختیار کے اندر رعیت کے معاملے میں جوابدہ ٹھہرایا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته فالامام الذی علی الناس راع و هو مسئول عن رعیتهٖ و الرجل راع علی اهل بیته وهو مسئول عن رعیتهٖ والمراة راعیة علی بیت زوجها و ولده وهی مسئولة عنهم و عبدالرجل راعٍ علی مال سیده وهو مسئول عنه

(مسلم، الصحیح، ۳: ۱۴۵۹، رقم: ۱۸۲۹)

’’خبردار! تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ پس امام جو لوگوں پر حاکم ہے اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے۔ اس سے اس کے ماتحت افراد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہے۔ اس سے ان کے بارے پوچھا جائے گا اور آدمی کا غلام اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔‘‘

حقیقی نماز کی خصوصیت

اقامتِ صلوٰۃ کے بیان کردہ مفاہیم میں یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ حقیقی نماز وہی ہے جو انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر دے اور اس کے اثرات اس کی سیرت و کردار اور شخصیت پر اس طرح مترتب ہوں کہ زندگی کے کسی بھی گوشے میں برائی اور بے حیائی کا شائبہ تک نہ رہے۔ قرآنِ حکیم نے منجملہ دیگر خصوصیات کے نماز کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بیان کی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْکَرِ

(القرآن، العنکبوت، ۲۹: ۴۵)

’’بے شک نماز (لوگوں کو) بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔‘‘

یقینی امر ہے کہ زندگی میں اس نتیجہ خیزی کی ضامن وہی نماز ہوسکتی ہے جس کی اقامت کا اہتمام ایک باقاعدہ اور مربوط نظام کے تحت عمل میں آیا ہو۔

ذکرِ الٰہی کی بہترین صورت نماز ہی ہے

خدا کی یاد اور اس کے ذکر میں مشغول رہنے کی یوں تو بے شمار صورتیں ہوسکتی ہیں لیکن نماز ذکرِ الٰہی کی بہترین اور سب سے اعلیٰ صورت ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں اس

سے بڑھ کر خدا کی یاد کا اور کوئی تصور نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پر یوں تو ہر نبی کو نماز کا حکم فرداً فرداً دیا گیا تاہم من حیث المجموع تمام انبیائے کرام کو عمومی طور پر نماز کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا گیا:

وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ وَ كَانُوا لَنَا عَابِدِيْنَ○

(القرآن، الانبیاء، ۲۱: ۷۳)

”اور ہم نے ان کی طرف اعمال خیر اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے (کے احکام) کی وحی بھیجی اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔“

متذکرہ بالا قرآنی ارشادات سے یہ بات بغیر کسی شک وشبہ اور ابہام کے حتمی طور پر طے ہوگئی کہ تمام شرائع سابقہ اور شریعتِ محمدیہ ﷺ میں نماز کا حکم بطور جزوِ اعظم کے ہمیشہ موجود رہا ہے اور موجود ہے اور اسی بناء پر ترکِ نماز کا عمل کفر کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

نماز برائیوں کا کفارہ اور صغائر سے بچنے کا مؤثر ترین ذریعہ

آنحضرت ﷺ نے نماز کے فضائل و محامد کو بیان کرتے ہوئے اسے برائیوں اور صغیرہ گناہوں سے رہائی حاصل کرنے کا انتہائی موثر ذریعہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم پر نماز کی افادیت ایک بلیغ تمثیل کے ذریعے واضح کر دی جسے حدیثِ مبارکہ کے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اَرَاَيْتُمْ لَوْ اَنَّ نَهْرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا مَا تَقُوْلُ ذٰلِکَ يُبْقِيُ مِنْ دَرَنِهٖ قَالُوْا لَا يُبْقِيُ مِنْ دَرَنِهٖ شَيْئًا قَالَ فَذَالِکَ مِثْلُ الصَّلَوَاتِ الْخُمْسِ يَمْحُوا اللّٰهُ بِهَا الْخَطَايَا

(بخاری، الصحیح، ۱: ۱۹۷، رقم: ۵۰۵)

(مسلم، الصحیح، ۱: ۴۶۲، رقم: ٦٦٧)

’’کیا تم دیکھتے ہو کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے کے سامنے نہر (بہہ رہی) ہو جن میں وہ ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرے تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل کچیل باقی رہ جائے گی انہوں نے عرض کیا اس پر کچھ میل باقی نہ رہے گی آپ ﷺ نے فرمایا یہی پانچ نمازوں کی مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔‘‘

قرآنِ حکیم میں اسی مضمون کو صراحت کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَی النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ

(القرآن، ھود، ۱۱: ۱۱۴)

’’اور آپ دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کیجئے بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔‘‘

نماز کی بدولت نیکیوں کا گناہوں کا کفارہ بن جانا اور باطن کے آئینے کا ہر قسم کی آلودگی اور کثافت سے پاک ہو جانا آنحضور ﷺ کے اس ارشادِ گرامی سے الم نشرح ہو رہا ہے:

الصلوات الخمس و الجمعة الی الجمعة و رمضان الی رمضان مکفرات لما بينهن اذا اجتنبت الکبائر

(مسلم، الصحیح، ۱: ۲۰۹، رقم: ۲۳۳)

’’پانچ نمازیں، ایک جمعہ سے دوسرا جمعہ، ایک ماہِ رمضان سے دوسرا ماہِ رمضان اگر کبیرہ گناہوں سے بچا جائے تو یہ تمام اپنے درمیانی اوقات میں سرزد ہونے والے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔‘‘

انسان بلاشبہ خطا کا پتلا ہے۔ نفسانی جبلی خواہشات کے زیرِ اثر وہ نہ جانے شب و روز کتنی چھوٹی چھوٹی برائیوں اور صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ آنحضرت ﷺ

نے اپنے اُمتیوں کو یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ اگر وہ کبائر سے بچے رہیں تو دن میں ادا کردہ پنجگانہ نمازیں انہیں صغیرہ گناہوں کی آلودگی سے پاک و صاف رکھیں گی۔

مختلف اوقات کی نمازوں کی فضیلت و خصوصیت

حضور ﷺ نے مختلف مقامات پر فرداً فرداً پنج وقتہ نمازوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

فجر و عشاء کی دو نمازوں کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ صَلَّی الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ

(بخاری، الصحیح، ۱: ۲۱۰، رقم: ۵۴۸)
(مسلم، الصحیح، ۱: ۴۴۰، رقم: ٦۳۵)

وہ شخص جس نے ٹھنڈے وقت کی دو نمازیں ادا کیں وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

ان دو نمازوں کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ فجر کے وقت انسان پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ ہوا کے خوشگوار اور خواب آور جھونکے اسے تھپکیاں دے دے کر خوابِ شیریں کی آغوش میں لے جاتے ہیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند کے مزے لینے لگتا ہے۔ ان لمحات میں نیند سے بیداری نفس انسان پر بہت شاق گزرتی ہے اور شیطان ہر حربے سے اسے غفلت کی نیند میں پڑا رہنے پر اکساتا رہتا ہے۔ ایک بندۂ خدا میٹھی نیند اور آرام کو تج کر کے بستر سے نماز کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو شیطان کی ساری محنت اکارت جاتی ہے۔

دوسرا عشاء کا وقت ہے جب انسان سارے دن کی تھکن سے چور کھانا کھاتے ہی بستر راحت پر دراز ہونا چاہتا ہے اور شیطان گوناگوں حیلوں بہانوں سے اسے عشاء کی نماز پڑھنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بندۂ خدا نفسانی خواہشات اور شیطانی کے تزویراتی حربوں کے باوجود دن بھر کی تھکان اور کسلمندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں نماز کے لئے حاضر ہو کر شیطان کے سارے عزائم خاک میں ملا دیتا ہے۔

آنحضور ﷺ کا ان دو اوقات کے عبادت گزار بندوں کو جنت کی بشارت دینا اس حکمت کی بناء پر ہے کہ جو شخص فجر اور عشاء کی نمازوں کی ادائیگی کو اپنا معمول بنا لیتا ہے اس کے لئے باقی تین نمازوں کو ادا کرنا گراں نہیں ہوتا بلکہ ان کی پابندی اس پر نسبتاً سہل اور آسان ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ان دو نمازوں سے پہلو تہی کرنے والوں کو آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشادِ مبارک میں منافقین گردانا ہے۔

لَيۡسَ صَلٰوةٌ أَثْقَلُ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ مِنَ الْفَجْرِ وَ الْعِشَاءِ

(بخاری، الصحیح، ۱: ۲۳۴، رقم: ۶۲۶)

’’منافقوں پر فجر اور عشاء کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز بھاری نہیں۔‘‘

یہ ارشادِ نبوی ﷺ ہمیں خود احتسابی اور محاسبہ نفس کی دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ کہیں ہم ان دو نمازوں کی ادائیگی میں تساہل اور غفلت کی بناء پر اپنا شمار منافقوں کے زمرے میں تو نہیں کرا رہے اس لئے کہ جو ان دو نمازوں کی پابندی کو اپنا شعار بنا لے گا۔ وہ زندگی بھر کبھی نفاق کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ قرآنِ حکیم نمازوں میں غفلت اور سستی برتنے والوں کو بھی منافق قرار دیتا ہے اس لئے کہ ظاہراً نماز تو منافق بھی پڑھتے ہیں مگر ان کا دل نماز میں نہیں لگتا اور وہ اسے اس طرح ادا کرتے ہیں گویا بادلِ نخواستہ بوجھ کے نیچے دبے جا رہے ہوں۔

اس تمام تر گفتگو کا خلاصہ اور لبِ لباب یہ ہے کہ جہاں ترکِ نماز انسان کو ایمان کے دائرے سے نکال کر کفر کی سرحد تک لے جانے کا موجب ہے وہاں نماز میں تغافل وتساہل اسے حالتِ ایمان سے خارج کر کے منافقت کی حدود میں داخل کر دیتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں غارت گرِ ایمان ہیں۔

منافقین کی نماز کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى

(القرآن، النساء، ۴: ۱۴۲)

”اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔“

تساہل، غفلت اور سستی کے باعث نماز میں خشوع وخضوع کا فقدان بندے کے دل کو ربِ کعبہ کی عبادت میں مگن نہیں رہنے دیتا۔ نتیجتاً اسے وہ لذت وحلاوت اور استغراق وانہماک کی ایک گونہ کیفیت نصیب نہیں ہوتی اور اس کی نماز بے حضور رہتی ہے۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ ایسی نام نہاد نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اس کے اندر سے سیاہ رنگ کی کوئی چیز بددعا کرتی ہوئی باہر نکلتی ہے کہ اے بندے جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا ہے خدا تجھے بھی اس طرح ضائع کرے۔

نمازِ عصر کی فضیلت کے باب میں حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشادِ مبارک لائق صد اعتناء وتوجہ ہے:

مَنْ تَرَکَ صَلٰوةِ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ

(بخاری، الصحیح، ۱: ۲۰۳، رقم: ۵۲۷)
(نسائی، السنن، ۱: ۲۳۶، رقم: ۴۷۴)

”سب نمازوں کی محافظت کیا کرو اور بالخصوص درمیانی نماز کی۔“

قرآنِ حکیم میں اس نمازِ (عصر) کی محافظت کی تلقین بایں الفاظ وارد ہوئی ہے:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۳۸)

”سب نمازوں کی محافظت کیا کرو اور بالخصوص درمیانی نماز کی۔“

آنحضور ﷺ کے درج ذیل ارشادِ مبارک میں فجر اور عصر کی نمازوں کو پابندی کے ساتھ ادا کرنے والوں کو نارِ دوزخ سے رہائی کی بشارت عطا فرمائی گئی ہے۔

لن یلج النار احد صلی قبل طلوع الشمس و قبل غروبها یعنی

الفجر و العصر

(مسلم، الصحیح، ۱: ۴۴۰، رقم: ۶۳۴)

''جس نے سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور اس کے غروب ہونے سے قبل یعنی فجر اور عصر کی نماز ادا کی وہ ہرگز آگ (دوزخ) میں داخل نہ ہوگا۔''

نام نہاد مبلغین و واعظین اور نماز

باوجود اس امر کے کہ قرآن و سنت میں نماز کی پابندی کی بار بار تلقین اور اس کے ترک و تساہل پر کڑی وعید سنائی گئی ہے۔ یہ صورتحال انتہائی افسوسناک ہے کہ الا ماشاء اللہ ہمارے مبلغین و واعظین کا طرزِ عمل دین حق کی سربلندی اور اسلامی تعلیمات کے اِحیاء کے تمام تر بلند بانگ دعووں کے باوصف نماز کے بارے میں پہلوتہی اور غفلت و تساہل کا آئینہ دار ہے۔ ان کا حال آنحضور ﷺ کے بیان فرمودہ واقعاتِ معراج میں ان لوگوں کا مصداق ہے جن کے بارے میں حدیثِ مبارکہ میں یوں ارشاد ہوا ہے۔

عن انس ان رسول اللہ ﷺ قال رایت لیلة إسری بي مررت برجال تقرض شفاههم بمقاریض من نار قلت من هؤلاء یا جبرائیل قال هؤلاء خطباء من امتک یامرون الناس بالبر و ینسون انفسهم

(احمد بن حنبل، المسند، ۳: ۲۳۱، رقم: ۱۳۴۴۵)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شبِ معراج کچھ لوگوں کو دیکھا جن کی زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا اے جبرائیل یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ آپ کی امت کے وہ خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے اور اپنے آپ کو نظرانداز کرتے ہیں۔''

اسی سلسلے کی ایک اور روایت میں ان نام نہاد خطیبوں اور مبلغوں کا پول یوں کھولا گیا ہے:

خطباء من امتک الذین یقولون ما لایفعلون و یقرؤن کتاب اللہ ولا یعملون

(خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۳۸)

''یہ آپ ﷺ کی امت کے وہ خطیب ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ نہیں کرتے۔ وہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔''

عالمِ اُخروی میں تارکینِ نماز کی رُوسیاہی اور کڑا مواخذہ

ترکِ نماز ایسا سنگین جرم ہے جس کا مرتکب عالمِ آخرت میں رُو سیاہ اٹھایا جائے گا۔ ایک روایت میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں ایک شخص مر گیا۔ اس کو لحد میں اتارتے وقت لوگوں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ مسخ ہو کر سیاہ خنزیر کی صورت اختیار کر گیا۔ حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اس شخص کے لواحقین سے پوچھا کیا وہ نماز پڑھتا تھا؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے ایسے بے نمازی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

یبعث اللہ یوم القیامۃ مثل الخنزیر الاسود

''قیامت کے دن اللہ اسے کالے خنزیر کی صورت میں اٹھائے گا۔''

بے نماز شخص ایسا بدبخت ہے کہ حضور ﷺ اسے اپنا امتی تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ جب قیامت کے دن میزانِ عمل برپا ہو گی اور لوگوں کو حساب و کتاب کے لئے بلایا جائے گا تو سب سے پہلا سوال نماز ہی کی بابت کیا جائے گا۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اَوّلین پُرسشِ نماز بود

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

اوّل ما یحاسب به العبد یوم القیامة من عمل صلواته فان صلحت فقد افلح و انجح فان فسدت فقد خاب و خسر

(ترمذی، الجامع الصحیح، ۲: ۲۶۹، رقم: ۴۱۳)
(نسائی، السنن، ۱: ۲۳۲، رقم: ۴۶۵

''قیامت کے روز بندے سے سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز کے عمل کے بارے میں ہے۔ پس اگر وہ درست پایا گیا تو وہ فلاح ونجات پا جائے گا اور اگر اس میں بگاڑ پایا گیا تو وہ بندہ خاسر و نامراد ہوگا۔''

آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کی رو سے اگر قیامت کے دن کسی بندے کے حساب و کتاب میں نماز کا معاملہ درست نکلا تو اس کے باقی اعمال کے بارے میں جن کا تعلق زندگی کے دوسرے معاملات سے ہے زیادہ سختی نہیں کی جائے گی لیکن اگر اعمال کی بسم اللہ ہی غلط نکلی تو اس کا کوئی عمل معتبر نہیں سمجھا جائے گا۔

ایک مغالطے کا ازالہ

اس سلسلے میں کم علمی اور جہالت کی بناء پر بعض لوگوں کے ذہن میں نماز کی فرضیت و اہمیت کے بارے میں جو عام مغالطہ پایا جاتا ہے اس کا ازالہ مقصود ہے۔ بعض جاہل کم پڑھے اور عاقبت نااندیش لوگ اپنے زعم میں صاحبِ طریقت ونسبت اور اللہ کا ولی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ نہ خود اپنے لئے اور نہ ہی اپنے مریدین ومتوسلین کے لئے فریضہ نماز کی بجا آوری کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ شیطان کے بہکاوے میں آ کر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ طریقت و معرفت کے جس مقام پر وہ فائز ہیں وہاں نماز کی پابندی ضروری نہیں۔ چنانچہ ان کے مرید بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فریضہ نماز کی ادائیگی سے پہلوتہی کو اپنا شعار بنا بیٹھتے ہیں۔ جان لیجئے کہ طریقت ومعرفت کے یہ نام نہاد دعویدار اپنے دعوؤں میں سراسر جھوٹے اور فریبی ہیں اور وہ

صریحاً قرآن وسنت کے احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ شریعت وطریقت کا کوئی مقام ترکِ نماز سے حاصل نہیں ہوسکتا خواہ ایسا دعویٰ کرنے والا فضا میں پرندوں کی طرح اڑنے لگے اور اس سے کتنے ہی خارق العادت افعال کیوں نہ صادر ہونے لگیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ صاحبِ ہوش تارکِ نماز خدا اور رسول ﷺ کا باغی اور شیطان کا ساتھی ہے۔ وہ طریقت کے کسی مقام کو تو درکنار اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

یہاں حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک مشہور واقعہ کا اعادہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ ایک دفعہ مراقبے کی حالت میں تھے کہ ان کے چاروں طرف ایک نور کا ہالہ چمک اٹھا اور اس میں سے آواز آئی ''اے عبدالقادر! تو نے میری اس قدر عبادت کی ہے کہ میں تجھ سے فریضۂ نماز ساقط کرتا ہوں''۔ آپؒ نے یہ سن کر **لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** پڑھا۔ جس کے پڑھتے ہی شیطانی پَرتو زائل ہوگیا اور شیطان انسانی شکل میں یہ کہتے ہوئے ظاہر ہوا کہ ''میں نے اِس طرح بڑے بڑے پارسا لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ اے عبدالقادر! تو اپنے علم کی وجہ سے بچ گیا''۔ آپ نے پھر ''**لاَحَوْل**'' پڑھی اور فرمایا ''اے ظالم! اپنے علم کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے رب کے فضل وکرم کے باعث تیرے حملے سے محفوظ رہا ہوں''۔

دنیائے ولایت میں صحابہؓ اور ائمہ اہلِ بیتؓ کے بعد حضرت سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ سے زیادہ کس کا مقام ہوگا لیکن اگر ولایت کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کے لئے نماز کا حکم ساقط نہیں ہوا تو پھر ہما شما کس شمار میں ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، صدیقین رضی اللہ عنہم، شہداء و اولیاء اور صلحائے امت میں سے کسی نے کبھی فریضہ نماز کو ترک نہیں کیا لیکن کتنا بڑا تضاد ہے کہ خدا اور رسول کی تعلیمات تو ترکِ نماز کو کفر و منافقت سے تعبیر کرتی ہوں جبکہ آج کے نام نہاد صوفی ترکِ نماز کو اپنے روحانی درجات کی بلندی کی دلیل ٹھہرانے لگیں۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

جزوِ دوم

نماز کا فلسفہ اجتماعیت

فلسفہ اجتماعیت (اسلام کے معاشرتی نظام کا فلسفہ)

زیرِنظر باب میں نماز کے حوالے سے اسلام کے فلسفہ اجتماعیت پر اظہارِ خیال کیا جائے گا تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اجتماعی معاشرتی سطح پر نماز اسلامی معاشرے میں بسنے والے افراد کے سیرت و کردار کی تعمیر میں کیا کردار ادا کرتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نماز انسانی زندگی کے تمام گوشوں، شعبوں اور زاویوں پر محیط ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اجتماعیت کے فروغ میں ہر سطح پر دور رس اثرات مرتب کرتی ہے۔

قرآن حکیم میں اجتماعی طور پر نماز ادا کرنے کا حکم بایں الفاظ وارد ہوا ہے:

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ○

(القرآن، البقرۃ ۲:۴۳)

''نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

اس آیہ مبارکہ میں دو جگہ نماز با جماعت کا حکم بڑی صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے ایک ''اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ'' میں اور دوسری جگہ ''وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡن'' میں۔ ان دونوں جگہوں پر صیغہ جمع امر استعمال کیا گیا ہے۔ آیت کے آخری حصے میں نماز کو ایک جگہ باہمی طور پر ادا کرنے کی تلقین زیادہ وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اقامتِ صلوۃ کا مفہوم انفرادی سطح پر نہیں بلکہ اجتماعی و معاشرتی سطح پر نظامِ صلوۃ

کے نفاذ کا تقاضا کر رہا ہے کیونکہ انفرادی نماز کے مقابلے میں نماز با جماعت کا حکم نصِ قطعی سے ثابت ہے۔

خلوت اور جلوت کی نماز کا موازنہ و تقابل

نماز بندہ و خالق کے درمیان ایسے تعلق کی آئینہ دار ہے جو انتہائی قرب پر مبنی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو بادی النظر میں گوشہ نشینی اور خلوت گزینی میں ادا کی ہوئی نماز کو عبد و معبود کے مابین تعلق عبودیت زیادہ محکم اور پختہ تر کرنے کا موجب ہونا چاہئیے تھا اور یہ امر جلوت کے مقابلے میں خلوت کی نماز کے پسندیدہ تر ہونے کا متقاضی تھا۔ لیکن عجب طرفہ تماشا ہے کہ فرمودہ خداوندی کی رو سے گوشہ تنہائی میں ادا کردہ انفرادی نماز کے مقابلے میں سرِ عام با جماعت ادا کی ہوئی نماز بدرجہا زیادہ اجر و فضیلت کی حامل ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ با جماعت نماز تنہا نماز کی نسبت ستائیس گنا زیادہ اجر و ثواب رکھتی ہے۔

(البخاری، ۱:۸۹)

فلسفہ اجتماعیت و مرکزیت

نماز با جماعت کا فلسفہ وحکمت معاشرتی اعتبار سے افرادِ ملت کو ایک مخصوص نظم و ضبط کے سانچے میں ڈھالنے کا متمنی ہے تاکہ اجتماعی سطح پر ملت کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوسکیں اور پورے مسلم معاشرے میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہوجائے جب پورا معاشرتی ڈھانچہ تغیر آشنا ہوجائے تو انفرادی اور اجتماعی احوال یکسر منقلب ہوجائیں گے جس کے نتیجے میں عمرانی سطح پر ہر انسان کے رہن سہن کا انداز تبدیل ہوکر تہذیبی و ثقافتی کایا پلٹنے کا موجب ہوگا۔

نماز با جماعت کا بنظر غائر جائزہ لینے سے اس کے بطن میں سے دو فلسفے ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک فلسفہ اجتماعیت اور دوسرا فلسفہ مرکزیت۔

فلسفہ اجتماعیت

نماز ملت کے اجتماعی و معاشرتی ڈھانچے پر دور رس اثرات مرتب کرتی ہے اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی تہذیب و تمدن اور کلچر کے خدوخال کی تشکیل میں نماز کی روح اجتماعیت کو بڑا عمل دخل ہے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ نماز میں اس روحِ اجتماعیت کی کارفرمائی فرد کی سطح سے لے کر قومی، ملی اور بین الاقوامی سطحوں تک زندگی کے تمام دائروں کو محیط ہے اور اگر اس کو پوری طرح بروئے کار لایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ نہ صرف انفرادی زندگی بلکہ اجتماعی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کی اصلاح بطریق احسن عمل میں نہ لائی جاسکے۔ اسلامی معاشرہ میں فی الحقیقت نماز ہی وہ بنیادی عامل (Basic Factor) ہے جو یکساں طور پر فرد اور ملت کے قالب میں انقلابی روح برپا کر کے دونوں پر ہمہ جہت ترقی کے دروازے کھول سکتا ہے۔ لیکن اس سے وہ حقیقی نماز مراد ہوگی جس کی اذانِ سحر شبستان وجود میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر نماز میں وہ حقیقی روح مفقود ہو جائے تو پھر بقول اقبالؒ

رُوح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام
فرد ناھموار، ملت بے نظام

کا نقشہ آنکھوں کے سامنے جم جاتا ہے۔

نظامِ صلوٰۃ میں کارفرما اجتماعیت کے اصولوں کی روشنی میں من کل الوجوہ اسلامی ریاست کی تشکیل کے وہ راہ نما اصول وضع کئے جاسکتے ہیں جو فرد معاشرہ اور حاکم و محکوم کے مابین باہمی روابط و معاملات طے کرنے میں اساسی نوعیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر اس بنیاد پر اسلامی طرز حکومت کی عمارت استوار کی جاسکے تو ایک اسلامی فلاحی مملکت کا وجود عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

اسلامی نظریہ اجتماعیت کا دوسرے نظریات سے تقابلی جائزہ

نظام صلوۃ کے بطن سے اسلامی اجتماعیت کا جو نظریہ ابھرتا ہے وہ فرد معاشرہ کے

باہمی حقوق و فرائض متعین کرنے میں انتہائی اہمیت و معنویت کا حامل ہے۔ اس کے دم قدم سے اسلام کے عمومی مزاج میں انفرادیت اور اجتماعیت کے تصورات باہمی مطابقت اور توافق (Harmony) کے ذریعے اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی تضاد و تناقض اور بعد باقی نہیں رہا اور فرد و ملت پر ہمہ نوع ترقی کی راہیں کھل گئی ہیں۔ اس کے باوصف جب ہم عصر دنیا (Contemporary World) کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ان میں افراط و تفریط اور تاریخی جبر کا عنصر بڑی شدت سے غالب نظر آتا ہے۔ ان نظریات کی تشکیل میں مخصوص تاریخی عمل اور معروضی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی عوامل کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔

سب سے پہلے کرۂ ارض میں حریت فکر کے علم برداروں نے انفرادیت (Individualism) کا نظریہ پیش کیا جس نے فرد کو شتر بے مہار کی طرح مادر پدر آزاد چھوڑ دیا۔ جب فرد پر کوئی قدغن نہ رہی تو حالات اور اجتماعی معاملات کا توازن اس قدر ناہمواری اور افراتفری کا شکار ہو گیا کہ ردعمل کے طور پر تاریخی جبریت و جدلیت کے نتیجے میں طبقاتی کشمکش کے حامل اشتراکیت (Socialism) و اشتمالیت (Communism) کے نظریات نے جنم لیا جو کرۂ ارض کے ایک خطے پر ایسا جابرانہ اور قاہرانہ مستبد (Despotic) نظام مسلط کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے فرد سے اس کی آزادی چھین لی اور یک جماعتی آمریت کے شکنجے میں جکڑ کر روح حریت اس قدر بری طرح پامال کیا کہ مجبور و مقہور انسان اس شعر کی عملی تفسیر بن کر رہ گیا ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

انفرادیت اور اجتماعیت کے تصورات پر مبنی ان دو انتہا پسندانہ نظریات نے دنیا کو دو متحارب کیمپوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔ ان دونوں میں بعد المشرقین ہے اور باہمی موافقت اور امن و آشتی کی فضا کا پیدا ہونا خارج از امکان نظر آتا ہے۔ ان کے اسلحہ خانوں (Arsenals) میں روایتی اور ایٹمی اسلحہ کے انبار لگے ہوئے ہیں جن میں ذرہ سی

چنگاری بھی دنیا کو ناقابل یقین حد تک بھیانک اور تباہ کن جنگ سے دوچار کرسکتی ہے۔

باہم متصادم سرمایہ دارانہ (Capitalistic) اور اشتراکی (Socialistic) نظریات کے علی الرغم اسلام نے انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج پر مبنی ایک حقیقت پسندانہ نظریہ پیش کیا ہے جو ایک طرف فرد کی شخصی آزادی کی مکمل ضمانت فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف ملت کی اجتماعی سلامتی اور تحفظ کا ضامن ہے۔ دنیا اگر اس نظریہ کو اپنا لے تو ہر شخص کو عدل و انصاف کے ساتھ آبرومندانہ زندگی کا بنیادی حق حاصل ہوسکتا ہے اور ہر قوم و ملت نظریاتی تصادم (Idealogical Conflict) کی بجائے ظلم و استحصال سے پاک دنیا میں پرامن بقائے باہمی (Peaceful Coexistence) کی فضا میں سانس لے سکتی ہے۔

نماز اور انفرادیت کا تصور

شریعت مطہرہ نے مجبوری کی حالت میں جب نماز باجماعت میسر نہ آئے تو انفرادی طور پر نماز ادا کرنے کی رخصت و اجازت عطا فرمائی ہے۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد گرامی کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، انفرادی نماز کے تصور کو بڑے دلنشین انداز سے اجاگر کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے گھروں کو ذکر الٰہی سے آباد کرتے رہو۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صلوا فی بیوتکم ولا تتخذوھا قبورا

(ترمذی، ۱:۱۰۳)

''اپنے گھروں میں (بھی) نماز پڑھو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔''

اسی سلسلے میں حضور ﷺ کا ارشاد گرامی بایں الفاظ بھی منقول ہے:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ اجعلوا فی بیوتکم من صلاتکم ولا تتخذوھا قبورا

(بخاری، ۱:۱۵۸)

''ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اپنے گھروں کو نماز گاہ بناؤ اور انہیں قبرستان کی ہیئت میں تبدیل نہ کرو۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی رو سے اگرچہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے والا بہت زیادہ اجر وثواب کا حقدار ہے تاہم انفرادی طور پر گھر میں نماز ادا کرنا بھی حکمت و افادیت سے خالی نہیں۔ فرضوں کی باجماعت نماز کے بعد نوافل وسنن کا گھر کی چار دیواری میں ادا کرنا احسن ہے۔ اس سے جہاں گھر کی فضا نماز کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہوتی ہے وہاں یہ تصور بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں زندگی کی ہر سطح پر اجتماعیت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ شخصی انفرادیت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ دونوں پہلو اسلامی طرز زندگی کی اساس ہیں اور دونوں کا باہمی ربط اسلامی معاشرے کی ہمہ جہت ترقی کا ضامن ہے۔

اسلام میں انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصور

اسلام میں انفرادی اور اجتماعی حقوق کے تحفظ کے بارے میں کسی قسم کا التباس یا ابہام نہیں۔ وہ مخصوص تعینات ومحدودات کے دائرے میں رہتے ہوئے فرد اور ملت دونوں کے حقوق کا محافظ ونگران ہے۔ فرد کی آزادی کی زد اگر اجتماعی ملی حقوق پر پڑ رہی ہو تو وہ آخر الذکر کو بہمہ وجوہ اہمیت و اولیت دیتا ہے۔ اس لئے کہ ملت کو کسی قسم کا گزند پہنچنے سے فرد کی اپنا بقا اور سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

اسلام بطور دین فطرت کے کسی معاملے میں عدل و انصاف کا پرچم ہاتھ سے چھوڑنے کا روا دار نہیں۔ جہاں وہ کسی کو فرد کے حقوق پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہاں وہ اس بات کا روادار بھی نہیں کہ مٹھی بھر افراد ملت کے اجتماعی مفاد سے کھیلنے لگیں۔ اسلام میں شورائیت اور جمہوریت کی روح اس بات کی متقاضی ہے کہ مرد مومن کو جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہئے۔ اسلام کی تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں چند سرفروش دیوانے کلمہ حق کی بالادستی کی خاطر جابر و

مطلق العنان بادشاہوں کے سامنے غیر متزلزل چٹان کی طرح کھڑے رہے اور غرور حاکمیت کو خاک میں ملا کر دم لیا۔ جب یزیدیت حاکمیت کے روپ میں سر اٹھانے لگے تو اسوۂ شبیری کی تقلید فرض عین بن جاتی ہے۔

نماز باجماعت کی حکمتیں

گھر کے گوشہ خلوت کی بجائے نماز پنجگانہ مسجد میں باجماعت ادا کرنے کا حکم اپنے اندر چند در چند حکمتوں کا حامل ہے، ان کا ذکر درج ذیل ہے:

☆ پنجگانہ نماز مسجد میں باجماعت ادا کرنے سے مسلمانوں کو دن میں پانچ مرتبہ یکجا ہونے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اس طرح انہیں اہل محلّہ کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ کون کس حال میں ہے۔ قرب و جوار میں کوئی ایسا تو نہیں جو نان شبینہ کا محتاج ہے یا تنگی وعسرت یا بیماری کے ہاتھوں پریشانی میں دن کاٹ رہا ہے۔

☆ نماز کی یکجائی باہمی قرب وموانست اور محبت کے رشتے مضبوط و مستحکم بنانے میں مد و معاون بنتی ہے۔ ایک دوسرے کی خوشی، غمی اور دکھ سکھ میں شریک ہو کر ہی ایک صحتمند، خوشحال اور فعال معاشرے کی تعمیر ممکن ہے۔

☆ بالالتزام نماز باجماعت کی پابندی سے انسان کے دل میں یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ جب بغیر کسی شرعی عذر کے گھر کے اندر رہ کر انفرادی سطح پر نماز جیسے فریضے کی بجا آوری ممکن نہیں تو افراد معاشرہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ کیسے رہ سکتے ہیں؟

نماز باجماعت اور مختلف سطحوں پر نظام اجتماعیت کا قیام

ایک اسلامی معاشرے میں نماز باجماعت کے ذریعے مختلف معاشرتی سطحوں پر ایک مؤثر و فعال نظام اجتماعیت برگ و بار پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی نظر آنے والی عملی صورتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ محلے کی سطح

محلے کی جامع مسجد اجتماعیت کا وہ بنیادی یونٹ ہے جہاں اہل محلّہ دن میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس طرح انہیں ایک دوسرے کے احوال و معاملات سے آ گاہی حاصل ہوتی ہے اور مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اجتماعی شعور جنم لیتا ہے۔

۲۔ شہر کی سطح

شہر کی بڑی جامع مسجد میں مختلف محلوں سے نماز جمعہ میں شرکت کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں اور یہ ہفتہ وار اجتماع لوگوں کے درمیان وسیع پیمانے پر باہمی روابط استوار کرنے کے مواقع بہم پہنچتا ہے۔ شہری سطح کے عظیم اجتماعات عیدین کے موقعوں پر دیکھنے میں آتے ہیں جن کے نتیجے میں باہمی خیر سگالی اور اتفاق و اتحاد کی فضا قائم کرنے میں مدد ملتی ہے اور منافرت و مخاصمت کی جگہ انس و محبت کے جذبات کو فروغ ملتا ہے۔

۳۔ ملکی و عالمی سطح

ملک گیر سطح کے عظیم دینی اجتماعات گاہے گاہے بڑے شہروں میں منعقد کئے جاتے ہیں جن میں اہم دینی و ملی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا ہے اور باہمی مشاورت سے بہت سی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں۔ تاہم عظیم ترین ایمان پرور اور روح افروز عالمی اجتماع ہر سال حج کے موقعہ پر سرزمین حرم میں ہوتا ہے جہاں مختلف رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی خطوں سے تعلق رکھنے والے لوگ سب امتیازات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسلامی اخوت کا بصیرت افروز منظر چشم عالم کو پیش کرتے ہیں۔ بقول اقبال:

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
که ما پروردئه یک نو بهاریم

حج اسلامیان عالم کے لئے ایک ایسے بین الاقوامی Forum کی حیثیت رکھتا

ہے جسے ملت اسلامی، عالم اسلام کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے بروئے کار لا سکتی ہے اور اس سے کما حقہ فائدہ اٹھا کر عالم اسلام کی ازسرنو شیرازہ بندی کی جا سکتی ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ حج جیسے روحانی Institution کو مؤثر و فعال بنا کر سپر پاورز کے مقابلے میں اسلامی بلاک کی تشکیل کی سمت عملی قدم اٹھائے جا سکتے ہیں۔ اگر اسلامی بلاک عمل میں آ جائے تو طاغوتی طاقتیں مسلمانوں پر دست ستم دراز کرتے ہوئے خوف کھائیں گی۔ اسلامیان شرق و غرب کا دل ایک ساتھ دھڑکے گا اور دنیا کے کسی خطے میں مسلمانوں پر افتاد پڑے گی تو اس کی کسک ہر جگہ برابر محسوس کی جائے گی ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

باجماعت نماز کے ثمرات سے محرومی کیوں؟ ...... ایک لمحہ فکریہ

یہ بات اہل فکر و نظر کے لئے سوچنے کی ہے کہ نماز باجماعت کا نظام جو اسلامی معاشرے میں مؤثر اجتماعیت کے قیام کے لئے اساس کا درجہ رکھتا ہے اس کے عملی اثرات ہماری معاشرتی زندگی پر کیوں مرتب ہوتے نظر نہیں آتے۔ اکثر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ لوگ سالہا سال تک ایک ہی مسجد میں کندھے سے کندھا جوڑ کر نماز پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے سے بیگانہ و لاتعلق رہتے ہیں۔ مقام تاسف ہے کہ ہماری نماز بے روح اور رسمی سی چیز (Ritual) بن کر رہ گئی ہے۔ اس گھمبیر صورتحال کا ازالہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ افراد ملت کو احساس کے مشترک رشتے میں منسلک کرنے کے لئے باجماعت نماز کے ثمرات سے کما حقہ استفادہ کرنا چاہئے اور ہم نے بے حسی و جمود کی جو چادر اپنے اوپر تان رکھی ہے اس کو اتار پھینکنا چاہئے۔

نظام اجتماعیت میں مسجد کی حیثیت

مسجد اسلامی نظام اجتماعیت میں ایک مرکز (Nucleus) کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ایک ایسا ادارہ (Institution) ہے جو مسلمانوں کو رنگ، نسل، قبیلہ، حسب و نسب اور ذات پات کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر فقط ایمان کی بنیاد پر ایک ہی سطح پر لے آتا ہے اور بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

بلاشبہ مسجد ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں انسانی مساوات کا عملاً درس دیا جاتا ہے اور محمود و ایاز کے درمیان سب تفریق ختم کر دیتا ہے۔ جہاں وحدت اولاد آدم کے نظریئے کی تعلیم رنگ، نسل، قوم، زبان اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز کے بغیر ہر ایک کو دی جاتی ہے لیکن عملاً جو کچھ ہم اپنے گرد و پیش شب و روز دیکھتے ہیں اس پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ مسجد جسے اسلام نے نوع انسانی کی وحدت کی علامت (Symbol) کے طور پر پیش کیا تھا اور جس کے دروازے بلاامتیاز ہر ایک کے لئے کھلے تھے اب بدقسمتی سے فرقہ واریت کے علم برداروں کے ہاتھوں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ ہم اپنے کردار اور طرز عمل سے اس تصور کی یکسر نفی کر دیتے ہیں جس کا عملی مظاہرہ محض چند ساعتوں کے لئے مسجد کی چار دیواری میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ مسجد جس میں شانہ بشانہ کھڑے ہو کر ہم محمود و ایاز کا فرق ختم کرنے کا علامتی اظہار کرتے ہیں اس سے باہر آتے ہی ہمارے درمیان دولت و اقتدار اور منصب و جاہ کی مصنوعی دیواریں حائل ہونے لگتی ہیں۔ اس دو رنگی اور تضاد پر مبنی کردار نے ملت کے اندر انتشار و افتراق اور تشتت و بے یقینی کی راہیں کھول دی ہیں جس سے امت مسلمہ کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔

فضیلت کا معیار صرف تقویٰ اور عمل خیر ہے

اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کی عزت و تکریم اور شرف و بزرگی کا معیار صرف تقویٰ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

(القرآن، الحجرات، ۱۳:۴۹)

’’اللہ کے ہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔‘‘

اس ارشاد ربانی کے بعد کسی انسان کو زیبا نہیں کہ خود کو آقا اور دوسروں کو غلام تصور کرے۔ آقائے دوجہاں ﷺ نے عالمگیر مساوات کے درس دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الا لا فضل لعربی علی اعجمی ولا لا عجمی علی عربی ولا لا حمر علی اسود ولا لا سود علی احمر الا بالتقویٰ

(بیہقی خطبہ حجۃ الوداع)

’’جان لو کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو کالے پر اور کالے کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں ہاں بنائے فضیلت محض تقویٰ ہے۔‘‘

سرکار دوعالم ﷺ نے عربی، عجمی اور گورے کالے کے امتیازات ہمیشہ کے لئے ختم کر دیئے۔ نبی اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں نوع انسانی کے نام جو آخری پیغام دیا تھا اس میں عملی مساوات کی تعلیم دی گئی ہے، فرمایا:

’’تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔‘‘

آنحضرت ﷺ کے اس فرمان نے اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنی کے امتیازات یکسر ختم کر دیئے اور اس دور کے عرب معاشرے کی کایا پلٹ دی۔ چنانچہ عہد نبوی ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں انسانی مساوات اورعدل پروری کے محیر العقول مظاہر دیکھنے میں آئے۔ آپ ﷺ کے پیروکار و متبعین انسانی مساوات کا علم لیکر اٹھے قیصر و کسری کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا اور غرور حاکمیت کے سب بت پاش پاش کر دیئے۔ مختصر سے عرصے میں دنیائے شرق و غرب ان کے زیرنگیں آ گئی۔ اسلام میں قانون کی حاکمیت (Rule of Law) کا جو تصور ملتا ہے آج کی نام نہاد مہذب دنیا اس کی کوئی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ اس سلسلے میں تاریخ اسلام سے بہت سے نظائر(Precedents) پیش کئے

جا سکتے ہیں۔

سابقہ قوموں کی تباہی کے اسباب......قرآن کی نظر میں

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر انتہائی عبرت آموز اور مؤثر پیرائے میں پہلی قوموں کی تباہی و بربادی کے اسباب کی نشاندہی فرمائی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِذَآ اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا○

(القرآن، بنی اسرائیل، ۱۷:۱۶)

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم وہاں کے امراء اور خوشحال لوگوں کو (کوئی) حکم دیتے ہیں (تاکہ ان کے ذریعہ عوام اور غرباء بھی درست ہو جائیں) تو وہ اس (بستی) میں نافرمانی کرتے ہیں پس اس پر ہمارا فرمان (عذاب) واجب ہو جاتا ہے پھر ہم اُس بستی کو مسمار کر دیتے ہیں۔''

ازمنہ قدیم میں انسانی بستیوں کے صفحہ ہستی سے مٹ جانے اور آبادیوں کے تباہی و بربادی کے گھاٹ اُتر جانے کا پسِ منظر قرآن حکیم نے یہ بیان فرمایا کہ ان کے زعماء و صاحبان اقتدار نے احکام خُداوندی کی خلاف ورزی کو اپنا معمول بنا لیا تھا اور اُن کی اس روش کے اثرات رفتہ رفتہ پھیل کر عوام میں سرایت کر گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ہلاکت و بربادی ان سب کا مقدر بن گئی۔

اس قرآنی فلسفہ کی تفہیم میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے میں بگاڑ اور خرابی کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی غریب مفلوک الحال انسان ارتکاب جرم مفلسی اور فاقہ کشی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کرتا ہے جبکہ کسی امیر کے جرم کرنے کا محرک کوئی سفلی جذبہ یا کسی کمزور و بے بس کی عزت و آبرو سے کھیلنے کی ہوس ہوتا ہے۔ قانون کی حکمرانی سے بے بہرہ خُدا ناآشنا معاشرے میں جب کوئی غریب کسی جرم میں ملوث ہوتا ہے تو اُسے

کڑی سے کڑی سزا دی جاتی ہے، لیکن امیر آدمی جرم کا مرتکب ہونے کے بعد اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر صاف چھوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی معاشرے کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک چھوٹے، بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، امیر اور غریب قانون کی نظر میں برابر نہ ہوں۔ عدل و انصاف کا سب کے لئے یکساں معیار ہونا چاہیے۔

الناس علی دین ملوکھم

''لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے پر ہوتے ہیں۔''

کے مصداق جب تک اصلاح کا عمل بڑے لوگوں سے شروع نہ کیا جائے، بگاڑ کے اسباب دور نہ ہو سکیں گے۔ قرآنِ حکیم اُسی فلسفے کی تعلیم کو انسانی ذہنوں میں راسخ کرنا چاہتا ہے۔

نماز باجماعت اور اجتماعیت کے پانچ اُصول

نماز باجماعت کے فلسفے سے مستنبط اجتماعیت کے پانچ اُصول ایسے ہیں جن کو اپنا لینے سے معاشرے کی اصلاح وتطہیر کو بطریق احسن عمل میں لایا جاسکتا ہے ان کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے:

۱۔ خاتمہ انتشار

اسلام میں اجتماعیت کا تصور ملت کو ہر قسم کے انتشار اور بدنظمی سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک روایت کا حوالہ دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو لوگوں کو ٹولیوں کی صورت ادھر ادھر بیٹھے دیکھا۔ آپ ﷺ نے انہیں سرزنش کی اور متنبہ فرمایا کہ اگر تم اس طرح منتشر رہو گے تو تمہارے دل کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔ اس ارشادِ رسول ﷺ سے اُمت مسلمہ کو تعلیم ملتی ہے کہ وہ اپنی صفوں کو انتشار کی لعنت سے پاک رکھیں۔

۲۔ فروغِ وحدت و استحکامِ ملت

اجتماعیت کا دوسرا اُصول اُمت میں وحدت فکر و عمل اور اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینا ہے۔ مسجد میں صف بندی اور قبلہ رو یک سمتی سے یہی تعلیم ملتی ہے جس کے سانچے میں زندگی کو من حیث المجموع ڈھال لینے سے ملت اسلامیہ قوت و استحکام سے بہرہ ور ہو سکے گی۔

۳۔ نظم و نسق کا لحاظ

اجتماعیت کا یہ اُصول صرف اس پر موقوف نہیں کہ صف بندی کر کے بیٹھے رہیں بلکہ اس کی نتیجہ خیزی کے لئے لازمی ولابدی ہے کہ صفوں میں ترتیب و قرینہ کو ملحوظ رکھا جائے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ صفوں میں ترتیب و قرینہ سے بیٹھنا فرشتوں کی سُنت ہے۔

مسجد کے اندر اور مسجد سے باہر نظم و ضبط (Discipline) کے اُصول کا اطلاق اُمت کو متحد و منظّم رکھنے اور اس کی شیرازہ بندی کے لئے از بس ضروری ہے۔ اس ضمن میں ارشادِ ربانی:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا○

(القرآن، ال عمران، ۳:۱۰۳)

’’اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو۔‘‘

حرز جاں بنانے کے قابل ہے تاکہ باطل کے مقابلے میں اہل اسلام کی ہوا نہ اکھڑے اور اقوام عالم میں انہیں ننگ و رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۴۔ تنظیم سازی

جس طرح نماز میں حکم ہے کہ جب تک صف اول مکمل نہ ہو دوسری صف نہ

بنائی جائے اور صفوں میں حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے یعنی پہلی صف میں عمر اور علمی مرتبہ کے اعتبار سے بڑے بڑے لوگ کھڑے ہوں اور دوسری صف میں وہ لوگ کھڑے ہوں جو درجے میں ان سے کم تر ہوں۔ آخری صف میں بچے اور اگر عورتیں بھی شامل جماعت ہوں تو وہ سب سے پچھلی صف میں کھڑی ہوں۔ اس اصول کا اطلاق نماز سے باہر عملی زندگی پر بھی مکمل طور پر ہوتا ہے۔ جس میں تنظیم (Organization) کی اہمیت و افادیت ایک مسلمہ امر ہے۔

۵۔ قیادت کی اہلیت

نماز با جماعت کی امامت کے لئے شریعت مطہرہ نے کسی ایسے شخص کو امام مقرر کرنے کا حکم دیا ہے جو ان شرائط پر امکانی حد تک پورا اترتا ہو جنہیں کتب فقہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں اولین شرط یہ ہے کہ امام چونکہ مفروض الاطاعت ہے اور اس کی تقلید لازم قرار دی گئی ہے اور بحیثیت امام اس شخص کی تقرری عمل میں لائی جائے جسے اپنے مقتدیوں پر برتری اور فوقیت حاصل ہو۔ امام کی اہلیت کا معیار آنحضور ﷺ کی اس حدیث مبارکہ میں واضح طور پر بیان ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

يؤم القوم اقراهم لكتاب الله تعالىٰ فان كانوا فى القراة سوا فاعلمهم بالسنة فان كانوا فى السنة سواء فاقدمهم هجرة فان كانوا فى الهجرة سواء فاقدمهم سِنًّا

(مصنف ابن ابی شیبہ ا:۳۴۳)
(المعجم الکبیر للطبرانی، ۱۷:۲۱۹)

''قوم کی امامت وہ کرے جو ان سب میں سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو۔ اگر قراءت قرآن میں سب برابری کا درجہ رکھتے ہوں تو پھر جو سب سے زیادہ عالم سنت ہو وہ امامت کرے۔ اس میں بھی سب برابر ہوں تو جو ہجرت میں

سب سے مقدم ہو اس میں بھی سب برابر ہوں تو جو عمر میں سب سے زیادہ ہو۔(وہ امامت کرے)''

اس اصول سے بغیر کسی ابہام کے امت مسلمہ کے لئے یہ ضابطہ وضع کیا گیا ہے کہ اسے اپنا قائد کسی ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہیئے جو ہر لحاظ سے قیادت کا اہل اور مستحق ہو۔ ملت کے تشخص اور وجود کی بقا کا انحصار لازمی طور پر ایسے امیر اور قائد پر ہے جو مطلوبہ معیار پر بتمام و کمال پورا اترتا ہو، اس ضمن میں آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی خصوصی توجہ چاہتا ہے:

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بَجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ الا بِاَمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ○

(جامع بیان العلم، ۱:۶۲)

''جماعت کے بغیر اسلام کا کوئی وجود نہیں اور بغیر کسی امیر کے جماعت کا کوئی وجود برقرار نہیں رہ سکتا اور بغیر اطاعت اور حکم ماننے کے قائد کا کوئی وجود نہیں۔''

اسلامی حکومت کے امیر و قائد کے انتخاب کے لئے جو شرائط متعین کی گئی ہیں ان میں اس کا صاحب علم، ذہین و فطین اور دل و دماغ کی اعلیٰ خوبیوں کا مالک ہونے کے باوصف جسمانی اعتبار سے صحت مند ہونا ضروری ہے۔ اس کا مالی حیثیت سے کم تر ہونا کسی اعتبار سے اس کے انتخاب میں مانع نہیں ہوتا۔ تاہم اس کی پیروی اور اطاعت اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ خدا اور رسول ﷺ کے واضح احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو۔

جزوسوم

فلسفہ نماز اور نظام مرکزیت

گذشتہ صفحات میں نماز باجماعت کے حوالے سے مسجد کی بنیادی اور مرکزی حیثیت اور نماز کے فلسفے سے ماخوذ پانچ اصولوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا۔ اب اجتماعیت اور مرکزیت کے باہمی تعلق کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

اسلامی نظام میں اجتماعیت و مرکزیت کا باہمی تعلق

اسلامی نظام حیات میں مسجد بلاشبہ ایک بنیادی اکائی اور نیوکلیس (Nucleus) کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سے اجتماعیت کا جو فلسفہ ابھرتا ہے وہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس طرح مقرر کردہ امام کے بغیر نماز باجماعت کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح منتخب امیر اور قائد کے بغیر موثر اور مستحکم و مضبوط قیادت کا فریضہ سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ زمام اقتدار و اختیار منصب امارت کے کسی اہل شخص کے حوالے کئے بغیر ملت کی بقا و سلامتی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔اس بناء پر انتخاب امیر کی ذمہ داری من حیث المجموع تمام ملت اسلامیہ پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا افراد ملت کا یہ اجتماعی فریضہ ہے کہ وہ شورائیت کے جمہوری طریقے کو بروئے کار لاکر اپنے میں سے سب سے زیادہ اہل فرد کو امیر و سربراہ مملکت (Head of the state) منتخب کریں۔

استخلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوۃ والسلام کا سانحہ وصال نوزائیدہ مملکت اسلامیہ کے لئے انتہائی سخت آزمائش کا لمحہ تھا۔ اس سوال پر کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کا انتخاب

قریش سے عمل میں لایا جائے یا انصار مدینہ سے اس وقت ایوان پارلیمان (Parliament House) میں بڑے شد و مد سے بحث کی گئی۔ جس کے نتیجے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بالآخر مسلمانوں کا اجماع ہوگیا۔ اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کے بعد ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین مبارک عمل میں آئی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام سیاسی وحدت و استحکام اور موثر و فعال نظام مرکزیت کے قیام کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔

انتخاب امیر و قائد کے چھ اصول

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قوم کے امیر و قائد کی اہلیت کے باب میں جو ارشادات فرمائے ہیں ان سے چھ بنیادی اصول اخذ کئے گئے ہیں جن کو قدرے شرح و بسط سے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

پہلا اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلا اصول یہ دیا کہ ہر جماعت کے لئے کسی امیر کا ہونا لازمی و لابدی ہے۔ اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی بخوبی اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اجتماعیت و مرکزیت کے مؤثر نظام کا قیام ہی اسلام کی بقا کا ضامن ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ لَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ

(جامع بیان العلم، ۱:۶۲)

''جماعت کے بغیر اسلام نہیں اور امیر کے بغیر جماعت نہیں۔''

مرکز گریز رجحانات ملت کو انجام کار انحطاط و زوال سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

بقول علامہ اقبالؒ

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی

دوسرا اصول

یہ بات کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام کی روح میں جمہوریت اور

شورائیت کارفرما ہے اور اس میں کسی قسم کی آمریت کا کوئی دخل نہیں۔ اس ضمن میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی جس میں آپ نے عہدہ امارت کی اہلیت کا معیار بیان فرمایا ہے خصوصی غور وفکر کا متقاضی ہے:

خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم و یصلون علیکم و شرار ائمتکم الذین تبغضونھم و یبغضونکم

(صحیح مسلم، کتاب الامارہ۲:۱۲۹)

''تمہارے وہ امراء سب سے بہتر ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کرتے ہوں اور وہ تمہاری بہتری چاہتے ہوں اورتم ان کی بہتری کے خواہش مند ہو اور وہ امراء سب سے بدتر ہیں جن کو تم پسند نہ کرو اور وہ تمہیں پسند نہ کریں۔''

اس فرمودہ مصطفوی ﷺ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہورہی ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں ریاست کے امیر اور عامۃ المسلمین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں خیر اور بہتری و فلاح کے جذبات رکھتے ہوں اور ان کے درمیان روابط، باہمی محبت وموانست اور الفت و خیرخواہی کی بنیاد پر استوار ہوں۔ ایک امیر کے لئے ملت کے اجتماعی مفاد اور حقوق کی پاسداری ہر چیز پر مقدم ہونی چاہئے انتخاب امیر کے لئے اگر اس معیار کوملحوظ رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی ہم اپنے اندر ایسی قیادت پیدا کرلیں جو اسلامی جمہوریت کے راہنما خطوط پرعمل پیرا ہوکر ہمیں ہر قسم کے داخلی اور خارجی بحران سے نجات دلا سکے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام میں موروثی قیادت اور امارت کا کوئی تصور نہیں اور اس کے اندر کسی قسم کی پاپائیت اور مذہبی پیشوائیت (Religious Priesthood) کی کوئی گنجائش نہیں۔

معیارِ امامت وامارت

امامت کے منصب پر کسی موزوں شخص کے انتخاب وتقرری کا فریضہ اجتماعی طور

پر تمام مسلمانوں پر عائد کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی واضح رہنمائی فرماتا ہے:

يؤم القوم اقرأهم لكتاب الله تعالى فان كانوا فى القراة سواء فاعلمهم بالسنة فان كانوا فى السنة سواء فاقدمهم هجرة فان كانوا فى الهجرة سواء فاقدمهم سنا

(مصنف ابن ابی شیبہ، ۱:۳۴۴)

''قوم کی امامت کے فرائض سنبھالنے کا مستحق وہی شخص ہوسکتا ہے جو کتاب اللہ کا سب سے زیادہ ماہر ہو۔ اگر قرآنی علوم میں (سب) برابر ہوں تو (اس کے لئے) سنت کے ماہر کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر سنت میں (سب) برابر ہوں تو ہجرت میں سبقت کرنے والے کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو ان میں عمر اور زیادہ تجربہ والے کو ترجیح دی جائے گی۔''

اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہے کہ امامت جماعت فی نفسہ کسی بھی فرد کا حق نہیں بلکہ اس کے لئے ترجیحی بنیادوں پر ایک معیار مقرر کیا گیا ہے جس کی رو سے مسلمانوں کا یہ اجتماعی حق ہے کہ وہ جسے چاہیں اس کی اہلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا امام منتخب کرلیں۔ اسی اصول کا اطلاق اسلامی ریاست کے امیر اور سربراہ کے انتخاب پر بھی ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات اچھی طرح ذہن میں جاگزیں کرلینا چاہیے کہ اسلامی اصول جہانبانی میں بادشاہت یا ملوکیت کا کوئی تصور قابل قبول نہیں۔

قرآن حکیم میں باری تعالیٰ نے خلافت ارضی کا جو تصور دیا ہے امت مسلمہ کے لئے اسے بطور راہنما اصول کے اپنالینا ہی منشائے ایزدی کی تعمیل کا موجب قرار دیا گیا ہے ارشاد فرمایا گیا:

وَ عَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

(القرآن، النور، ۲۴:۵۵)

''اللہ نے ایسے لوگوں سے وعدہ فرمایا جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہ ضروری انہی کو زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو (حق) حکومت بخشا تھا جو ان سے پہلے تھے۔''

یہ آیہ کریمہ بصراحت اس بات کا اعلان فرما رہی ہے کہ خلافت ارضی کی تفویض کا وعدہ ان بندگان خدا سے کیا گیا ہے جو ایمان اور اعمال صالحہ کی بنا پر اس کے اہل ہوں گے۔ یاد رہے کہ یہ وعدہ زمانی و مکانی اعتبار سے غیر مشروط ہے اور اس کی صداقت و حقانیت ہر دور اور ہر خطہ زمین کے لئے مسلم ہے۔ قرآن نے ایک واضح اور اٹل اصول بیان فرمادیا کہ ارضی خلافت و امارت کسی فرد واحد کا حق نہیں جو اسے موروثی بادشاہت (Hereditary Monarchy) کے طور پر عطا کردیا جائے بلکہ اس کے دروازے بلا تخصیص ہر اس شخص پر کھول دیئے گئے جو استحقاق کی بنا پر اس کا اہل ہو۔

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر جہاں حضرت طالوت علیہ السلام کے امیر مقرر کئے جانے کا ذکر ہے۔ اس تصور کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی ہے:

وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ

(القرآن، البقرہ،۲:۲۴۷)

''اور اسے علم اور جسم میں زیادہ کشادگی عطا فرمادی ہے۔''

یہ آیہ مقدسہ کسی بھی امیر قوم یا سپہ سالار کے دو امتیازی اوصاف بیان کرتی ہے۔ ایک یہ کہ اس کے پاس وہبی یا کسبی ذریعے سے حاصل کردہ علم ہو جبکہ دوسرا وصف اس کا پرکشش، وجیہہ شخصیت اور جسمانی صحت و توانائی کا مالک ہونا ہے۔ ان کی بناء پر ہی وہ اپنے ہم عصروں پر فوقیت و فضیلت حاصل کرسکتا ہے۔

آج دنیا علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر مادی ترقی کے جس بام عروج پر پہنچ چکی ہے اس کے پیش نظر کسی بھی اسلامی مملکت میں امیر قوم یا سربراہ مملکت کے لئے جدید علوم اور عصری حالات و واقعات (Current Affairs) سے واقفیت و

آ گاہی از بس ضروری بلکہ ناگزیر ہوگئی ہے۔دین اور سائنس میں کوئی تعارض نہیں۔ بنا بریں امت مسلمہ پر یہ اجتماعی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے جمہوری حق کو استعمال کرتے ہوئے ان افراد کے ہاتھوں میں زمام اقتدار و اختیار سونپے جو ایک طرف آنحضرت ﷺ کے ارشاد کردہ معیار پر پورا اترتے ہوں اور دوسری طرف علوم جدیدہ پر بھی یدطولیٰ رکھتے ہوں تاکہ وہ عصر حاضر کے تمام مسائل سے کما حقہ عہدہ برآ ہوسکیں۔

تیسرا اصول

فلسفہ اجتماعیت نماز سے اخذ کردہ تیسرا اصول یہ ہے کہ جس طرح ایک امام کے اشارے پر لاکھوں گردنیں جھک جاتی ہیں اور مقتدی بلا چوں و چراں اپنی ذاتی خواہشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کی تقلید اور اطاعت اپنا فرض جانتے ہیں۔ اسی طرح ایک امیر اور قائد کی اطاعت اس وقت تک امت مسلمہ کے لئے فرض عین کا درجہ رکھتی ہے جب تک وہ صریحاً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو۔ اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی حرز جاں بنانے کے قابل ہے:

لَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ

(جامع بیان العلم،۱:۶۲)

''اطاعت کے بغیر امارت (قیادت) کا کوئی معنی نہیں۔''

بلاشبہ فرمان رسول مقبول ﷺ کے پیش نظر اسلام میں نظام مرکزیت کی اساس اطاعت امیر ہی ہے۔ اس کے بغیر ملت کی اجتماعی کوششیں اور مساعی جمیلہ نتیجہ خیز نہیں قرار دی جاسکتیں۔ اس ضمن میں آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد انتہائی بلیغ اور پر معنی ہے:

و من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ،۲:۱۲۴)

''اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

جس کی رو سے اطاعت امیر اور اطاعت رسول ﷺ لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

چوتھا اصول

شریعت مطہرہ نے جہاں امام جماعت کو مفروض الاطاعت قرار دیا ہے اور اس کی اتباع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوسکتی وہاں مقتدیوں کو یہ حق بھی تفویض کیا ہے کہ اگر امام سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو وہ اسے ٹوک بھی سکتے ہیں۔ مرد حضرات امام کو اس کی غلطی کی طرف ''سبحان اللہ'' یا ''الحمد للہ'' کہہ کر متوجہ کر سکتے ہیں جب کہ خواتین تالی بجانے کے انداز سے امام کو اس کی غلطی سے مطلع کر سکتی ہیں۔

نماز کے حوالے سے ''تنقید امام'' کے اس چوتھے اصول کا اطلاق عملی زندگی میں اسلامی مملکت کے کسی بھی امیر اور قائد پر بھی ہوسکتا ہے۔ جس طرح امام کی غلطی پر مقتدیوں کی خاموشی نماز کو معرض خطر میں ڈال دیتی ہے اسی طرح اگر امیر و مقتدائے قوم سے کسی قسم کی سنگین غلطی سرزد ہوجائے تو افراد امت پر یہ اجتماعی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے حق تنقید کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے اس کی غلطی کی طرف متوجہ کر کے اصلاحات پر مجبور کر دیں۔ بصورت دیگر ان کی خاموشی اجتماعی طور پر انتہائی مضر اور خطرناک اثرات و نتائج کی حامل ہوگی۔

کسی مصلحت کی بناء پر افراد امت کا اپنے قائد کی غلطیوں اور خامیوں سے چشم پوشی اختیار کرنا، تغافل مجرمانہ کے ذیل میں آتا ہے جس کے نتیجے میں برائیاں اور خرابیاں معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا واضح ارشاد ہے:

لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَّةِ اللهِ

(صحیح مسلم، ۲: ۱۲۵)

''اللہ (کے احکام) کے خلاف اطاعت (امیر) نہیں ہوگی۔''

لہٰذا اسلامی مملکت میں کسی امیر اور قائد کی اطاعت اس وقت تک بجالانا فرض ہے جب تک وہ واضح طور پر خدا اور اس کے رسول ﷺ سے روگردانی اور انحراف کا مرتکب نہیں ہوتا۔ گویا اطاعت امیر اطاعت احکام خداوندی سے مشروط ہے۔ اگر کوئی امیر خدا اور رسول خدا ﷺ کی اطاعت کا پٹا اپنی گردن سے اتار پھینکتا ہے تو وہ ہرگز مفروض الاطاعت نہیں رہتا۔

اطاعت کا حکم صرف امورِ خیر میں ہے

اطاعت امیر صرف امور خیر سے مشروط ہے جنہیں شریعت میں ''معروف'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے:

انما الطاعة فی المعروف

(صحیح مسلم باب الامارہ ۲:۱۲۵)

''بے شک اطاعت صرف امور خیر میں کی جائے گی۔''

رسول مقبول ﷺ کے اس فرمان نے قطعیت و حتمیت کے ساتھ اطاعت امیر کی حدود متعین فرمادی ہیں جس کی رو سے امیر کے ہر حکم کی اطاعت واجب نہیں بلکہ صرف معروف اور بھلے کاموں میں اس کا حکم واجب الاطاعت ہے۔ اس ضمن میں وضاحت کے لئے تاریخ اسلام سے ایک واقعہ کا حوالہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ نے کسی مہم پر ایک شخص کو جماعت کا امیر بنا کر بھیجا اور روانگی کے وقت اہل لشکر کو اس کی اطاعت بجالانے کی تلقین فرمائی۔ راستے میں اس امیر نے لشکریوں کو آگ کے ایک گڑھے میں کودنے کا حکم دیا۔ جسے انہوں نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کردیا کہ رحمت عالم ﷺ تو ہمیں آگ سے نجات دلانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے ہیں آپ ہمیں آگ کے شعلوں میں کود جانے کا حکم دینے والے کون ہیں؟ اس واقعے کی اطلاع حضور ﷺ کو دی گئی تو آپ ﷺ نے اس امیر کا حکم ماننے سے انکار کرنے والوں کے عمل کی توثیق وتائید فرمائی اور امت کے انتباہ کے لئے انہیں خبردار

کر دیا کہ اگر وہ اس کے شریعت کی خلاف ورزی پر مبنی حکم کو مان لیتے تو قیامت تک آگ سے باہر نہ نکلتے۔

(صحیح بخاری،۲:۱۰۵۸)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد عامۃ المسلمین کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب فرمایا اور پوچھا: اگر میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے سے منحرف ہوجاؤں تو کیا پھر بھی میرا حکم مانو گے؟ یہ سن کر مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور کمال جرات ایمانی اور بے باکی سے امیر المؤمنین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ''اگر ایسا ہوا تو ہم آپ کو تلوار سے تکلے کی طرح سیدھا کردیں گے۔ اے امیر المؤمنین! آپ کی اطاعت ہم پر اس وقت تک فرض ہے جب تک آپ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت بجالاتے رہیں گے''

پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سریر آرائے تخت خلافت ہونے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

اَطِیۡعُوۡنِی مَا اَطَعۡتُ اللهَ وَرَسُولَهٗ فَاِذَا عَصَیۡتُ اللهَ وَرَسُولَهٗ فَلاَ طَاعَۃَ لِی عَلَیۡکُمۡ

(تفسیر ابن کثیر)

''اے لوگو! اگر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطیع رہوں تو تم بھی میری اطاعت بجا لاؤ اور اگر میں ان کی خلاف ورزی کروں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں۔''

تاریخ اسلام اس قسم کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے لیکن اجتناب طوالت کی وجہ سے صرف ایک واقعہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ عورتوں کے حق مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنا چاہی اور اس سلسلے میں تین سو درہم معینہ حد کے طور پر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک خاتون نے دربار خلافت میں امیر المؤمنین کو ٹوکا اور کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''جس مہر کی حد خدا نے مقرر نہیں کی آپ کو اس کی حد کا تعین کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس خاتون سے پوچھا ''کیا قرآن میں کوئی آیت موجود ہے جس میں حق مہر کی حد لگانے پر قدغن لگائی گئی ہے؟'' اس صحابیہ خاتون رضی اللہ عنہا نے قرآن حکیم سے اپنے دعوی کے اثبات میں اس آیہ کریمہ کا حوالہ دیا:

وَاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدَاهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَأۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡئًا

(القرآن، النساء، ۴:۲۰)

''اور تم اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تب بھی اس میں سے کچھ واپس مت لو۔''

محولہ بالا آیت میں سونے کے ڈھیر کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدائے قدوس کا ہرگز منشا نہیں کہ عورتوں کے معاملے میں حق مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خاتون کے اس استدلال سے لاجواب ہوگئے اور اپنا فیصلہ یہ کہہ کر واپس لے لیا:

اِنَّ اِمۡرَأَةَ اَصَابَتۡ وَرَجُلَ اَخۡطَا

(ابن کثیر، ۱:۳۶۹)

''عورت نے درست کہا اور مرد نے غلطی کی۔''

یہ واقعہ جہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی معاملہ فہمی اور عدل پروری کا مظہر ہے وہاں یہ قانون کی بالادستی کی ایسی بین مثال فراہم کرتا ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنا محال ہے۔

پانچواں اصول

اجتماعیت نماز کا فلسفہ یہ اصول بھی پیش کرتا ہے کہ اگر امام کو اس کی غلطی پر ٹوک دیا جائے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ غلطی کو تسلیم کرلے اور اس کی اصلاح سجدہ سہو

بجا لا کر کرے۔ اس اصول کی تہہ میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ اگر امام ٹوکنے پر اپنی اصلاح نہ کرے گا تو وہ اپنی نماز کو ضائع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مقتدیوں کی نماز کو بھی ضائع کرنے کا باعث بنے گا۔اگر دوران نماز امام کی غلطی کا کسی کو پتہ نہ چلے اور اسے از خود احساس ہوجائے تب بھی اس کے لئے لازم ہے کہ وہ سجدہ سہو کی صورت میں اپنی غلطی کی اصلاح کرے۔ اس لئے کہ امام ارشاد نبوی ﷺ کی رو سے ضامن ہے۔حضور ﷺ نے ارشادفرمایا:

اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ

(ابوداؤد، باب ما یجب علی الامام:۷۰)

''امام ضامن ہوتا ہے (مقتدیوں کا)''

اگر اس سے غلطی ہوجائے تو مقتدیوں کی جماعت اس سے بری الذمہ نہ ہوگی۔ اس اصول کا اطلاق بتمام و کمال ریاست اسلامیہ کے امیر و سربراہ پر بھی ہوگا۔اگر امور مملکت کی بجاآوری میں اس سے غلطی اور کوتاہی واقع ہوجائے تو افراد ملت میں سے کسی کے متوجہ کرنے پر اس کے لئے واجب اور ضروری ہے کہ وہ اس غلطی اور لغزش کی اصلاح کر کے تائب ہوجائے۔ اسی لئے حضور ﷺ کا مبارک فرمان ہے کہ ''جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا جہاد افضل کا درجہ رکھتا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ امراء و قائدین امت کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ وہ مسلمانوں کی عزت و آبرو کے نگہبان و محافظ ہیں۔ روز حساب ان سے باز پرس اور مواخذہ کیا جائے گا آیا انہوں نے اپنے فرائض منصبی ایمان داری سے بجالائے یا ان سے پہلو تہی کی۔ اگر وہ مسلمانوں کی عزت و آبرو سے کھیلنے لگیں تو

چوں کفر از کعبه برخیزد کجا ماند مسلمانی

کے مصداق امت مسلمہ کے حقوق کی پاسداری کا فریضہ کون سر انجام دے گا۔ مملکت اسلامیہ کے امیر و سربراہ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ذات اور اپنے اہل و

عیال کے اخلاق اور سیرت و کردار کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالے، صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور حرام و حلال کی تمیز کو اپنا شعار بنائے بلکہ اصلاح معاشرہ کے لئے تمام تر توجہات اور کوششیں ایسے حالات پیدا کرنے پر مرکوز رکھے کہ صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ تکمیل پذیر ہوجائے جس میں سب کے اخلاق و کردار کی اصلاح وتطہیر کے ساتھ ساتھ نظام صوم وصلوٰۃ برپا ہوجائے۔ اکل حلال کے یکساں مواقع ہر ایک کو میسر آئیں۔ حرام کمائی کے راستے مسدود ہوجائیں۔ امن و امان کا دور دورہ ہو تاکہ ہر ایک آبرومندانہ زندگی گزارے اور امن وسکون کی نیند سوسکے۔

نماز سے حاصل کردہ آخری اصول اس امر کا متقاضی ہے کہ امام اور مقتدی ایک ہی سطح پر کھڑے نظر آئیں اور دونوں میں اونچ نیچ اور عدم برابری کا کوئی تصور باقی نہ رہے امام کے لئے یہ ہرگز روانہیں کہ وہ مقتدیوں سے اپنی حیثیت کو ممتاز (Distinct) کرنے کے لئے ان سے بلند مقام پر کھڑا ہو۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ ایک واقعہ سے بخوبی ظاہر ہے جسے کتب احادیث میں یوں درج کیا گیا ہے۔

ایک دفعہ ایک مشہور صحابی حضرت عمار رضی اللہ عنہ امامت کے لئے اونچی جگہ پر کھڑے ہوئے تو ایک دوسرے صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ انہیں پیچھے سے کھینچ کر مقتدیوں کی سطح پر لے آئے اور کہا ''کیا تمہیں خبر نہیں ہے حضور ﷺ نے امام کو اونچی جگہ کھڑے ہوکر امامت کرانے سے منع فرمایا ہے'' حضور ﷺ کے اس صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنے آقا و مولا کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم کرلیا اور مقتدیوں کے برابر کھڑے ہوکر فریضہ امامت سرانجام دیا۔

اسی اصول کا اطلاق عملی زندگی میں ہوتا ہے۔ اسلام نے انسانی مساوات کا مکمل نمونہ پیش کیا اور اونچ نیچ کے غیر فطری تصورات اور جھوٹے سماجی امتیازات حرف غلط کی طرح مٹادیئے۔ مگر مذاہب عالم کے مقابلے میں اسلام ایک انتہائی انقلابی، آفاقی اور ترقی پسندانہ (Progressive) دین ہے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ خلفائے راشدین، تابعین اور تبع تابعین اور بعد کے ادوار میں بھی ایسے خلفاء، امرا و حکماء امت کی کمی نہ تھی جو اسلامی مساوات کی تعلیم پر عمل پیرا رہے اور ان کی زندگیاں حکیم الامت علامہ

اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر تھیں:۔

در امارت فقررا افزودہ اند
همچو سلمانؓ در مدائن بودہ اند

ان کا رہن سہن اور معیار بود و باش ایک عام انسان کا سا ہوتا تھا۔ خلافت و امارت ان کے لئے وجہ امتیاز نہ تھی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں عمال حکومت کو خطوط لکھے جن میں انہیں بڑی سختی سے سادہ زندگی اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے ایک عام آدمی سے بہتر کھانا کھاتے اور لباس پہنتے ہیں جب کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے بہت سے عمال اور گورنروں کی سرزنش فرمائی اور انہیں تکلف و تعیش سے پاک سادہ زندگی گزارنے کی تلقین فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے دور خلافت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسا لباس زیب تن کئے دیکھا جو صرف پانچ درہم کا تھا۔

(مستدرک حاکم،۳:۹۶)

فلسفہ نماز اور حفظ مراتب

اسلام نے جہاں نماز کے توسط سے بنی نوع انسان کو عملی مساوات کا درس دیتے ہوئے اعلیٰ و ادنیٰ کے سب امتیازات ختم کر دیئے اور محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا وہاں نماز میں صف بندی کرتے وقت حفظ مراتب کو ملحوظ رکھنے کی بھی تعلیم فرمائی۔ اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لیلنی منکم اولو الاحلام والنھی ثم الذین یلونھم

(صحیح مسلم،۱:۱۸۱)

’’تم میں سے وہ شخص میرے قریب نماز میں کھڑا ہوا کرے جو سب زیادہ ذی

فہم اور دانا ہو۔ پھر اس سے متصل دوسرے لوگ کھڑے ہوں۔‘‘

امام کے قریب یمین ویسار (دائیں اور بائیں) صف میں ایسے لوگ کھڑے ہوں جنہیں علم وتقویٰ، زہد و ورع اور عقل و دانائی میں دوسروں پر فضیلت حاصل ہو۔ عملی زندگی میں اس اصول کا اطلاق اس امر کا متقاضی ہے کہ حکام و امراء مملکت کے گرد ایسے اہل الرائے اور صاحب بصیرت افراد موجود ہونے چاہئیں جو انہیں بوقت ضرورت صحیح و صائب مشورہ دینے کی اہلیت و صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اتنی اخلاقی جرات کے بھی مالک ہوں کہ حاکموں کو غلط قدم اٹھانے پر روک ٹوک سکیں۔

مشاورت کی اہمیت وضرورت

ریاستی امور سے عہدہ براء ہونے اور کاروبار مملکت کو بطریق احسن چلانے کے لئے صائب الرائے حضرات کی موجودگی ازبس ضروری ہے کیونکہ یہ لوگ امور مملکت میں مشورہ دینے کی اہلیت وصلاحیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ مشاورت کی اہمیت کا اندازہ تنہا اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب ﷺ کو تصفیہ طلب معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ

(القرآن، ال عمران،۳:۱۵۹)

’’اور (اہم) کاموں میں ان سے مشورہ کیا کریں پھر جب آہستہ آہستہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیا کریں۔‘‘

حضور نبی اکرم ﷺ نے اس ارشاد خداوندی پر عمل کرتے ہوئے غزوہ احد کے موقع پر ایک قابل تقلید مثال قائم کی جب اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سے شہر کے اندر یا باہر جنگ لڑے جانے کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا۔ خود آنحضور ﷺ کی رائے میں شہر کے اندر رہ کر جنگ لڑنا زیادہ قرین مصلحت تھا لیکن صحابہ رضی اللہ عنہ جن میں سے اکثر نوجوان اور نشہ شہادت سے سرشار تھے جنگ شہر کے باہر لڑنے کے حق میں تھے۔

حضور ﷺ نے ان کے مشورہ کو قبول فرمایا اور اس طرح اکثریت کی رائے کا احترام کر کے جمہوریت کا یہ بنیادی اور اساسی تصور پیش کیا کہ اہم قومی و ملی معاملات میں مشاورت انتہائی ناگزیر ہوتی ہے۔

فرد کے حق کی بالادستی کا تصور

اگرچہ اسلام اجتماعی ملی مفاد کو کسی شخص کے ذاتی مفاد پر فوقیت دیتا ہے لیکن جہاں کسی فرد کے ذاتی حق کا معاملہ درپیش ہو وہاں اس کے انفرادی حق کی بالادستی کو احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی توثیق و تائید اس واقعہ سے ہوجاتی ہے جسے روایات میں یوں درج کیا گیا ہے۔

ایک دفعہ بارگاہ مصطفوی ﷺ میں ایک میاں بیوی کا دلچسپ مقدمہ پیش ہوا۔ بیوی جس کا نام بریرہؓ بتایا جاتا ہے اپنے شوہر سے اختلافات کی بناء پر خلع یعنی تنسیخ نکاح پر مصر تھی۔ جب کہ شوہر جس کا نام مغیث تھا اپنی بیوی کی محبت میں اسیر ہونے کی بناء پر اس سے بہرحال رشتہ زوجیت برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ جب حضور ﷺ نے یہ معاملہ دیکھا تو اپنے صحابیؓ کی خواہش کے پیش نظر اس عورت (صحابیہؓ) سے فرمایا کہ وہ اپنے خاوند سے رشتہ زوجیت منقطع نہ کرے۔ اس صحابیہؓ نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا ''آقا! کیا آپ ﷺ مجھے اس بات کا حکم دیتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ہرگز میرا حکم نہیں بلکہ رائے ہے۔ کیونکہ شریعت نے اس ضمن میں خلع کا کلی اختیار تجھے سونپا ہے ۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو مجھے خلع کا حق استعمال کرنے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ اس کا حق تسلیم کیا گیا اور اس کا مہر جو باغ کی صورت میں تھا اس کے شوہر کو لوٹا دیا گیا۔ اس مضمون پر مشتمل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت درج ذیل ہے:

لما خیرت بریرہ رایت زوجھا یتبعھا فی سکک المدینہ و دموعہ تسیل علی لحیتہ فکلم العباس لیکلم فیہ النبی ﷺ لبریرۃ انہ زوجک فقالت تامرنی بہ یا رسول اللہ قال انما انا

شافع قال فخیرھا فاختارت نفسھا و کان عبدالال المغیرۃ یقال لہ مغیث

(مسند احمد بن حنبل، ۱:۲۱۵)

''جب بریرہ کو اختیار دیا گیا تو میں نے اس کے شوہر کو دیکھا کہ وہ مدینہ کی گلیوں میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اور اس کے آنسو داڑھی پر بہہ رہے ہوتے۔ تو حضرت عباس نے حضور ﷺ سے عرض کیا تا کہ حضور ﷺ اس معاملے میں بریرہ سے بات کریں تو حضور ﷺ نے بریرہ کو کہا کہ یہ تیرا شوہر ہے (تو نکاح فسخ نہ کرا) تو اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے یہ حکم دے رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''نہیں میں تو صرف سفارش کر رہا ہوں'' ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اسے اختیار دے دیا تو اس نے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کا شوہر آل مغیرہ کا ایک غلام تھا اور اس کا نام مغیث تھا۔''

جزو چہارم

نماز جامع العبادات و نظام الاوقات

زیرِنظر موضوع اسلامی نظام عبادات میں نماز کے اس فلسفہ وحکمت سے متعلق ہے جو ان دور رس اور گہرے اثرات کا مطالعہ کرتا ہے جو نماز بحیثیت جامع عبادات و نظام الاوقات اجتماعی انسانی معاشرتی زندگی پر مرتب کرتی ہے۔ نماز ایک مکمل اسلامی نظام الاوقات فراہم کرتی ہے جس پر پوری طرح عمل پیرا ہونے سے انسانی معاشرت میں ایک ہمہ جہت انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

کائناتِ ارض وسما کی ہر مخلوق مصروف نماز ہے

اس کائنات پست و بالا میں موجود ہر شے خالقِ موجودات کے نزدیک عبد کا درجہ رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے معمورۂ جہاں میں بسنے والی مختلف النوع مخلوق اپنے اپنے انداز سے خالق و مالک کے حضور مصروف و مشغول عبادت ہے۔اس فعل کو معروف فقہی اصطلاح میں لفظ صلوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔قرآن حکیم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں مذکور ہے:

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ.

(القرآن، النور،۲۴:۴۱)

’’ہر ایک (اللہ کے حضور) اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے۔‘‘

اس ارشادِ باری تعالیٰ کے مطابق ارضی وسماوی کائنات کا ہر وجود (جمادات و نباتات، شجر وحجر، چاند تارے وغیرہ) نماز اور تسبیح وتہلیل میں لگا ہوا ہے اور کوئی بھی ذی روح وغیر ذی روح، ذی شعور اور بے شعور ایسا نہیں ہے، جو اپنے اپنے حال کی مناسبت سے اپنے خالق کے حضور طوعاً وکرہاً عبادت میں مشغول نہ ہو۔

انسان اور غیر انسان کی نماز میں فرق

ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب لفظ صلوٰۃ (نماز) کا اطلاق بشمول انسان علی حالہ ہر مخلوق کی عبادت پر ہوتا ہے تو انسان اور دیگر مخلوقات کی نماز میں کیا فرق ہے؟ اس کا منطقی جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شے فی نفسہ کامل ہو گی تو اس کی نماز بھی کامل ہو گی اور اگر وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ناقص ہوگی تو لامحالہ اس کی عبادت بھی ناقص متصور ہو گی۔ چونکہ انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے ''احسن تقویم'' کے درجے پر فائز ہے اور وہ کائنات میں وجودِ کامل اور مکمل ترین مخلوق ہے، اس لئے اس کو نماز بھی وہ عطا کی گئی جو جملہ عبادات کی جامع ہے۔

کائناتِ اکبر اور کائناتِ اصغر کا تقابل

اس اعتبار سے بہ دقت نظر انسان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھلے گی کہ خالق کائنات نے اس کائناتِ اکبر میں تمام حقائق ومظاہر جو اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ ہر سو منتشر ہیں انسان کے وجود میں اس طرح جمع کر دیئے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں کائناتِ اصغر کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمام خصائص وکمالات جو منتشر حالت میں جملہ عناصر کو ودیعت کئے گئے ہیں، اُنہیں یکجا کر کے انسان میں اس طرح مجتمع کر دیا گیا ہے کہ اس کی ذات جامع کمالات بن گئی ہے۔

کائناتِ اکبر کے عوالم شہادت وغیب

یہ کائنات جس میں ہم سانس لے رہے ہیں اپنے ہیئت مجموعی کے اعتبار سے عالم شہادت اور عالمِ غیب پر مشتمل ہے۔ عالم شہادت سے مراد یہ مادی کائنات ہے جو انسان اور دیگر زمینی مخلوق کا ارضی مستقر ہے، اس کائنات کے مظاہر کا ادراک ہم اپنے حواسِ خمسہ سے کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس عالمِ غیب مافوق الفرش اور مابعد الطبعی حقائق (Meta Physical Realities) کا مجموعہ ہے، جو ذات باری تعالیٰ، جنت، دوزخ،

ملائکہ، انبیاء پر وحی کا نزول وغیرہم اور ان کے متعلقات سے عبارت ہے ۔ ان کا وجود حسی سطح پر انسان کی عقل وفہم سے ماوراء ہے ۔ عالمِ غیب کے بارے میں جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہے، ہماری معلومات کا ذریعہ، واسطہ رسالت و نبوت ہے، اس لئے کہ انسان کی ناقص اور محدود عقل علوم و معارف غیبیہ تک رسائی حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

کائناتِ اصغر (انسان) کے عوالم شہادت وغیب

کائناتِ اکبر کی طرح انسان بھی جو اپنے وجود میں کائناتِ اصغر ہے، عالمِ شہادت اور عالمِ غیب کا مجموعہ ہے۔ اس کا عالمِ شہادت گوشت پوست، اعضا و جوارح اور ان کے اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہے، جس کا علم حسی طور پر انسان کی دسترس میں ہے، جبکہ عالمِ غیب جو اس کی روح سے متشکل ہے، اس کی حقیقت کا علم انسان کے پاس نہ ہونے کے برابر ہے اور وہ اس کی ماہیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

جس طرح کائناتِ اکبر کا عالمِ شہادت، سفلیات زمین اور اس کے متعلقات جیسے دریا، سمندر، پہاڑ اور زمین کے اندر دفن خزانے وغیرہ اور علویاتِ آسمان، چاند، سورج، ستارے، اجرامِ فلکی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ بعینہ انسان کے عالمِ شہادت میں بھی سفلیات اور علویات موجود ہیں۔ اس کا فوقانی حصہ دماغ اور قلب پر مشتمل ہے تو تحتانی حصہ جسم کے اعضاء وجوارح اور ترکیبی اجزاء سے تشکیل پاتا ہے۔

عناصرِ اربعہ اور انسانی جسم کی ترکیب

قدیم حکماء کے مطابق یہ دُنیا عناصر اربعہ، پانی، آگ، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے، جبکہ جدید سائنس کی تحقیق کی رو سے ہر مادی چیز کی اصل اور ابتداء (Origin) پانی سے ہے۔ اس بحث سے قطع نظر ہم جب اس کائناتِ ارضی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کی تشکیل و ترکیب میں عناصر اربعہ میں کسی نہ کسی عنصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انسانی جسم کی ترکیب بھی اس طبعی کائنات (Physical Universe) سے مماثل ہے اور اس

کی تشکیل میں بھی چار عناصر، پانی، آگ، مٹی اور ہوا کا کسی نہ کسی حد تک عمل دخل ہے۔ تناسب کے اعتبار سے مٹی انسان کا جزوِاعظم ہے کہ اس کا خمیر ہی خاک سے اُٹھایا گیا ہے، اس کے جسم کے ہر حصے میں حرارت کی رو دوڑتی نظر آتی ہے بلکہ حقیقت میں انسانی زندگی کا دارومدار ہی اس حرارت غریزی پر ہے۔ جس طرح اس عالمِ طبعی میں سورج کی حرارت سے محروم رہنے والا منطقہ منجمد ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں نمو کا عمل رُک جاتا ہے، اسی طرح انسانی جسم میں حرارت کا خزانہ ختم ہو جائے تو اس کا جسم ساکت و مردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس کرۂ ارضی کا تین چوتھائی حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ زمین کے سینے پر دریا، سمندر، نہریں اور ندی، نالے رواں ہیں۔انسانی جسم میں بھی اسی طرح رطوبتوں کا ایک سیل رواں ہمہ وقت جاری وساری ہے۔ اس کی جلد کے نیچے وریدوں (Veins)اور شریانوں(Arteries) کا ایک جال بچھا ہوا ہے، جس میں دل کو مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔جسم میں کہیں زخم لگ جائے تو خون کا فوارہ پھٹنے لگتا ہے۔ زمین کے اُوپر جس طرح تیز ہوائیں، آندھیاں اور سائیکلون چلتے ہیں، طوفان بادوباراں سے فضا مرتعش ہوجاتی ہے، اسی طرح جسم میں سانس کی آمد ورفت کی وجہ سے ایک ارتعاش بپا رہتا ہے۔ نظامِ تنفس کی بدولت ہوا اندر داخل اور خارج ہوتی رہتی ہے۔ جیسے زمینی موسم یک لخت بدلتا ہے اور گاہے گاہے گرم و سرد ہوا کی روئیں رُک رُک کر چلنے لگتی ہیں۔ بعینہ نظامِ تنفس میں خلل واقع ہو جائے تو جسم بھی اس سے ملتی جلتی کیفیت سے دوچار ہونے لگتا ہے، کبھی حبس دم ہو جائے تو جسم کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور درجہ حرارت یک لخت گر جائے تو جسم سے سرد ہوا نکلنے کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اس ساری بحث کا لبِ لباب یہ ہے کہ کائناتِ اکبر اور انسان کے وجود میں پائی جانے والی کائناتِ اصغر میں کافی حد تک مماثلت نظر آتی ہے اور دونوں کی تشکیل میں کم و بیش ایک جیسے عناصر کی کارفرمائی ہے۔

انسان، عوالمِ غیب و شہادت کا مجموعہ ہے

کائناتِ اکبر کے عالمِ غیب کا مرکز ومحور ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو ایک ازلی، ابدی اور دائمی حقیقت ہے، مگر اس کا وجود غیر محسوس اور غیر مرئی ہونے کی بناء پر چشم کائنات سے مستور ہے۔ اسی طرح انسانی کائنات اصغر کے عالمِ غیب کا مرکز روح ہے جو اگرچہ غیر مرئی ہے اور اس کی حقیقت و ماہیت کا ادراک ممکن نہیں تاہم اس پر زندگی کا دارومدار ہونے کی وجہ سے اس کا وجود ایک اٹل حقیقت ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روح کا عمل دخل نہ رہے تو جسم کا تمام تر نظام جامد وساکت اور بے حرکت ہو کر رہ جائے، انسان اپنی ذات میں چار سو پھیلی ہوئی بسیط کائنات کا ادنیٰ نمونہ (Miniature) ہے۔ اس کے جسم پر ہمہ وقت روح کی حکمرانی عالمِ غیب کی مظہر ہے جبکہ جسم فی نفسہ عالمِ شہادت کا آئینہ دار ہے۔ گویا اس کے اندر عالمِ شہادت کے مظاہر اور عالمِ غیب کے باطنی حقائق اس طرح جمع ہو گئے ہیں کہ اس کا جسم ظاہری مادی حقائق کا مظہر ہے تو اس کی روح باطنی طور پر خالقِ کائنات کے صفات وکمالات کی عکاس ہے۔

جس طرح روح پر جسم کی بقاء کا دارومدار ہے، اسی طرح اس کائنات کے کارخانے کو صرف ایک ہی ہستی چلا رہی ہے اور اس کے باوجود پر اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ تنہا اس کی حمت اور قدرت کاملہ سے اس بسیط وعریض کائنات کا پیچیدہ نظام انتہائی حسن وخوبی اور متوازن واحسن طریقے سے جاری وساری ہے اور اگر وہ اپنی ربوبیت کی توجہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے ہٹالے تو چشم زدن میں سارا کارخانہ حیات ایک عضو معطل ہو کر رہ جائے۔ خُدا کی وحدانیت پر قرآنِ حکیم کی یہ دلیل:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا○

(القرآن، الانبیاء، ۲۱:۲۲)

’’اگر ان دونوں (زمین وآسمان) میں اللہ کے سوا اور (بھی) معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے○‘‘

کتنی بڑی حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اتنی بڑی کائنات کا نظام ایک ہی قادرِ مطلق ذات کے ارادے اور تدبیر سے حرکت پذیر ہے اگر اس کے علاوہ کوئی اور خُدا ہوتا تو یہ سلسلہ ہست وبود کب کا درہم برہم ہو چکا ہوتا جس طرح اس کائنات کے وجود کا انحصار ایک ہی زبردست ہستی کی حکمت تدبر اور ارادے پر ہے اور اس کے بغیر اس کا قائم رہنا ناممکن ومحال ہے، اسی طرح جسم میں ایک ہی روح کی کارفرمائی اور انسانی وجود اسی کے تابع اور زیرِ اثر رہ کر زندہ ومتحرک ہے۔ تو جیسے کائنات میں دو خداؤں کا وجود کائنات کے شیرازہ ہستی کے منتشر ہونے کا موجب بنتا بعینہٖ اگر ایک انسان میں دو روحیں ہوتیں تو اس کی شخصیت کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی۔

جس طرح خُدا کی ذات غیر محسوس اور غیر مدرک ہے اور کوئی آنکھ اسے دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتی اسی طرح کوئی حسی طور پر روح کا ادراک بھی نہیں کر سکتا۔ روح امرِ ربی ہے اور اس کی حقیقت وماہیت کے بارے میں اس سے زیادہ جاننا انسانی عقل و فہم کے لئے ممکن نہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ چمنستانِ عالم کی تمام تر رنگینیاں اور جہان آب وگل کی رونقیں اور رعنائیاں روح کے دم سے قائم ہیں۔ روح اگرچہ انسان کے رگ وپے میں سمائی ہوئی ہے تاہم کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں ہے، کہاں نہیں ہے اور اس کا رنگ کیا ہے؟

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت انسان بہ اعتبار بشریت کائنات کی مادی حقیقتوں کا جامع ہے اور اس کی روح خالق موجودات کے الوہی اوصاف وکمالات کے پرتو کی آئینہ دار ہے۔ اسی بناء پر قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ.

(القرآن، حم السجدہ، ۴۱:۵۳)

''ہم عنقریب ان کو دنیا میں اور خود ان کی ذات میں اپنی (قدرت وحکمت کی) نشانیاں دکھائیں گے۔''

گویا انسانی وجود کی تخلیق اس طرح عمل میں لائی گئی ہے کہ وہ عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کے جملہ حقائق کا مجموعہ ہے اور اس کی ذات اپنے اندر ایک چھوٹی کائنات کا درجہ رکھتی ہے۔

نماز تمام مخلوق کی عبادات کی جامع ہے

چونکہ انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے کامل وجود کا حامل ہے، اسے عبادت کی وہ قسم عطا ہوئی جو تمام ارضی و سماوی مخلوق کی عبادتوں کی جامع ہے۔ نماز کے اندر وہ تمام مظاہر کلی طور پر یکجا کر دیئے گئے جو کائنات بسیط میں ہر جگہ منتشر حالت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ پرند، چرند، حشرات الارض، جمادات و نباتات اور عالمِ بالا کی مخلوق کی جتنی بھی ممکنہ حالتیں ہو سکتی ہیں ان سب کو سمیٹ کر نماز میں رکھ دیا گیا ہے۔ فضاء میں اُڑتے ہوئے پرندے زمین میں چلتے ہوئے وحوش و بہائم اور رینگتے ہوئے حشرات الارض قیام اور رکوع و سجود کی حالتوں کے مظہر ہیں۔ درخت قیام کی حالت میں ہیں تو پہاڑ قعود کی صورت ایک ہی حالت میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ عالمِ بالا میں قدسیان افلاک نماز کی صورت صفیں باندھے مشغول عبادت ہیں۔ غرضیکہ ارض و سماء کی ہر مخلوق اپنے جُداگانہ احوال کی مناسبت سے کسی نہ کسی حالت میں مصروفِ عبادت ہے یہاں تک کہ شمع کے گرد منڈلاتا ہوا ننھا پتنگا بھی بقول شاعر:

گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذت سوز و گداز ہے

نماز اور دوسری عبادات میں فرق و امتیاز

نماز میں انسان جس طرح عاجزی، فروتنی، مسکنت، تذلل اور بے بسی کا پیکر اتم بن جاتا ہے وہ کسی اور عبادت میں ممکن نہیں۔ وہ اپنا چہرہ، ناک اور پیشانی جو اس کی شخصیت کے وقار اور دبدبے کی علامت ہے خاک پر ٹیکتے ہوئے اس بات کا زبانِ حال

سے اقرار کرتا ہے کہ تمام کبریائی ، بڑائی اور عظمت و جبروت کی حقدار وسزاوار خُدا کی ذات بے ہمتا ہے جس کے آگے اس کی حیثیت غایت درجہ پست ، ہیچ اور بے مایہ ہے ۔

نماز تمام عبادات کی جامع ہے

نماز میں شریعت اسلامیہ کی تمام فرض عبادتیں جمع کر دی گئی ہیں اور ان کی سب کیفیات اس میں اس طرح سمو دی گئی ہیں کہ ہر ایک کا رنگ اس میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ۔ مثال کے طور پر روزے کو لیجئے جس میں کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے ہاتھ کھینچ لینے کا انداز پایا جاتا ہے، نماز میں ان سے بدرجہ اتم دست کش ہونے کا قرینہ ملتا ہے، صرف ایک فرق ضرور ہے کہ روزے میں بے نیازی اور شان استغناء جھلکتی ہے جو ایک خُدائی صفت کا پرتو ہے جبکہ نماز سرتاپا نیاز مندی اور عجز وفروتنی کی آئینہ دار ہے ۔

ارکانِ اسلام میں زکوٰۃ انسان کو مال و دولت کی ہوس اور حب زر سے پاک کرکے اس کے اندر تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن پیدا کرتی ہے ، جس کے نتیجے میں خُدا سے محبت و وابستگی کا قلبی تعلق استوار ہوتا ہے ۔ نماز کی حالت میں اس سے بدرجہا اولیٰ انسان خُدا کی ذات کو اپنی الفت ومحبت کا محور ومرکز بنا لیتا ہے اور اس کے دل سے غیر اللہ کا ہر خیال یکسر نکل جاتا ہے تاہم یہ فرق ضرور ہے کہ نماز کے برعکس زکوٰۃ میں خُدا کی شان بندہ پروری اور استغناء کا رنگ ملتا ہے۔

اسی طرح حج میں شعائر اللہ کی تعظیم، اہل وعیال کی محبت، دنیوی مشاغل سے کنارہ کشی اور ترکِ وطن کا سبق ملتا ہے تو نماز میں بھی استقبالِ قبلہ، کعبۃ اللہ کی تعظیم اور مکروہات دُنیا سے کنارہ کشی کا رنگ بغایت درجہ نمایاں ہے ۔ نماز کے کئی افعال بھی حج سے مماثل ہیں، جیسے حج میں دورانِ طواف رفع یدین کیا جاتا ہے تو نماز میں بھی داخل ہونے کے لئے رفع یدین کرنا پڑتا ہے ۔ نماز بھی حج کی طرح متعدد اوراد، اذکار اور وظائف کا مجموعہ ہے ۔

نماز کے علاوہ جتنی بھی عبادات ہیں ان میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ ہر

عبادت محض اس لئے عبادت قرار پائی ہے کہ اس میں حکمِ خُداوندی کی تکمیل کا پہلو مضمر ہے، لیکن نماز کا امتیازی اور منفرد پہلو یہ ہے کہ وہ فی نفسہ عبادت ہے اور اس میں بندے کی بے مائیگی اور خُدا کی عظمت و کبریائی کے آگے بے وقعتی اور تذلیل کا جو احساس بدرجہ اتم پایا جاتا ہے وہ کسی اور عبادت میں نہیں ہے۔

نماز اصل ہے اور باقی تمام عبادات فرع

نماز جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے اپنے اندر تمام عبادات کے مظاہر اور خائص وامتیازات سموئے ہوئے ہے اور بجا طور پر اسے جامع العبادات کا درجہ حاصل ہے، تاہم نماز اور دیگر عبادتوں میں ایک مابہ الامتیاز پہلو یہ ہے کہ جہاں نماز میں ارکان اسلام کے تمام بنیادی اور افادی عناصر بطور جزو کے شامل ہیں نماز کا فی نفسہ بطور جزو کسی رُکن میں شامل ہونا متحقق نہیں۔ اس اعتبار سے تمام عبادات میں نماز کی حیثیت بمنزلہ جڑ (اصل) کی ہے اور باقی عبادتیں اس کے مقابلے میں شاخ (فرع) کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ وہ شخص جس نے ترکِ نماز کو اپنا شعار بنا لیا اور دوسری عبادات میں مشغول رہا اس کی مثال اس ناہنجار شخص کی سی ہے جس نے درخت کی جڑ کو کاٹ کر پھینک دیا اور محض شاخوں کے بناؤ سنگھار میں لگا رہا۔ یہ بات کسی بھی صاحبِ عقل وہوش سے پوشیدہ نہیں کہ جڑ کی بقاء اور استحکام پر درخت کی بقاء اور سلامتی کا انحصار ہے اور اگر جڑ ہی سلامت نہ رہی تو درخت کے ساتھ اس کی شاخوں کی سلامتی بھی معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔

نماز کی بنیادی اور اساسی حیثیت کے پیش نظر یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ کوئی بھی عمل اللہ کی بارگاہ میں اس وقت تک مقبول نہیں جب تک اس کے ساتھ نماز کی سند قبولیت شامل نہ ہو۔اسی لئے سرکارِ دوجہاں ﷺ نے نماز کی بنیادی اہمیت بیان کرتے ہوئے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

الصلوة عماد الدين

(منہاج الصالحین:۱۵۰)

''نماز دین کا ستون ہے۔''

اس ارشادِ مصطفوی ﷺ کی روشنی میں اس شخص کا عمل جس نے نماز ترک کر کے روزہ رکھا خود کو بھوکا پیاسا رکھنے کے مترادف ہو گا۔ اس طرح تارک نماز چاہے لاکھ زکوٰۃ صدقہ و خیرات اور حج ادا کرے اس کا عمل اخروی اجر و ثواب کا مستحق نہیں ٹھہرایا جائے گا اور روزِ حساب یہ سارے اعمال اس کے منہ پر مارے جائیں گے۔

نماز جامع اوقات بھی ہے اور نظام الاوقات بھی

تمام عبادات میں تنہا نماز ہی ایک ایسا منفرد عمل ہے جو شب و روز کی کسی نہ کسی ساعت سے متعلق ہونے کی بناء پر ایک باقاعدہ نظام الاوقات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اوقات نماز دن اور رات کے تمام اوقات کے جامع ہیں اور ہر نماز فرضیت کے اعتبار سے مقررہ اوقات کے تابع کردی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا

(القرآن، النساء، ۴:۱۰۳)

''بے شک نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے حساب سے فرض ہے۔''

نمازیں ایک باضابطہ اور مربوط نظام الاوقات کے تابع ہیں جس کی رو سے دن رات کے چوبیس گھنٹے میں ہر نماز کے لئے ایک وقت مقرر ہے جس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ نماز متصور ہوگی ورنہ اس کی قضا لازم آئے گی۔

دن اور رات کی ہر ساعت ایک خاص رنگ و آہنگ اور تاثیر لئے ہوئے جس کا پرتو اس ساعت کے اندر رکھی جانے والی نماز میں جھلکتا نظر آتا ہے مثلاً رات کے سکون و آرام کے بعد جب انسان صبح صادق کے وقت بیدار ہوتا ہے تو اس کی طبیعت میں تازگی، بشاشت اور شگفتگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے چنانچہ نماز فجر کا ہنگام اپنے دامن میں سحر کی کیف و سرور آور کیفیات جذب کئے ہوتا ہے۔

نماز فجر اور نماز ظہر کے درمیان کم و بیش آٹھ گھنٹے کا وقفہ حائل ہے۔ یہ وقت

کام کاج اور محنت و مشقت کا ہوتا ہے جس کے بعد قدرتی طور پر انسان کی طبیعت میں کسل مندی اور تھکن پیدا ہوجاتی ہے اسے دور کرنے کے لئے وقت کے اس دامن میں نماز ظہر کو رکھ دیا گیا ہے تاکہ نماز کی ادائیگی کے بعد انسان کو کھانا کھانے اور ستانے کا موقع میسر آسکے۔

دوپہر کے کھانے اور اس کے قیلولہ کرنے سے طبیعت میں جو کسالت اور سستی پیدا ہوجاتی ہے اس کا اثر زائل کرنے کے لئے سہ پہر کا وقت نماز عصر کے لئے مخصوص کردیا گیا۔

نماز عصر کے بعد جب سورج مغرب کی سمت اپنا سفر مکمل کرنے کے لئے شفق کی سرخی میں غرق ملگجی سائے زمین پر پھیلا دیتا ہے اور دن اپنے اجالے سمیٹ کر رخصت ہونے لگتا ہے تو انتقال وقت کے اس سنگم اور نقطہ اتصال پر مغرب کی نماز رکھ دی گئی۔

پھر جب رات کی تاریکی پھیلنے لگتی ہے اور انسان دن بھر کی تکان اور ماندگی کو دور کرنے کے لئے بستر خواب پر دراز ہونے کی تیاری کرنے لگتا ہے تو وقت کی اس ساعت کو نماز عشاء سے منسلک کردیا گیا۔ نماز عشاء کا وقت پو پھٹنے یعنی سپیدہ سحر نمودار ہونے سے قبل تک رہتا ہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد فجر کا وقت نیند اور راحت و آرام کے لئے وقف کردیا گیا ہے اس دوران اگرچہ شریعت اسلامیہ نے کسی کو شب بیداری کا مکلّف نہیں ٹھہرایا تاہم رات کے پچھلے پہر نیند اور آرام چھوڑ کر نماز تہجد کے لئے اٹھنا بے پایاں اجر و ثواب کا حامل ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو یاد الٰہی کی حلاوت اور لذت سے آشنا ہوتا ہے۔

اسلامی نظام الاوقات کے بارے میں امت مسلمہ کا عمومی طرز عمل

اوپر گزرنے والی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی، دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے دوران ادا کی جانے والی نمازوں پر مبنی نظام الاوقات کے تابع ہے۔ ان کے شب و روز کے احوال و معاملات کا ایک باقاعدہ اور

باہمی مربوط اسلامی نظام الاوقات کے سانچے میں ڈھلا ہونا لازمی و بدیہی امر ہے لیکن جب ہم بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کی شبانہ روز زندگی کے احوال کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں اور ان کا غیر مسلموں کے معمولات زیست سے موازنہ کرتے ہیں تو بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے اور غیر مسلموں کے نظام الاوقات میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ ہمارے اجتماعی عمومی طرز عمل میں الا ماشاء اللہ اسلامی نظام الاوقات سے ہم آہنگی اور مطابقت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ نام نہاد مسلمانوں کے گھروں میں اکثر افراد خانہ رات گئے تک کلبوں، سینما گھروں اور دیگر عشرت گاہوں میں سرگرداں رہتے ہیں یا اپنی زندگی کے قیمتی لمحات ٹی وی اور وی سی آر کے مخرب الاخلاق اور فحش وعریاں پروگرام دیکھنے میں ضائع کرتے ہیں ان کی شبانہ روز زندگی کے معمولات میں نماز، روزہ نام کی کوئی چیز نہیں آتی۔

حرف آخر

امت مسلمہ پر یہ انفرادی اور اجتماعی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے معمولات زیست کو اسلامی نظام الاوقات کے سانچے میں ڈھالے۔ مسلم معاشرہ کے ہر فرد کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے روز مرہ احوال و معاملات منضبط کرتے وقت نمازوں کے اوقات کا خیال رکھے اور حتی الامکان کوئی نماز قضا نہ ہونے پائے۔

پابندی کے ساتھ نمازوں کی ادائیگی پر مبنی اسلامی نظام الاوقات جو شریعت مطہرہ نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے بشری فطری تقاضوں اور طبعی میلانات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ اس میں نمازوں کے اوقات بالالتزام اس طرح رکھے گئے ہیں کہ افراد ملت کو عبادت کے ساتھ کسب معاش کے مواقع بھی فراہم ہوتے ہیں اور اجتماعی سطح پر معاشی ترقی اور ملکی مسائل کے حل کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔

فجر اور ظہر کی نمازوں کے درمیانی طویل وقفے میں زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کے لئے جسمانی اور دماغی محنت اور ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر حلال

ذرائع سے روزی کمانے کے خاصے مواقع میسر ہیں۔ اس پر مستزاد دوسری نمازوں کے دورانیوں میں ہر قسم کے تعمیری اور بامقصد کام کے لئے گنجائش موجود ہے۔ اسلام نے فارغ الوقتی میں کسی جائز کام کرنے پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ اسلام دین فطرت ہے جو توازن و اعتدال کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ۔ وہ محض عبادات پر ہی زور نہیں دیتا بلکہ اس میں ہمہ جہت معاشی ترقی اور ملکی مسائل کے حل کی راہیں ہمہ وقت کشادہ ہیں۔

اسلامی نظام الاوقات کی پابندی کے باب میں ہماری تاجر برادری اور کاروباری حلقوں کو اپنے دن رات کے اوقات اس طرح تقسیم کرنا چاہئیں کہ پنجگانہ فرض نمازوں کی ادائیگی ان کی فطرت ثانیہ بن جائے۔رات گئے مارکیٹوں اور کاروباری اداروں کو کھلا رکھنا اور دن چڑھے اٹھنا شریعت اسلامیہ کے مقرر کردہ نظام الاوقات سے پہلو تہی کے مترادف ہے۔ ہمارے تجار، آجرین، کاروباری اور ملازم پیشہ افراد کو جو غفلت اور لاپرواہی کی بنا پر اسلامی نظام الاوقات کے تقاضوں کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں اپنے معمولات اس طرح بدلنے چاہئیں کہ ان سے کاروباری و معاشی مشاغل اور عبادت و طاعت کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے۔ انہیں ہادی برحق ﷺ کا یہ قول مبارک حرز جاں بنالینا چاہیے کہ ہر مسلمان کے لئے نماز فجر کے بعد روزی کی تلاش میں نکلنا فرض و واجب ہے تاکہ اس کے رزق میں تنگی نہ واقع ہونے پائے۔

جزو پنجم

نماز کا فلسفہ معراج

راہ طریقت میں روحانی سفر کا نقطہ آغاز جو ہر سالک کے لئے اصل الاصول اولیں ضابطے اور عمومی کلیے کا حکم رکھتا ہے ثابت قدمی، استقامت اور عزم صمیم سے کتاب و سنت پر مبنی احکامِ الٰہیہ کی پیروی ہے جسے اہل تصوف ''کتاب و سنت کی ملازمت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یوں تو قرآن و سنت سے ماخوذ شریعت مطہرہ کا ہر حکم اہل طریقت کے لئے واجب الاطاعت ہے اور سب احکام الٰہی کی اطاعت و پیروی واجب ہے تاہم راہ صفا کے سالک کے لئے عزم سفر باندھنے سے پہلے جس قدر اہمیت نماز کو حاصل ہے وہ کسی اور عمل کو نہیں اور جتنے روحانی فیوض و برکات اور فوائد و ثمرات تنہا عمل نماز کے اندر پوشیدہ ہیں وہ کسی اور عمل کے اندر نہیں۔

قرآن حکیم میں باری تعالیٰ نے اسی (۸۰) سے زیادہ مقامات پر نماز کا حکم بڑی صراحت کے ساتھ صادر فرمایا ہے لیکن ایک مقام پر حکم نماز کا ذکر انتہائی حکمت آموز پیرایہ اور اچھوتے انداز سے کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اِقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکَ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ

(القرآن، الاسراء، ۷۸:۱۷)

''آپ سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز قائم فرمایا کریں۔''

قرآن حکیم میں اور جتنے بھی مقامات پر حکم نماز وارد ہوا ہے وہ اکثر و بیشتر ''اقیموا الصلٰوۃ'' کے الفاظ میں ہے جو عربی قواعد کے مطابق امر صیغہ جمع ''تم نماز قائم

کرو‘‘ کے معنی کا حامل ہے۔یعنی نماز ادا کرنے کا حکم اجتماعی سطح پر جمیع امت کے لئے ہے۔لیکن متذکرہ صدر آیہ کریمہ میں نماز کا حکم دیتے ہوئے امر صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ حکم نماز کے باب میں باری تعالیٰ کی طرف سے براہ راست حضور نبی اکرم ﷺ سے خطاب فرمایا گیا ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ تو نماز قائم کر۔ گویا نماز کا پہلا سبق سرور دو عالم ﷺ کو دیا گیا۔

اس آیہ مقدسہ میں دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اوقات نماز کا حکم **لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ** ’’غروب آفتاب سے رات کے چھا جانے تک‘‘ کے الفاظ میں مذکور ہے جس میں مغرب اور عشاء کی دو نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ نماز کا آغاز غروب آفتاب سے کرنے میں کیا حکمت کارفرما تھی۔ عقلی و منطقی استدلال کی رو سے اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اسلامی قمری تقویم (Lunar Calendar) میں دن کا آغاز طلوع آفتاب سے نہیں بلکہ غروب آفتاب سے ہوتا ہے اس لئے نمازوں کے نظام الاوقات کا آغاز اختلاف لیل و نہار کی مناسبت سے غروب آفتاب کے وقت سے کیا گیا ہے۔

الصلوٰۃ معراج المؤمنین

جملہ عبادات میں نماز ہی تنہا ایسا عمل ہے جسے آقائے دوجہاں ﷺ نے اہل ایمان کی معراج قرار دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضور ﷺ کی ذات ستودہ صفات کو نماز سے بے پناہ شغف اور رغبت تھی۔ اس کا ذکر حدیث مبارکہ کے ان الفاظ سے بخوبی مترشح ہے:

وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ

(مسند امام احمد، ۳:۱۲۸۔۲۸۵)

(شفاء، ۱:۱۲۰)

’’میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔‘‘

نماز کو آنکھ کی ٹھنڈک قرار دینا ایک بلیغ اور پرمعنی استعارہ ہے۔ عام روز مرہ بول چال میں کوئی اپنی اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک گردانتا ہے اور کوئی دنیا کی کسی اور پیاری چیز کو مرغوب جانتا ہے۔ لیکن ہمارے آقا و مولا علیہ التحیہ والثناء نے اپنے لئے سب سے زیادہ محبوب اور راحت آفریں چیز نماز کو قرار دیا ہے۔ اس مضمون پر متعدد روایات دلالت کرتی ہیں کہ گاہے گاہے حضور ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے شفقت آمیز انداز اور محبت بھرے لہجے میں فرمایا کرتے تھے:

یا بلال ارحنا بالصلٰوۃ

(مسند احمد بن حنبل، ۵: ۶۳۹۴: ۳۷۱)

''اے بلال رضی اللہ عنہ (اذان پڑھ کر) نماز کے ساتھ ہمیں راحت پہنچایئے۔''

اس سے یہ حقیقت بڑی واضح ہے کہ حقیقی کیف و سرور، فرحت و انبساط اور روحانی لذت حاصل کرنے کا نماز سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ یہی سبب ہے کہ نماز کو آقائے دوجہاں ﷺ نے مومنوں کی معراج قرار دیا ہے۔ معراج بلاشبہ حضور ﷺ کے خصائص کبریٰ میں سے ہے۔ آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی جس میں نماز کو اہل ایمان کے لئے معراج فرمایا گیا ہے۔ معنویت کے اعتبار سے بے شمار حکمتوں کا حامل ہے۔

لطائف خمسہ اور ان کی معراج

علماء ربانی اور عرفائے کاملین نے نماز کے تصور معراج کو ان لطائف خمسہ کے حوالے سے اجاگر کیا ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت انسان کو ودیعت کئے گئے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت ہر ایک پر منکشف نہیں اور اس کا ادراک ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ پانچ لطائف بالترتیب لطیفہ قلب، لطیفہ روح، لطیفہ سر، لطیفہ خفی اور لطیفہ اخفیٰ ہیں۔ جب حضور ﷺ کو معراج سے سرفراز فرمایا گیا تو یہ پانچوں لطائف بھی معراج سے ہمکنار ہوئے۔ اس معراج کی نوعیت و کیفیت کے بارے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہر لطیفے کا اپنا مقام سے بلند ہوکر اگلے لطیفے کے مقام تک رسائی حاصل کر لینا اس کی معراج تھا۔

نفس اور اس کے مقامات

عام انسان کے اندر موجود نفس کو نفس امارہ سے موسوم کیا گیا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ

(القرآن، یوسف، ۱۲:۵۳)

''بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے۔''

گویا بنیادی طور پر انسان کے خمیر میں ودیعت کردہ نفس امارہ اس مادے سے تیار کیا گیا ہے جو اسے گناہ، نافرمانی اور فسق و فجور کی طرف راغب اور آمادہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن اللہ کے برگزیدہ بندے اس سے مستثنٰی ہیں۔ ان کا نفس مسلسل مجاہدہ، عبادت و ریاضت اور تقویٰ کی بدولت آلائشوں اور علائق دنیوی کے رذائل سے پاک ہوکر نفس ملہمہ میں بدل جاتا ہے۔ یہ مقام ان بندگان حق کو نصیب ہوتا ہے جو نفس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ پھر ان میں کچھ نفوس قدسیہ وہ بھی ہیں جو نفس ملہمہ سے بلند تر درجے...... نفس لوامہ تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور اس سے بھی آگے نفس راضیہ اور نفس مرضیہ کے ارتقائی مدارج طے کر لینے کے بعد نفس کاملہ کی منزل پر فائز ہوجاتے ہیں۔

عام انسان اور جناب رسالتمآب ﷺ کے نفس میں فرق

حقیقت امری کے تحت مشیت ایزدی نے ہر انسان کے اندر نفس ودیعت کردیا ہے۔ اس اعتبار سے چونکہ نبی اکرم ﷺ کو اس جہان رنگ و بو میں لباس بشریت میں جلوہ گر فرمایا گیا ہے۔ تکمیل بشریت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آپ ﷺ کو بھی نفس عطا کیا گیا۔ لیکن ایک عام انسان اور انسان کامل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نفس میں یہ فرق ہے کہ جہاں اول الذکر کی خلقت نفس امارہ کی حالت میں ہوئی جو شیطان کی آماجگاہ ہے وہاں حضور ﷺ کے نفس کو ابتداء ہی سے نفس کاملہ کے درجے پر فائز کردیا گیا۔ اس

ضمن میں آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی لائق توجہ ہے:

عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ ما منکم من احد الا وقد و کل بہ قرینہ من الجن و قرینہ من الملائکۃ قالوا، و ایاک یا رسول اللہ قال و ایای ولکن اللہ اعاننی علیہ فاسلم فلا یامرنی الا بخیر

(مسند امام احمد، ۱:۳۵۸)

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر آدمی کے ساتھ ایک جن (شیطان) اور ایک فرشتہ مقرر ہے۔ صحابہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا۔ ہاں میرے ساتھ بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی پس وہ مسلمان ہوگیا ہے لہٰذا وہ مجھے صرف نیکی کا حکم دیتا ہے۔''

یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک عام انسان کا نفس مسلسل مجاہدہ و ریاضت کے عمل سے ارتقائی مراحل طے کر کے نفس کاملہ کے درجہ تک رسائی حاصل کر پاتا ہے۔ مگر حضور ﷺ کے نفس کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے جس کی تخلیق ہی نفس کاملہ کے درجے پر ہوئی۔

ایک بندہ حق نفس کی ساری مہمات سر کرنے کے بعد نفسانی خواہشات کی آلائشوں سے پاک و صاف ہوکر اس مقام تک رسائی حاصل کرلیتا ہے جہاں وہ اپنے رب سے اور اس کا رب اس سے راضی ہوجاتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ کوئی بھی اللہ کا بندہ اور ولی مسلسل مجاہدے، مشقت و ریاضت سے ترقی کر کے نفس کے ارتقائی مقامات تک رسائی تو حاصل کرلیتا ہے مگر اس کا ایمان اس وقت اپنے کمال کو پہنچتا ہے جب اسے نفس کاملہ کے مقام پر فائز کر کے بارگاہ ایزدی سے مژدہ جانفزا سنا دیا جاتا ہے:

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○

(القرآن، الفجر، ۸۹:۲۹۔۳۰)

’’پس تو میرے (کڑیل) بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنت (قربت و دیدار) میں داخل ہو جا۔‘‘

سرورِ کائنات ﷺ کے نفس کاملہ کی معراج

حضور نبی اکرم ﷺ کے نفس کاملہ کو بھی معراج سے سرفراز فرمایا گیا ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ کا نفس پہلے نفس کاملہ کے مقام پر تھا تو پھر اسے معراج کے ذریعے کون سے اگلے مقام تک پہنچانا مقصود تھا؟ علماء و عرفاء کاملین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب آنحضور ﷺ کی بشریت کو معراج ہوئی تو آپ ﷺ کا نفس کاملہ مقام قلب پر فائز کر دیا گیا جس کے بعد آپ ﷺ کا قلب اطہر ذات باری تعالیٰ کے انوار و تجلیات کا مہبط اور مصدر کلام ربانی ہو گیا۔

لطائف خمسۂ مصطفوی ﷺ کی معراج

حضور ﷺ کے نفس کاملہ کو معراج کرائی گئی تو آپ ﷺ کے پانچوں لطیفے (لطائف خمسہ) بھی معراج سے بہرہ ور ہوئے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

لطیفۂ قلب کی معراج

آنحضور ﷺ کے لطیفہ قلب کو معراج نصیب ہوئی تو اسے لطیفہ روح کے مقام تک رسائی حاصل ہوگئی۔ یعنی معراج کے ذریعے آپ ﷺ کے قلب انور کو وہ منزل عطا ہوئی جس پر آپ ﷺ کی روح پاک متمکن تھی۔ اس سے آپ ﷺ کا سینہ عشق الٰہی کا گنجینہ بن گیا اور آپ ﷺ کے قلب مبارک کا حال اس بحرِ بے کراں کا سا ہو گیا جس میں عشق حقیقی کی موجیں ہمہ وقت متلاطم رہتی ہیں۔

لطیفۂ روح کی معراج

حضور اکرم ﷺ کے لطیفہ روح کو معراج ہوئی تو اسے لطیفہ سر کے مقام تک

رسائی حاصل ہوگئی جو باری تعالیٰ کے مقام مظہریت اور اس کی ذات و صفات کا مظہر و عکاس ہے اس معراج کے توسط سے آپ ﷺ کو مظہریت حق کے رنگ میں اس طرح رنگ دیا گیا کہ آپ ﷺ کی روح پاک ذات و صفات الٰہیہ کا مظہر اتم بن گئی۔

لطیفۂ سر کی معراج

لطیفہ سر کی معراج اس کے لطیفہ خفی تک عروج کا ذریعہ تھا۔ چونکہ لطیفہ خفی کا مقام قرب ذات الٰہیہ کے جلوؤں سے معمور ہے اس لئے حضور ﷺ کے لطیفہ سر کو معراج کرا کے تجلیات الٰہیہ سے مستفیض ہونے کے قابل کر دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ کو قرب و وصال کی وہ منزل نصیب ہوئی کہ آپ ﷺ قاب قوسین کے مقام سے سرفراز ہوگئے جہاں محبّ و محبوب کے درمیان حسب ارشاد ربانی صرف دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا:

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى

(القرآن، النجم،۵۳:۹)

''پھر (یہاں تک بڑھے کہ) صرف دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔''

لطیفۂ خفی اور اخفیٰ کی معراج

مقام قاب قوسین پر حضور اکرم ﷺ کو قرب کا وہ درجہ نصیب ہوا کہ اس سے زیادہ قرب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ذریعے آپ ﷺ کے لطیفہ خفی کو معراج ہوئی جسے خفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت و ماہیت عالم بشریت اور عالم روحانیت کے کسی فرد پر آشکار نہیں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا ایک قول اس مقام کے بارے میں بایں الفاظ منقول ہے:

يقول ابو يزيد: غصت لجة المعارف طالبا للوقوف على عين حقيقة النبی ﷺ فاذا بينی و بينها الف حجاب من نور لو دنوت من الحجاب الاول لا حترقت به كما تحترق الشعر اذا القيت فی النار

(جواہر البحار، ۳:۵۱)

''حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے معرفت کے سمندر میں غوطہ لگایا تاکہ حقیقت مصطفوی ﷺ تک کچھ رسائی حاصل کرسکوں کہ اچانک میں نے اپنے اور حقیقت مصطفوی ﷺ کے درمیان ایک ہزار نور کے پردوں کو حائل پایا۔ میں اگر پہلے پردے کے قریب جانے کی بھی جسارت کرتا تو یوں جل جاتا جس طرح بال آگ میں ڈالنے سے راکھ ہوجاتا ہے۔''

لطیفہ خفی کے بعد آپ ﷺ کے لطیفہ اخفی کو معراج نصیب ہوئی جس کے ذریعے سرکار دوجہاں ﷺ کو ذات حق کے بے حجاب دیدار اور کلام کی نعمت سے نوازا گیا۔قرآن حکیم اس کا تذکرہ انتہائی بلیغ اور دلنشیں انداز میں یوں فرماتا ہے:

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی

(القرآن، النجم،۵۳:۱۷)

''نہ نگاہ جھپکی نہ حد سے بڑھی۔''

اس مقام پر سارے حجابات مرتفع کردیئے گئے اور صاحب معراج ﷺ اور حق تعالیٰ کے مابین کوئی پردہ حائل نہ رہا۔ پھر وہ عالم تھا کہ حضور ﷺ کی نگاہیں ذات باری تعالیٰ کے بے حجابانہ دیدار اور گوش مبارک محبوبانہ کلام سے محفوظ ہو رہے تھے اس کیفیت کو قرآن حکیم یوں بیان فرماتا ہے:

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ

(القرآن، الاسراء، ۱۷:۱)

’’بے شک وہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔‘‘

اس بے حجاب دیدار اور سماعت کلامِ حق کی حقیقت و ماہیت کیا تھی؟ اسے محبّ اور محبوب کے سوا تیسرا کون جان سکتا ہے؟

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین راھم خبرنیست

معراج اور تحفہ نماز

معراجِ مصطفیٰ ﷺ تکمیل کو پہنچ چکی تو وہ لمحہ آیا جب حضور ﷺ کو عالم لاہوت وملکوت سے عالم ارضی کی طرف مراجعت فرمانا تھی۔ محبوب حقیقی سے انتہائی قرب و وصال کے بعد جدائی کا تصور فطری طور پر حضور ﷺ کے لئے اضطراب کا باعث بنا۔ وصل کی لذتوں اور حلاوتوں سے سرشار ہونے کے بعد آنے والے ہجر وفراق کے لمحات کا طبع مبارک پر گراں گزرنا ایک فطری بات تھی۔ اس لئے آپ ﷺ نے بارگاہ ایزدی میں التجا کی کہ باری تعالیٰ! ان قرب و وصال کی نعمتوں کی محرومی کا کچھ مداوا ہونا چاہئے تو جواب ملا کہ اے محبوب ﷺ! ہم ان کیفیات لا یزال سے آپ کو محروم نہیں کرنا چاہتے اس لئے آپ کو الوداع کہتے ہوئے ہم ایک ایسا تحفہ عطا کر رہے ہیں جو عالم دنیا میں ہجر وفراق اور اضطراب کو وصلِ محبوب کے راحت وسکون میں بدل دے گا۔ یہ تحفہ تیری امت کے لئے بھی ہے کہ اگر وہ معراج کی کیف و سرور آگیں لذات سے آشنا ہونا چاہے گی تو اسے بھی یہ کیفیت نماز کے ذریعے نصیب ہوجائے گی۔ لیکن اس معراج المؤمنین تک رسائی حاصل کرنے کے لئے محنت اور تگ و دو کرنا پڑے گی کہ یہ مقام سعی پیہم کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔

معراج المؤمنین کی مصداق نماز بندہ و خالق کے درمیان ایسا تعلق بندگی استوار کرنے کا موجب بنتی ہے جس سے سب حجابات اٹھ جاتے ہیں اور قرب و وصال کی لذتیں نصیب ہونے لگتی ہیں۔ اس مقام پر عاشق ربانی کو نماز کے علاوہ اور کسی چیز میں قرار

نہیں ملتا۔ یہ مقام ہر اللہ کا بندہ حاصل کرسکتا ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ نماز کو کمال خشوع وخضوع اور استغراق ومحویت کی کیفیت میں ڈوب کر ادا کیا جائے کہ اس طرح یہی نماز بندے کے لئے معراج کا پیش خیمہ بن جائے گی۔

نماز اور ابواب جنت کا کھلنا

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ جب کوئی بندہ نماز میں داخل ہوتا ہے اور اسے پورے تقاضوں کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس پر یہ آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ احادیث مبارکہ میں اس کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے یہاں اس کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

باب المعرفۃ (پہلا دروازہ)

نماز میں داخل ہوتے ہی جب بندہ کلمات ثناء اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اس پر پہلا دروازہ ''باب معرفت'' کھول دیا جاتا ہے جس سے اسے معرفت الٰہی کا خزانہ عطا کردیا جاتا ہے۔

باب الذکر (دوسرا دروازہ)

جب بندہ زبان سے تسمیہ کلمات (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) ادا کرتا ہے تو جنت کا دوسرا دروازہ جو باب الذکر سے موسوم ہے کھل جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ بندہ ذکر الٰہی کی نعمتوں کا حق دار بن جاتا ہے۔

باب الشکر (تیسرا دروازہ)

بندہ جب ''**الحمد للہ رب العالمین**'' کے کلمات پر پہنچتا ہے تو اس کا دل احساس تشکر و امتنان سے مغلوب ہوجاتا ہے اور وہ بارگاہ ایزدی میں اس بات کا اعتراف و

اقرار کرلیتا ہے کہ وہ ذات بے ہمتاہی تمام تعریفوں کی سزاوار ہے تو اس بندے پر باب الشکر کھول دیا جاتا ہے۔

باب الرجاء (چوتھا دروازہ)

جب بندہ ''**الحمد**'' کے بعد ''**الرحمن الرحیم**'' کےکلمات زبان پر لاتا ہے تو باری تعالیٰ اپنے فرشتوں کوحکم دیتے ہیں کہ میرا بندہ میری بے پایاں رحمتوں کا ذکر کر رہا ہے۔اس لئے اس پر باب الرجاء کھول دیا جائے۔

باب الخوف (پانچواں دروازہ)

جب بندہ قلب و روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر'' **مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْن**'' کے الفاظ زبان سے ادا کرتا ہے تو گویا وہ خود کو ایک ملزم کی طرح سب سے بڑے بادشاہ کے دربار میں پیش کردیتا ہے۔خوف خدا سے لرزہ بر اندام ہوکر جب وہ احساس جرم سے مغلوب ہوجاتا ہے تو رحمت پروردگار فرشتوں کو ندا دیتی ہے کہ میرے اس بندے پر''باب الخوف'' کھول دیا جائے تاکہ خشیت الٰہی کی وجہ سے وہ میری رحمتوں سے نوازا جاسکے۔

باب الاخلاص (چھٹا دروازہ)

''**اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ**'' کہہ کر جب بندہ خدا کی بندگی کا اقرار کرتا ہوا اس سے استعانت کا طلب گار ہوتا ہے تو اس پر''باب الاخلاص'' کھول دیا جاتا ہے۔ جس سے اسے خالق حقیقی کی معرفت میں اخلاص نصیب ہوجاتا ہے۔

باب الدعاء (ساتواں دروازہ)

جب بندہ ''**اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم**'' پر پہنچ کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سیدھی راہ پر چلنے کی ہدایت کا خواستگار ہوتا ہے تو فرشتوں کو جنت کا ساتواں دروازہ

’’باب الدعاء‘‘ کھول دینے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

باب الاقتداء (آٹھواں دروازہ)

آخر میں جب بندہ ’’ وَلَا الضَّالِّيْنَ‘‘ تک پہنچتا ہے اور منعم حقیقی سے اس کے انعام یافتہ بندوں کے زمرے میں شریک ہونے کا طلب گار ہوتا ہے اور ان لوگوں سے بریت کا اظہار کرتا ہے جو ضلالت و گمراہی کی وجہ سے اس کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے تو فرشتوں کو جنت کے آخری دروازے ’’باب الاقتدا‘‘ کو کھولنے کا حکم دے دیا جاتا ہے اور اس طرح اس کی نماز معراج کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔

نماز اور حجابات کا اٹھنا

نماز کی بدولت بندہ و خالق کے درمیان حجابات کیسے اٹھا دیئے جاتے ہیں اس مضمون پر ایک حدیث مبارکہ دلالت کرتی ہے۔ جب بندہ کمال یکسوئی، محویت و استغراق سے نماز ادا کرتا ہے تو وہ خدا کی یاد میں اتنا مگن ہوتا ہے کہ اسے دنیا و ماسوا کی ہر چیز بھول جاتی ہے۔ باری تعالیٰ اپنے اس بندے پر ناز کرنے لگتے ہیں اور فرشتوں کو حکم دے دیا جاتا ہے کہ میرے اور اس کے درمیان سب پردے اٹھا دیئے جائیں تا کہ وہ بندہ جس نے میری نماز کا حق ادا کر دیا ہے، میری نعمتوں سے بہرہ ور ہو جائے۔

اس کے برعکس جب اللہ کا بندہ نماز میں یادِ الٰہی میں مستغرق ہونے کی بجائے غیر اللہ کی یاد کا اسیر بن جاتا ہے تو فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ چونکہ وہ بندہ میری یاد سے غافل ہوکر دنیا و مافیہا کی محبت میں محو ہو گیا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان پردے حائل کردو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ نماز میں اللہ اور بندے کے درمیان تعلق عبودیت یکسوئی، انہماک و استغراق اور محویت سے استوار ہوتا ہے اور یادِ الٰہی میں اضافہ کے ساتھ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے جب کہ ان کیفیات کا فقدان اس تعلق کو کمزور کر دیتا ہے۔

صلحاء و پاکان اُمت کے معمولات

اللہ کے برگزیدہ اور صالح بندوں کے معمولات بندگی کے باب میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو خشیت الٰہی سے ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے، چہرہ متغیر ہوجاتا اور رنگ زرد پڑ جاتا۔ وہ اس عاشق زار کی طرح جو وصل محبوب کے انتظار میں گھڑیاں گن گن کر گزارتا ہے یک گونہ وارفتگی اورسوز و گداز کا پیکر بن جاتے اور وصل محبوب کا لمحہ ان کے لئے سرشاری اور جذب و مستی کی کیفیت کا حامل بن کر آتا۔ معراج کے درجے پر فائز نماز کی پہچان یہ ہے کہ اس میں داخل ہوتے ہی قلب و جان تغیر آشنا ہوجاتے ہیں اور خشیت ایزدی سے ان کا انگ انگ لرز جاتا ہے اورمحویت و استغراق کے عالم میں وہ دنیا و ماسوا سے بیگانہ ہوجاتے ہیں۔

دوعالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

آقائے دوجہاں ﷺ کے معمولات مبارکہ

ہمارے آقا و مولا علیہ التحیہ والثناء کی نماز اور عبادت گزاریوں کے احوال جو احادیث مبارکہ کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ حالت نماز میں آپ ﷺ کے روئے انور پر زردی کے آثار ظاہر ہوجاتے اوربطن مبارک میں عشق الٰہی کی آگ بھڑکنے سے ایسی آواز آتی جیسے کوئی دیگ جوش مار رہی ہو۔

حضرت عبداللہ بن شخر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ کی نماز کی کیفیات یوں بیان کی گئی ہیں:

اتیت رسول اللہ ﷺ و ھو یصلی ولجوفه از یر کازیر المرجل

(القرآن، الشفاء،۱:۸۵)

’’میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا درآنحالیکہ آپ ﷺ نماز پڑھ

رہے تھے اور آپ ﷺ کے بطن مبارک سے عشق الٰہی کی آگ بھڑکنے کی ایسی آواز آرہی تھی جیسے دیگ پکنے کی آتی ہے۔''

حضور ﷺ کی شب زندہ داریوں کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رات میری آنکھ کھلتی اور میں آقائے دوجہاں ﷺ کو بستر پر نہ پاتی تو اندھیرے میں ٹٹولنے لگتی۔ گھر کے کسی گوشے میں کوئی چیز میرے قدموں سے چھو جاتی تو مجھے پتہ چلتا کہ حضور ﷺ حالت نماز میں ہیں۔ آپ کا سجدہ اتنا طویل ہوتا کہ بعض اوقات مجھے گمان گزرتا کہ کہیں آپ ﷺ کی روح پاک قفس عنصری سے پرواز تو نہیں کرگئی۔ حدیث مبارکہ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

عن عائشہؓ قالت فقدت رسول اللہ ﷺ لیلة من الفراش فالتمستہ فوقعت یدی علی بطن قدمہ و ھو فی المسجد و ھما منصو بتان

(صحیح مسلم کتاب الصلوۃ، ۱:۱۹۲)

''ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ش سے مروی ہے کہ ایک رات میں نے حضور ﷺ کو بستر پر نہ پایا میں نے آپ ﷺ کو تلاش کیا تو میرا ہاتھ آپ ﷺ کے قدم مبارک سے لگا جب کہ آپ سجدے میں تھے اور دونوں پاؤں کھڑے تھے۔''

حضور ﷺ کا عبادت سے شغف اور ذوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ راتوں کی تنہائیوں میں بحالت سجود و قیام اپنی امت کی مغفرت کی دعائیں مانگتے۔ بعض اوقات آپ ﷺ کا قیام اتنا طویل ہوتا کہ قدم مبارک متورم ہوجاتے۔

قرآن حکیم میں بندگان خدا کے معمولات و مشاغل عبادت ان لفظوں میں بیان کیئے گئے ہیں:

وَ الَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا

(القرآن، الفرقان، ۲۵:۶۴)

''اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کیلئے سجدہ ریزی اور قیام (نیاز) میں راتیں بسر کرتے ہیں۔''

راتیں اس طرح بسر ہوتی ہیں کہ ان کے پہلو ان کے بستروں سے جدا رہتے ہیں۔ گویا ذکر وفکر محبوب حقیقی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ قرآن حکیم ایک اور مقام پر کشتگان خنجر وتسلیم کے معمولات بندگی کے شب و روز کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَداةِ وَ الۡعَشِيِّ

(القرآن، الکہف،۱۸:۲۸)

''جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔''

اب ہم ذیل میں کچھ ایسے باکمال خدا رسیدہ بندگان خدا کے احوال بندگی بیان کرتے ہیں جن کی زندگیاں عبادت و طاعت، زہد و ورع اور تقویٰ سے عبارت تھیں۔

حضرت مالک بن دینارؒ کی عبادت گذاریوں کے احوال

حضرت مالک بن دینارؒ وہ باخدا بزرگ تھے جن کا زہد وتقوی کمال کو پہنچا ہوا تھا ان کے شب و روز نماز، تسبیح وتہلیل اور ذکر الٰہی میں بسر ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا سورج نصف النہار سے ڈھل گیا تو بڑھاپے میں بڑھتے ہوئے ضعف وکمزوری کی وجہ سے کھڑے کھڑے ان کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتیں۔ لیکن اس حال میں بھی ان کے معمولات عبادت میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ سخت جاڑے کی ایک رات تھی حضرت مصلے پر کھڑے اپنی سفید داڑھی کو ہاتھ سے بار بار کھینچتے اور روہانسی آواز میں گڑگڑا کر دعائیں مانگتے تھے کہ اے مولا! مالک بن دینار کے بڑھاپے پر رحم کر۔

ان کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ انہوں نے ساری رات اسی طرح گزار دی اور گریہ و زاری اور مناجات کی کیفیت فجر تک برقرار رہی۔ پیرانہ سالی میں خشیت وخوف الٰہی کا یہ عالم تھا کہ کوئی لمحہ بھی محبوب حقیقی کی یاد سے خالی نہ رہتا تھا یہاں تک کہ اسی حال

میں واصل بحق ہوگئے۔

ایک عارفۂ کاملہ کا ایمان افروز واقعہ

حضرت جنید بغدادیؒ اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک عارفہ کاملہ کو دیکھا کہ حالت نماز میں ان پر اس درجہ محویت اور استغراق و انہماک کی کیفیت طاری تھی کہ ایک بچھوّ نے چالیس مرتبہ انہیں ڈنگ مارا لیکن باوجود سخت تکلیف و اذیت کے انہوں نے اسی حال میں نماز مکمل کی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئیں تو میں نے عرض کیا: ''اماں جان! آپ نے ناحق اتنی تکلیف برداشت کی۔ آپ بچھو کو اپنے ہاتھ سے ہٹا دیتیں تو اس تکلیف سے بچ سکتی تھیں۔''

اس عارفہ نے جواب دیا: ''بیٹا! ابھی تم چھوٹے ہو۔ جب بڑے ہوگے تو تمہاری سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ جب کوئی اللہ کے کام میں لگا ہو تو اسے اپنے حال کی خبر نہیں ہوتی۔''

دیگر پاکانِ اُمت کے معمولات بندگی

حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت جنید بغدادیؒ اور بہت سے دوسرے بزرگان دین کے احوال میں اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ انہوں نے فرض عبادت کے علاوہ زندگی بھر کثرت سے نوافل اور وظائف کی ادائیگی کو تواتر کے ساتھ اپنا معمول بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ ان پر بڑھاپا وارد ہوگیا اور قوائے جسمانی مضمحل ہوگئے لیکن باوجود ضعف اور پیرانہ سالی کے انہوں نے اپنے معمولات بندگی کو ترک کرنا گوارہ نہ کیا بلکہ آخری دم تک نفس کو مشقت میں ڈال کر مجاہدے اور ریاضت کی راہ کو اپنائے رکھا۔ اگر کوئی انہیں پوچھتا ''حضرت! اس عمر میں اپنی جان کو ناقابل برداشت مشقت میں کیوں ڈالے ہوئے ہیں؟ اور یہ نفلی عبادتیں ترک کیوں نہیں کردیتے؟'' تو وہ جواب دیتے کہ ''ہمیں یہ مقام جس مجاہدے کی بدولت نصیب ہوا۔ اسے عمر کے اس حصے میں چھوڑتے ہوئے ہمیں حیا آتی ہے۔'' ذکر اور عبادت

میں مداومت ہمیشہ اللہ کے بندوں کا شیوہ رہا۔

ایک وضاحت

یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بندگان حق، اولیائے عظام اور عرفائے کاملین کے یہ معمولات عبادت ان کی طرف سے خود عائد کردہ اضافات نہیں تھے، بلکہ آقائے دوجہاں ﷺ کے صحابہ کرامؓ تابعین اور تبع تابعین بزرگوں کے معمولات سے پوری طرح ہم آہنگ اور مطابقت رکھنے والے تھے۔حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی زندگیاں آنحضور ﷺ کے اسوۂ کاملہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں اور اُن کے احوال حیات پر آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کی چھاپ نمایاں نظر آتی تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت کے باب میں منقول ہے کہ جب قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے وہ کسی ایسے مقام پر آتے جس میں کسی حوالے سے عذاب آخرت کا ذکر ہوتا تو ان پر غشی کی حالت طاری ہو جاتی جو کئی دن برقرار رہتی اور احباب عیادت کے لئے اُن کے گھر آتے۔

نفلی عبادت تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ اس بارے میں ایک حدیث قدسی منقول ہے، جس میں اللہ رب العزت اپنے عبادت گزار بندے کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

لا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببتهٗ فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصربه ویده التی یبطش بها ورجله الذی یمشی بها ولئن سالنی لا عطیته ولئن استعاذنی لاعیذنه.

(صحیح بخاری، کتاب الرقاق،۲:۹۶۳)

''میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے اس قدر قریب ہو جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ

بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے پناہ عطا کرتا ہوں۔‘‘

اس حدیثِ مبارکہ سے ظاہر ہے کہ کثرت و تواتر کے ساتھ نوافل کی ادائیگی بندے کو اس مقامِ محبوبیت پر فائز کر دیتی ہے کہ اس سے صادر ہونے والے تمام افعال ذاتِ باری تعالیٰ سے منسوب ہونے لگتے ہیں اور وہ بندہ اپنے رب کی امان میں آ کر ہر اس گناہ سے محفوظ کر دیا جاتا ہے جو اس سے بصارت، سماعت اور دیگر اعضاء جوارح کے راستے صادر ہو سکتے ہیں۔

اہل اللہ کے معمولاتِ تہجد اور ہمارا طرزِ عمل

یہ بات مسلمہ ہے کہ طریقت کی راہ کا کوئی سالک اپنا روحانی سفر، بغیر نماز کے نہ کبھی طے کر سکا ہے اور نہ کبھی طے کر سکے گا۔ اس پر مستزاد اہلِ طریقت بلا استثنٰی نماز تہجد کی پابندی کو زندگی بھر اپنا شعار رکھتے چلے آئے ہیں بلکہ بعض بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے نمازِ تہجد کے علاوہ پنے اُوپر پانچ سو سے لے کر ڈیڑھ ہزار رکعت تک نوافل کو لازم کیا ہوا تھا اور یہ اُن کا زندگی بھر معمول رہا۔ اہلِ صفا کے لئے نماز پنجگانہ کے بعد تہجد کی پابندی فرض کا درجہ رکھتی ہے ۔ ہمارے بعض اسلاف کے احوال میں مذکور ہے کہ جب وہ صبح ایک دوسرے سے ملتے تو اگر کسی کی نماز تہجد قضا ہو گئی ہوتی تو وہ پہچان جاتے اور اظہارِ تاسف کے طور پر کہتے کہ آج تم پر کیا افتاد پڑی کہ رات اہل اللہ کی محفل سے غائب تھے۔

افسوس صد افسوس کہ آج دینی اقدار اس قدر روبہ زوال ہیں کہ ہمارے بعض نام نہاد صوفی اور طریقت کے نام نہاد دعوے دار نماز تہجد کی پابندی کو چنداں ضروری نہیں سمجھتے۔ شومئی قسمت سے ہم نے اپنے ہاں جس قسم کے تصوف کو رواج دے رکھا ہے وہ محض ڈھونگ اور طریقت کے نام پر ذاتی کاروبار چمکانے اور دُنیاوی مال و متاع جمع

کرنے کا ذریعہ ہے۔

دن کے گناہ اور نمازِ تہجد

شب خیزی کی توفیق اللہ جل مجدہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور اس کے لئے شرط یہ ہے کہ دن میں گناہوں سے اجتناب کیا جائے ۔ یہ قول حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے منسوب ہے کہ کسی نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! کیا سبب ہے کہ باوجود ارادے کے رات کو نمازِ تہجد کے لئے اُٹھنے کی توفیق نہیں ملتی۔''

آپؒ نے فرمایا: ''بیٹا! اگر تو دن کے دوران گناہوں سے بچے گا تو خُدا کی ذات تجھے رات کو اپنی بارگاہ میں حاضری کی توفیق مرحمت فرما دے گی۔''

شب بیداری ربِ کریم کا وہ انعام ہے جو اس کی طرف سے صرف نیک اور صالح بندوں کو دیا جاتا ہے ۔ موسم سرما میں جب بندہ محض اپنے رب کی رضا کی خاطر کڑاکے کی سردی میں گرم و نرم بستر کا آرام چھوڑ کر اُٹھتا ہے تو اللہ جل مجدہ فرشتوں کی محفل میں اپنے اس بندے پر اظہارِ فخر فرماتے ہیں کہ دیکھو میرا وہ بندہ فقط میری رضا کے لئے مشغول عبادت ہے جب کہ دوسرے لوگ گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔

رات کے پچھلے پہر اللہ رب العزت آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں اور ایک پُکارنے والا اطراف و اکنافِ عالم میں ندا دیتا ہے ۔ اس ضمن میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث مبارکہ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

قال رسول اللہ ﷺ ینزل ربنا تبارک و تعالٰی کل لیلة الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث الیل الاخر یقول من یدعونی فاستجیب له من یسالنی فاعطیه من یستغفرنی فاغفرله وفی روایه لمسلم ثم یبسط یدیه ویقول من یقرض غیر عدوم ولا ظلوم حتی ینفجر الفجر.

(صحیح بخاری، ۱:۱۵۳)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے تیسرے پہر فرماتا ہے کہ کون ہے جو مجھے پکارے تاکہ میں اس کا جواب دوں۔کون ہے جو مجھ سے سوال کرے کہ میں اس کو عطا کروں۔کون ہے جو مجھ سے معافی مانگے اور میں اس کو معاف کروں اور مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق پھر اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے اور فرماتا ہے کون ہے جو اللہ کو قرض دے درآں حالیکہ نہ وہ نادار ہو اور نہ ستمگار۔ یہ سلسلہ فجر تک رہتا ہے۔''

نماز میں یکسوئی حاصل کرنے کا نسخہ

ایک شکایت عام ہے کہ نماز میں داخل ہوتے ہی ایسے وسوسے اور خیالات آنے لگتے ہیں جن سے توجہ پراگندہ اور منتشر ہو جاتی ہے اور نماز میں یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔ لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ اس صورت حال کا ازالہ کیسے کیا جائے؟ نماز میں شیطانی خیالات اور وسوسوں سے بچنے کا ایک تیر بہدف اور مؤثر نسخہ پیش کیا جاتا ہے جس پر عمل کرنے سے کافی حد تک نماز میں یکسوئی حاصل کی جاسکتی ہے ۔ وہ یہ کہ نماز کے معانی ذہن نشین کر لئے جائیں اور اس کا مفہوم لفظاً لفظاً ازبر کر لیا جائے۔ نماز میں داخل ہو کر ہر لفظ کے معنی پر غور کیا جائے مثلاً جیسے ہی لفظ ''سبحان'' زبان سے ادا ہو خُدا کی بڑائی، پاکیزگی اور تقدس کا تصور دل و دماغ میں گھر کر جائے اور نمازی پر یہ خیال حاوی ہو جائے کہ وہ سب سے بڑے بادشاہ کے دربار میں دست بستہ حاضر ہے جو ہر عیب اور نقش سے اس طرح پاک ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔جب نماز میں اس کی کبریائی کا ذکر آئے تو آسمانی اور دنیوی کائنات کی ہر شے سے اسے بڑا جانے اور ساری مخلوق اس کی عظمت کے آگے بے مایہ ہیچ اور حقیر نظر آنے لگے جب اس کی رحمت کا ذکر آئے تو پوری کائنات کے گوشے گوشے کو اس کی رحمت واسعہ محیط دکھائی دے اور تمام ملائکہ، جن وانس اس کی رحمت کے سوالی نظر آئیں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ نماز میں اللہ کی جس جس صفت کا بیان زبان پر آئے اس کی معنویت کا نقش دل پر بیٹھ جائے۔ اگر نماز اس کے معنوں کے ساتھ ان کیفیات میں ڈوب کر پڑھی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بندہ خیالات کی پراگندگی، ذہنی انتشار اور شیطانی وسوسوں سے نجات نہ پا جائے۔

قربِ نوافل اور قربِ فرائض کا موازنہ و تقابل

اس میں کوئی شک نہیں کہ نماز فرض ہو یا نفل، بے شمار فیوض و برکات کی حامل ہے۔ لیکن ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ خشوع و خضوع، انہماک و استغراق اور محویت سے ادا کی جانے والی فرض نماز سے جو فیوض و ثمرات اور فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ نفلوں کی نماز کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ اور حد و شمار سے باہر ہیں۔

نوافل کثرت و تواتر کے ساتھ ادا کرنے سے بندے کو جو قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے اسے ’’قربِ نوافل‘‘ اور فرض نماز کی مداومت سے جو قرب حاصل ہوتا ہے، اسے ’’قربِ فرائض‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قربِ فرائض کا درجہ و مرتبہ قربِ نوافل سے کہیں افضل اور بلند ہے۔ اس ضمن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے کسی نے حضرت غوث الاعظمؒ کے بارے میں سوال کیا کہ وہ ’’**قم باذنی**‘‘ کہہ کر مردہ زندہ کر دیا کرتے تھے، جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ’’**قم باذن اللہ**‘‘ کہتے تو مردہ زندہ ہو جاتا تھا۔ کیا حضرت غوث الاعظمؒ کا درجہ و مقام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے برتر سمجھا جائے؟

(امداد المشتاق: ۱۷)

حاجی امداد اللہؒ نے فرمایا کہ اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے نبوت کا مقامِ ولایت کے مقام سے بہر حال افضل ہوتا ہے۔ رہا مردے کا زندہ کرنا تو حضرت غوث الاعظمؒ کا ’’**قم باذنی**‘‘ کہہ کر مردہ زندہ کرنا ان کے ابتدائی احوال و کرامات کا آئینہ دار ہے اور یہ مقام انہیں قرب نوافل کی وجہ سے حاصل تھا۔ بعد میں جب حضرت غوث الاعظمؒ ولایت کے بلند ترین مقام پر متمکن ہوئے تو قربِ فرائض کی بدولت وہ مردہ زندہ

کرتے وقت بجائے ’’قم باذنی‘‘ کہنے کے ’’قم باذن اللہ‘‘ ہی کہا کرتے تھے یعنی اپنے کمالات کی نسبت براہِ راست اللہ تبارک و تعالیٰ سے کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ اللہ کے نبی تھے اُنہیں ابتداء ہی سے قربِ فرائض کی وجہ سے یہ مقام حاصل تھا کہ وہ مردے کو ’’قم باذن اللہ‘‘ کہہ کر زندہ کیا کرتے تھے اور اپنے کمالات نبوت کو اللہ عزوجل سے منسوب فرماتے تھے۔

جزوِ ششم

آدابِ صلوٰۃ

نماز اہلِ ایمان کے لئے معراج کیونکر بنتی ہے؟ اس پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جا سکتی ہے جس کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ اہلِ صفا اور سالکان طریقت نماز ہی کے ذریعے قربِ الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ نماز کے بغیر ان روحانی مہمات کو سر کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ اس کا تصور ہی سرے سے محال ہے۔

لہٰذا نماز کی اس اہمیت کے پیشِ نظر اس بات میں جس نکتہ کی خصوصیت کے ساتھ وضاحت مقصود ہے اس کا تعلق نماز کے ان آداب سے ہے جن کو بجا لانے سے نماز روحانی لذت اور معراج کے ثمرات و برکات کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰىO وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰىO

(القرآن، الاعلیٰ، ۸۷:۱۴)

”بلاشبہ وہی بامراد ہوا، جس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا (شریعت کا پابند کر لیا، تصورِ صالح میں آ گیا) اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔“

اس آیہ مبارکہ کا مفہوم اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ نماز جو انسان کو دُنیوی و اُخروی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کا باعث بنتی ہے، اس کے لئے نفس کو تمام آلائشوں اور ہر قسم کے میل کچیل سے پاک و صاف کر لینا بنیادی شرط ہے۔

مذموم نفسانی خواہشات اور اخلاقی رذائل سے رستگاری اور رہائی ہی انسان کو فلاح و کامیابی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے اور یہی نماز کے روحانی معراج کی طرف پہلا

قدم ہے۔

آداب و شرائطِ نماز

وہ شرائط اور آداب جن کی بجاآوری کو نماز ادا کرنے کے لئے لازمی ولابدی قرار دیا گیا ہے پانچ ہیں۔ ان میں سے ہر ادب گوناگوں ظاہری وباطنی پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس ضمن میں اولاً ظاہری آداب پر توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے کیونکہ جب تک ظواہر کے تقاضے پورے نہ کئے جائیں ان کی باطن تک رسائی محال ہے۔

نماز کے ظاہری آداب

پہلا اَدب......طہارت

نماز کا سب سے پہلا ادب پاکیزگی وطہارت ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ حالتِ نماز میں داخل ہونے سے پہلے جسم، جگہ اور لباس اچھی طرح سے پاک وصاف ہوں کیونکہ اس کے بغیر نماز کی ادائیگی کے شرعی تقاضے پورے نہیں کئے جاسکتے۔

دوسرا اَدب......ستر

نماز کا دوسرا ادب ''ستر'' ہے یعنی جسم کے مخصوص حصے لباس سے ڈھکے ہوئے ہوں۔ فقہی اصطلاح میں اسے ''سترِعورت'' کہا جاتا ہے۔ کتب فقہ میں مرد اورعورت کے جسم کے ان مخصوص حصوں کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے جن کا ڈھانپنا نمازی کے لئے ازروئے شرع فرض قرار دیا گیا ہے۔ ستر پوری طرح ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں نماز نہیں ہوگی۔

تیسرا اَدب......پابندیٔ وقت

نماز کا تیسرا ادب اسے وقت کی مقررہ حد کے اندر ادا کرنا ہے۔ نماز ادا کرنے

کی دو حدیں ہیں۔ ایک شروع کرنے کی ابتدائی حد اور دوسری ختم کرنے کی آخری حد۔ اگر ان دو حدود کے اندر نماز ادا کی جائے تو وہ ادا ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ مثلاً ظہر کی نماز کا وقت سورج ڈھلنے کے بعد شروع ہوتا ہے ۔ اگر آپ نے اس سے قبل نماز ادا کر لی تو وہ ظہر کی نماز تصور نہیں ہوگی۔اسی طرح نماز ظہر کی آخری حد اس وقت تک ہے جب تک سایہ سوا دو ہاتھ دراز ہو جائے ۔ اس کے بعد چونکہ نمازِ عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اس لئے ظہر کی نماز ادا نہیں ہوسکتی۔ نمازِ عصر کی آخری حد غروبِ آفتاب سے قبل تک ہے ۔اسی طرح نماز مغرب غروبِ آفتاب کے بعد ہو گی پہلے نہیں۔اس کی بھی ایک آخری حد ہے جس کے گزر جانے کے بعد عشاء کا وقت شروع ہوجاتا ہے جو طلوعِ فجر سے پہلے تک رہتا ہے۔

نماز پنجگانہ کے اوقات کی مقررہ حدود کی پابندی ہر مسلمان پر فرض کر دی گئی ہے ۔نماز کے بارے میں پابندی اوقات سے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا

(القرآن، النساء،۴:۱۰۳)

’’بے شک نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے حساب سے فرض ہے۔‘‘

لہٰذا وہ نماز جو اوقاتِ مقررہ کے بعد ادا کی جائے گی، قضا نماز تصور ہو گی۔

چوتھا اَدب......استقبال قبلہ

چوتھا ادب نماز میں داخل ہونے سے پہلے اپنے آپ کو قبلہ رُخ کھڑا کر لینا ہے۔ حالتِ نماز میں کھڑے ہونے سے پہلے چہرے اور پورے جسم کا قبلہ رُخ کر لینا ضروری ہے تاہم حالتِ سفر میں اگر سمت قبلہ کا تعین کرنا ممکن نہ ہو تو انسان کو مجبوری کی بناء پر اس پابندی سے مستثنٰی قرار دیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس صورت میں کسی بھی سمت رُخ کر کے کھڑا ہونے سے نماز ادا ہو جائے گی۔

پانچواں اَدب......نیت

نماز کا پانچواں ادب زبان یا دل سے نماز کی نیت ہے ۔نیت دل کے ارادے کو کہتے ہیں۔اس کو الفاظ میں بیان کرنا لازم نہیں کیونکہ نیت بہرحال دل کی کیفیت کا نام ہے۔

نماز کے ان پانچ ظاہری آداب کی پابندی کے بغیر شرعی اعتبار سے نماز مکمل نہیں ہوتی ۔نماز بلاامتیاز ہر اس شخص پر فرض ہے جو شریعت کی نظر میں مکلّف ہے ۔نماز کا اولین ظاہری ادب ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتَابًا مُّوۡقُوۡتًا'' کے ارشاد خُداوندی کی رو سے پابندی وقت ہے ، کیونکہ وقت کی پابندی کو ملحوظ رکھے بغیر حکم نماز کی بجاآوری کا کوئی تصور ہی نہیں۔مزید برآں تعین اوقات کے بغیر فرضیت کا حکم بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پس نماز میں پابندی وقت پہلا ظاہری ادب ہے اب ہم نماز کے باطنی آداب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

نماز کے باطنی آداب

پہلا اَدب......محافظت نماز

پابندیٔ وقت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے باب میں پہلا باطنی ادب نماز کی محافظت کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

حَافِظُوۡ عَلَی الصَّلَوٰاتِ وَالصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطیٰ

(القرآن، البقرہ،۲:۲۳۸)

''سب نمازوں کی محافظت کرو اور بالخصوص درمیانی نماز کی۔''

اس آیہ کریمہ میں مذکور محافظت نماز کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس شے سے محافظت مقصود ہے؟ اگر ہم آیت کے مفہوم پر غور کریں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے

آتی ہے کہ قرآن حکیم میں نماز سے متعلق وقت کی پابندی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان کیفیات واحوال کو اپنے اندر راسخ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، جن کے بغیر نماز فرضیت کی حد تک تو ادا ہو جائے گی لیکن نماز کا حق ادا نہیں ہو گا۔

شارعِ اسلام ﷺ نے اس کی توضیح میں ایک بار تمثیلا اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے استفسار فرمایا کہ بتایئے اللہ کے نزدیک سب سے بری چوری کیا ہے؟

صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اُس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بدترین چوری کی مثال وہ نماز ہے جسے پورے آداب کے ساتھ ادا نہ کیا گیا ہو۔

(عوارف المعارف، ۳۸۹)

اور اس کے ظاہری وباطنی تقاضے نہ کئے گئے ہوں۔ خشوع وخضوع اور حضوری قلب کے بغیر ادا کی ہوئی نماز گویا نماز کی چوری تصور کی جائے گی۔ ایسی نماز محض چند حرکات وسکنات کے مجموعے کا نام ہے جو اپنی حقیقی روح اور باطنی جوہر سے محروم رہتی ہے۔

نماز کی نمازی کے حق میں دُعا

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص وضو کرکے پورے آداب اور کمال یکسوئی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہو کر نماز ادا کرتا ہے تو نماز اس کے حق میں دُعا کرتی ہے کہ جس طرح تُو نے میری حفاظت کی اللہ تعالیٰ اسی طرح تیری حفاظت کرے۔ پھر وہ دُعا آسمانوں کی طرف پرواز کرتی ہوئی عرشِ الٰہی کے کنگرے تھام کر اس نمازی کی بخشش ومغفرت کے لئے اللہ رب العزت سے سفارش کرتی ہے۔ اس کے برعکس جو کوئی شخص اس حالت میں داخل نماز ہوتا ہے کہ اس کی زبان تو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہے لیکن اس کا دل دُنیاوی معاملات میں اُلجھا ہوا ہو تو وہ نماز زبان حال سے اس شخص کے لئے بدعا کرتی ہے کہ اے بندے جس طرح تُو نے مجھے ضائع کیا۔ اللہ تعالیٰ

تجھے بھی اسی طرح ضائع کرے۔ وہ نماز پھر غلیظ کپڑے میں لپیٹ کر اس بندے کے منہ پر ماردی جاتی ہے اور اسے تاریکیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔جبکہ آداب کے ساتھ ادا کی ہوئی نماز نورِ ایزدی کے جلو میں عرشِ معلیٰ کی طرف پرواز کرتی ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

اہلِ دل اور اربابِ طریقت جس قدر آداب نماز سے واقف و باخبر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی قدر ان پر حقیقت نماز منکشف ہونے لگتی ہے اور نتیجتاً وہ بارگاہ خُداوندی کے آداب کے شناسا و محرم ہوجاتے ہیں۔ نماز چونکہ اس حریم ناز میں حاضری ہی کا دوسرا نام ہے لہٰذا اس کی لذت وحلاوت سے وہ اس درجہ سرشار ہو جاتے ہیں کہ دوعالم ان کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور بقول اقبالؒ

دوعالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

حضرت شیخ ابوبکرؒ بلند مرتبت اور صاحبِ حال بزرگ ہوگزرے ہیں، جن کا شمار باطنی آداب نماز کی معرفت رکھنے والے صاحبِ حال صلحاء و اتقیاء میں ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

’’نماز سے فارغ ہونے کے بعد مجھ پر اس درجہ شرمندگی اور انفعال وندامت کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جس قدر گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے کسی گنہگار پر ہوتی ہے ۔ رہ رہ کر یہ مجھے خیال آتا ہے کہ خُدا جانے میں نے یہ نماز پڑھی ہے وہ خُدائے بے ہمتا کی عظیم بارگاہ کے شایان شان بھی تھی یا نہیں اور آیا میں اس کا حق ادا کر بھی سکا ہوں یا نہیں، اہلِ طریقت کا یہی شیوہ ہے کہ نماز ادا کر کے ان کی جبینیں عرقِ انفعال سے تر رہتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کو پورے آداب کے ساتھ ادا

کرنا خوش بختی کی علامت ہے اور وہ خوش بخت جو نماز کو کمالِ خضوع، محویت واستغراق اوریکسوئی کے ساتھ ادا کرتے ہیں ان کی دو رکعتیں بھی رات بھر کی (بے توجہی کی) عبادت سے بہتر ہیں۔

(عوارف المعارف:۳۹۳)

نماز کی محافظت کا طریقہ

نماز میں یک گونہ لذت وحلاوت کی کیفیت کا حصول اور اس کی محافظت صرف ایک ہی طریقے سے ممکن ہے وہ یہ کہ جو سوز و گداز، رقت قلب، گریہ وزاری اور لذت و حلاوت کسی ایک نماز میں نصیب ہو جائے، جہاں تک ممکن ہو اس کیفیت اور جذب وحال کی محافظت کی کوشش کی جائے اور لوحِ دل پر اس کی یاد اس طرح نقش ہو جائے کہ اسے محو کرنا ممکن نہ رہے۔ پھر اگلی نماز اسی کیفیت سوز ومستی میں سرشار ہو کر ادا کی جائے اور اس پر مداومت کے لئے رب کے حضور مسلسل گریہ وزاری اور دعا والتجا کو جاری رکھا جائے یہاں تک کہ لذت و کیفیات اور سرشاری کی وہ متاع گراں دوبارہ نصیب ہو جائے پچھلے حال کی محافظت کے لئے ہمہ تن محو رہنا باطنی احوال کی اصلاح کا موجب بنتا ہے۔ فطری طور پر انسان کا حال ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ کبھی انہماک واستغراق کسی خوش نصیب کو محنت و کاوش کے بغیر حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی مسلسل سعی وکاوش سے بھی یہ دولت ہاتھ نہیں آتی۔کوئی لمحہ خوبی قسمت سے ایسا آجاتا ہے جو نشاط و آگہی ، لذت وحلاوت اور سرور وانبساط سے مالامال کر جاتا ہے اور کبھی سالہا سال تک اس کے لئے دیدہ و دل ترستے رہتے ہیں اور وہ نعمت میسر نہیں آتی۔ یہ صرف ہماری ہی حالت نہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جن کا ایمان اور رُوحانی مقام ہم سے بدرجہا تھا گاہے گاہے اس صورت حال سے دوچار ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ کچھ اصحابِ رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ! جب ہم آپ کی صحبت سے فیضیاب ہو کر گھر لوٹتے ہیں تو وہ ذوق وسرور، کیف ونشاط اور لذت و انبساط کی کیفیت جو ہمیں آپ کی مجلس میں نصیب

ہوتی ہے باقی نہیں رہتی۔ کیا ہماری یہ حالت منافقت کی آئینہ دار تو نہیں؟ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اپنا حال بیان کیا تو آپ نے فرمایا:

''اے مرے جانثارو! وہ حال جو تمہیں میری مجلس میں نصیب ہوتا ہے اس کی محافظت و مداوت تمہارا شعار بن جائے تو پھر فرشتے آسمان سے تمہاری تعظیم و تکریم کے لئے تمہارے آگے پیچھے دائیں بائیں تم سے مصافحہ کرنے قطار اندر قطار زمین پر اُتر آئیں۔''

(صحیح مسلم، ۲:۳۵۵)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں اس طرح انتہائی دل نشین انداز سے اس نکتے کی توضیح کر دی کہ تغیر حال بتقاضائے بشریت ایک فطری اور طبعی امر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں اور اگر اس تغیر حال سے مستثنیٰ ہے تو وہ اللہ کا برگزیدہ نبی ہے جو ہر حال میں مخلوق کی طرف متوجہ رہتے ہوئے بھی توجہ الی الخالق سے لمحہ بھر کے لئے غافل نہیں ہوتا۔

حال کی محافظت کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد کہ فرشتے بھی تمہارے ہم رکاب ہو کر سلامی کے لئے حاضر ہونے لگیں، اس امر کا غماز ہے کہ فی نفسہ محافظت قابلِ عمل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اُنہیں اس بات کی تسلی بھی دی کہ حال کا متغیر رہنا منافقت بلکہ بشری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

لمحۂ فکریہ

ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانک کر اپنے احوال کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ہمارے ظاہر و باطن، قول و فعل اور دیگر معاملات زندگی میں تضاد کذب بیانی، نفاق اور فریب دہی کا عمل دخل تو نہیں ہے۔ کہیں لاشعوری طور پر غیبت کے مرتکب ہو کر ہم قرآن حکیم کے الفاظ میں اپنے مسلمان بھائی کا مردہ گوشت تو نہیں کھا رہے۔ ہماری خود تنقیدی پر مبنی سوچ اور خود احتسابی کا رویہ ہماری نفسانی کمزوریوں کے بہت سے گوشے بے

نقاب کرنے میں ممد ثابت ہو گا اور بہت سے تضادات کو ہم پر واضح کرے دے گا اور ہم پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ ہمارے زبانی دعوے اور عمل کے درمیان کس حد تک عدم مطابقت پائی جاتی ہے۔ یہ محاسبہ نفس اگر انسان کے ارادے میں کارفرما ہو جائے اور یہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے تو اس کی بہت سی قباحتیں از خود مفقود ہو جائیں گی۔

سوتے وقت محاسبہ نفس کی اہمیت

لٰہذا ہر انسان کے لئے لازمی ہے کہ وہ رات کو سوتے وقت اپنے دن بھر کے اعمال کو خود احتسابی کے میزان پر تولے اور افعال و اقوال پر ناقدانہ نظر ڈالے کہ اس کے دن بھر کے نامۂ اعمال میں حسنات و سیات کا کیا تناسب ہے؟ اگر وہ اسے اپنا روز مرہ کا معمول بنالے تو وہ کل قیامت کے دن بڑی ذلت و رسوائی اور ندامت سے بچ جائے گا۔ بلاشبہ لحہ بہ لحہ اعمال کے محاسبے کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے سے گناہوں کو یاد کرنے اور توبہ واستغفار کرنے کے عزم کو مہمیز ملتی ہے۔ رب کے حضور سچے دل سے گناہوں کی معافی مانگنے اور ان سے آئندہ بچنے کے لئے توبہ کرنے سے بندے کے سارے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور اس کی برائیاں نیکیوں میں بدل دی جاتی ہیں۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ انسان جس حال میں عام طور پر سوتا ہے اسی حال میں اس پر موت وارد ہوتی ہے بنابریں وہ شخص جس نے رات کو سونا بہتر بنالیا اس نے گویا اپنا روزِ جزا کا حشر ونشر بہتر کرلیا۔ محاسبہ نفس اعمال صالحہ کو دوام بخشنے کا تیر بہدف نسخہ ہے اور اس کا ترک کر دینا انسان کو معصیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ وہ لوگ جو اُٹھتے بیٹھتے بے روک ٹوک جھوٹ بولنا اور فحش کلامی کو اپنا شعار بنالیتے ہیں، ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ جھوٹ اور سچ میں یکسر تمیز کھو بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح مسلسل رزقِ حرام کھاتے رہنے سے حلال وحرام کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ یہی حال دوسری برائیوں کا ہے جنہیں پے درپے کرتے رہنے سے وہ انسان کے اندر اتنی راسخ ہو جاتی ہیں کہ نیکی وبدی کا امتیاز تک باقی نہیں رہتا۔ استمرار حال

اوراس کی محافظت کے لئے محاسبہ نفس شرط اول ہے جبکہ دوسری شرط گریہ وزاری ہے کیونکہ محاسبے میں کمی کا ازالہ گریہ وزاری کے ذریعے کیا جاسکتا ہے اور یہ رحمتِ ایزدی کو جوش میں لانے کا مؤثر انداز ہے جس سے گناہ خواہ پہاڑوں کی مانند ہی کیوں نہ ہوں ڈھل کر صاف ہوجاتے ہیں۔

گریہ وزاری مقبولانِ الٰہی کا شیوہ ہے

گریہ و زاری اورنالہ و اشکباری صرف گنہگاروں، فاسقوں اور فاجروں کی ہی ضرورت نہیں بلکہ ہمیشہ سے زاہدوں اورعبادت گزاروں کا بھی شیوہ رہا ہے ،اللہ کی بارگاہ میں جس قدر کوئی برگزیدہ اورمقرب ہوتا چلا جاتا ہے ۔ الطاف وعنایات خُداوندی میں اضافے سےمقبولانِ الٰہی میں رقتِ قلب اورسوزوگداز کی کیفیت دوچند ہو جاتی ہے۔

حضرت سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی سخت گیری زبان زد خاص و عام ہے لیکن یہ ان کی زندگی کا صرف ایک رُخ تھا۔آپ کی زندگی کے دوسرے رُخ پرنظر ڈالیں تو ہم ان کے احوال گریہ و زاری اور رقت انگیزی پر حیران وششدر رہ جاتے ہیں۔آپ رضی اللہ عنہ کے تذکارِسیرت میں درجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ خُوفِ خُدا کے باعث اتنی کثرت سے روتے تھے کہ اُن کے رُخساروں پر شدت گریہ سے نشان پڑ گئے تھے۔اسی طرح حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ اورحضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدرصحابہ بھی خشیتِ الٰہی کا پیکر تھے اورانکی زندگیاں بھی وفورگریہ وزاری سے عبارت تھیں۔

(حیاتِ فاروقِ اعظم از ابن جوزی:۲۸۲)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی رقیق القلبی،سوزوگداز اورحد سے بڑھی ہوئی گریہ و زاری بھی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے ۔ان کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ وہ رات کوگریہ وزاری شروع کرتے تو یہ کیفیت بسا اوقات صبح تک جاری رہتی۔ان کا معمول تھا کہ گرمایا سرما کوئی بھی موسم ہو اپنے مکان کی چھت پرعبادت کرتے ۔کثرت گریہ سے بہنے والے آنسوچھت کے پرنالے سے ٹپکنے لگتے۔

اسی طرح ایک اور خُدا رسیدہ ولی کامل کے حالات زندگی میں درج ہے کہ وہ اتنے کثیر البکاء تھے کہ آنسوؤں کا پانی چھت کے پرنالے سے بہنے لگتا۔ ایک دفعہ وہ مصروف گریہ و زاری تھے کہ ایک شخص کا نیچے سے گزر ہوا اور اس ولیٔ کامل کے آنسوؤں کا پانی اس شخص کے کپڑوں پر پڑ گیا اس نے آواز دے کر پوچھا کہ میرے کپڑوں پر پانی کس نے گرایا ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا" اے بندۂ خُدا! مجھے معاف کر دینا اور اپنے کپڑوں کو دھو لینا جو اس گنہگار کے آنسوؤں سے آلودہ ہو گئے ہیں۔"

نماز میں اللہ کی تین محبوب ترین چیزیں

محافظت حال کے لئے محاسبہ نفس کے بعد گریہ و زاری انتہائی مؤثر علاج ہے اس کا سلب ہوجانا روحانی مقامات کے تلف ہو جانے کی دلیل ہے اور اس کا لوٹ آنا ان مقامات کی بحالی اور بازیافت کی علامت ہے۔ سوز و گداز پیہم اور گریہ وزاری کی کیفیت طاری رہے تو حال نصیب ہوتا ہے اور اگر یہ کیفیت باقی نہ رہے اور آنکھوں کے سوتے خشک ہو جائیں تو یہ متاع بے بہا ہاتھ سے نکل جاتی ہے گویا دیدہ گریاں کی نمنا کی محافظت حال کی ضامن ہے جو طبیعت میں عجیب سوز وگداز، سوز ومستی اور جذبہ و شوق پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے کہ باری تعالٰی نے اپنے ایک پیغمبر سے فرمایا کہ میں اپنے عبادت گزار بندے سے نماز میں تین چیزوں کا طالب ہوں۔ جسم کی نیاز مندی، دل کی یکسوئی اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو۔ اگر وہ یہ تینوں چیزیں میری نذر کر دے تو مجھے میری عزت کی قسم میں اس کے اتنا قریب ہو جاتا ہوں کہ اس سے زیادہ اور بہتر قرب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(عوارف المعارف:۳۹۲)

نماز کے باطنی آداب کی تکمیل انہی تین چیزوں کے اپنانے میں مضمر ہے۔

اوّل: جسم کی نیاز مندی جو غایت درجہ تواضع، انکساری اور تذلل کی پیداوار ہے۔

دوم: قلب کی یکسوئی جس سے بندے کو عبادت میں استغراق و انہماک نصیب ہوتا ہے۔

سوم: خُدا کی یاد میں بہنے والے آنسو اور گریہ و زاری جس سے پہاڑوں جیسے گناہ بھی خس وخاشاک کی طرح بہہ کر ناپید ہوجاتے ہیں۔

محافظت علی الصلوٰۃ کے باطنی آداب کا مقصد زندگی کے ظاہر وباطن میں ایسی کیفیت کو حاوی کرلینا ہے کہ جو حال نماز میں نصیب ہو اور نماز کے بعد بھی قائم ودائم رہے۔

۲۔ استقبالِ قبلہ کا باطنی اَدب

نماز کے ظاہری ادب کا تقاضا نماز میں انسان کا اپنے چہرے کو جسم سمیت قبلہ رُخ رکھنا یعنی حالتِ نماز میں چہرہ اور دیگر اعضاء وجوارح کعبہ کی جانب متوجہ کر لئے جائیں۔ ایسا کئے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔ استقبالِ قبلہ کا باطنی ادب یہ ہے کہ بندے کا دل ہر آن اور ہر ساعت ربِ کعبہ کی طرف جھکا رہے اور تمام تر قلبی وباطنی توجہات کا مرکز و محور ذات خُداوندی رہے۔ ظاہری ادب جہاں جانب کعبہ یک سمتی کا متقاضی ہے وہاں اس کے باطنی ادب کا تقاضا ما سوا اللہ سے بے نیاز ہوکر اپنی باطنی توجہات کا سراسر ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب مرکوز کر دینا ہے۔ رب العزت جہتوں اور سمتوں سے پاک ہے، لہٰذا قلبی توجہ کو کلیتًا اس کی طرف منعطف اور مرتکز کر لینا وہ باطنی ادب ہے جو محافظت حال سے متصل اگلا قدم ہے۔ پھر جس طرح نماز ظاہری حالت میں قبلہ رُخ ہوئے بغیر ادا نہیں ہوسکتی اسی طرح قلب و روح اور باطن کو ربِ کعبہ کی طرف متوجہ کئے بغیر نماز نامکمل اور بے روح رہتی ہے جب تک ہر ساعت اور ہر آن دل اسی کی یاد میں سرشار نہ ہو۔ نماز کے اس باطنی ادب کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔

قرآن حکیم میں اس باطنی ادب کا ذکر یوں ہوا ہے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ وَيَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا

(القرآن، الم السجدہ،۳۲:۱۶)

’’(یہ وہ لوگ ہیں کہ) ان کے (نرم) بچھونوں سے ان کے پہلو جُدا رہتے ہیں (اور تہجد میں) اپنے پروردگار کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت سے) اُمید کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔‘‘

اس آیتِ کریمہ میں ان نفوس قدسیہ کا تذکرہ ہے جن کے پہلو رات کی خلوت میں بھی ان کے بستروں سے جُدا رہتے ہیں اور اُمید و بیم اور خوف و رجاء کے عالم میں ہر گھڑی وہ اپنے رب کی یاد کو حرز جاں بنائے رہتے ہیں۔ یہ کیفیت عشق کے بغیر نصیب نہیں ہوسکتی۔

یہ عشق و محبت اور جنون کی باتیں عقل و خرد کے پیمانے پر نہیں پرکھی جاسکتیں، عشق اور جنوں کے اپنے آداب ہوتے ہیں جن کی تفہیم کے بغیر یہ مضمون سمجھ میں نہیں آسکتا۔محبوب سے تعلق یگانہ استوار کرنے میں بیم و رجاء پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔عاشق کو اس بات کا خوف ہمہ وقت دامنگیر رہتا ہے کہ مبادا کسی لمحے بالارادہ یا بے ارادہ کوئی قدم ایسا اُٹھ جائے جو محبوب کی طبع نازک پر ناگوار گزرے گویا اس کے لئے غیر شعوری طور پر محبوب کی بے ادبی کا تصور بھی سوہان روح بن جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر لحظہ محبوب کی خوشنودی اور رضا کی اُزید دل کو ڈھارس دیتی ہے اور ہر آن دل کے شبستانوں میں آس وامید کے چراغ روشن رہتے ہیں ، چشمِ اُمید اس کی رضا جوئی اور خوشنودی کی طرف لگی رہتی ہے۔قرآن حکیم نے اُمید و بیم کی اس کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا

(القرآن، الم السجدہ،۱۶:۳۲)

’’وہ اپنے پروردگار کو(اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور(اُس کی رحمت سے)اُمید کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔‘‘

خوف و رجاء کی اس کیفیت کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اولیاء اللہ استعارتاً ایمان کی مثال اس پرندے سے دیتے ہیں ،جس کا ایک پر خوف اور دوسرا اُمید کا ہوتا ہے ،

جس طرح دونوں پروں کی مدد سے پرندہ پرواز کے قابل ہوتا ہے اسی طرح مرد مومن کا ایمان خوف و اُمید دونوں سے مل کر ہی اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ خوف اور اُمید کی یکجائی کا ادراک عشق کے بغیر ممکن نہیں اور عشاق کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا

(القرآن، الفرقان، ۲۵:۶۴)

''اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے سامنے سجدہ اور قیام کی حالت میں راتیں بسر کرتے ہیں۔''

اس آیتِ کریمہ میں ان شب زندہ داروں کا ذکر ہوا ہے جو ساری ساری رات سجود و قیام میں گزار دیتے ہیں۔ ان کے قلب و باطن میں اللہ کی یاد اس طرح جاگزیں ہوتی ہے کہ تجارت، خرید و فروخت اور دُنیاوی معاملات میں مشغول رہنے کے باوصف وہ ایک لمحے کے لئے بھی یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتے اور ان کا حال پنجابی کی مشہور کہاوت ''ہتھ کار ول دل یار ول'' کا مصداق ہوتا ہے۔

ایک ذاتی واقعہ

یہاں اس نکتے کی وضاحت کے لئے ایک ذاتی واقعے کا ذکر خالی از منفعت نہ ہو گا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب میں کالج میں گیارہویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے ذہن میں اچانک یہ سودا سما گیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل اور بیاباں کی طرف نکل جاؤں۔ رفتہ رفتہ یہ جنوں اتنی شدت اختیار کر گیا کہ میں اپنے والدین (خدا اُنہیں غریقِ رحمت کرے) سے اس امر کی اجازت حاصل کرنے پر مصر ہوا۔ وہ اجازت کیا دیتے! مجھے سمجھاتے رہے اور حضور ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے میری ہدایت و رہنمائی کی دعائیں بھی مانگتے رہے۔ اسی کشمکش میں چھ ماہ گزر گئے اور بالاخر دُنیا ترک کر دینے کا یہ عجیب و غریب خیال میرے دل و دماغ سے نکل گیا اور مجھے ہدایت کی روشنی نصیب ہو

گئی۔

قبلہ والد صاحب علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ بیٹا! رب کو منانے کے لئے ترک دُنیا شیوہ مردانگی نہیں ہے بلکہ مردانگی تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں رہو اور حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کا سامان کرو۔ غربت اور امارت کو دین کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اگر امیر کا دل خُدا کی یاد سے آباد ہے تو دنیوی مال و متاع اور کسبِ معاش اس کی دینداری میں آڑے نہیں آسکتے۔ اسی طرح غریب کا دل اگر یادِ خُدا سے غافل نہیں تو اس کی غربت وافلاس اس کی دینداری میں حائل نہیں ہوسکتی۔ انسان خواہ بنگلے میں رہے یا کٹیا میں، اگر اسکا دل یادِ الٰہی سے آباد اور ذکرِ الٰہی سے معمور ہے تو وہ دیندار ہے اور اس کا دل اگر یادِ باری تعالیٰ سے خالی ہے تو اس کا شمار دُنیاداروں میں ہوگا۔ بقول مولائے رومؒ

چیست دُنیا از خُدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

خلوت و جلوت کا فرق کوئی حقیقت نہیں رکھتا

قلبی اور باطنی توجہ کے ذات باری تعالیٰ کی طرف مرتکز رہنے سے انسان کو وہ مقام حاصل ہوجاتا ہے کہ اس کی خلوت و جلوت میں کوئی فرق نہیں رہتا اور خلوت ہو یا جلوت اس کا دل یکساں طور پر اللہ کی جانب متوجہ رہتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کشف المحجوب میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک بزرگ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے کہ حضرت کل نماز میں مجھے وہ سرور اور لذت نصیب ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار کر رہے تھے کہ شیخ فرمانے لگے کہ بیٹا! تیری روحانی حالت ہنوز ناپختہ ہے اگر وہ قوی ہوتی تو خلوت و جلوت میں تیرا حال یکساں رہتا۔

(کشف المحجوب، ۲۴۶)

صرف خلوت کا عبادت میں مزہ دینا، روحانی حالت کے ضعف پر دلالت کرتا ہے۔ روح پختہ تر اور قوی ہوجائے تو پھر رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ محبوب کے عشق و محبت کے نشے میں سرشار رہنے والے کے لئے خلوت اور جلوت دونوں حالتیں ایک سی ہوجاتی ہیں اور یہ کیفیت دائمی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ پھر لوگوں کا جھرمٹ ہو یا گوشہ تنہائی ہو، محبوب کی یاد ہر حال میں یکساں قائم رہتی ہے۔ نماز کا یہ باطنی ادب اس بات کا مقتضی ہے کہ اپنے ظاہر و باطن کو سرتاپا یاد الٰہی کے تابع کرلیا جائے اور زندگی یوں بسر ہو کہ کسی حال میں بھی قلبی تعلق اس کی یاد سے منقطع نہ ہونے پائے۔ یہ تعلق اگر پختہ و مستحکم ہو کر مداومت اختیار کرجائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔

یادِ محبوب کے سوا کوئی نقش باقی نہیں رہتا

جسے لذت آشنائی کی دولت نصیب ہوجائے اس کی تمام تر محبتیں، چاہتیں، جذبات و کیف اور سوز و مستی کی کیفیتیں صرف ایک ذات کے لئے وقف ہوجاتی ہیں۔ اس کی تمام تر توجہات اور استغراق و انہماک کا مرکز صرف وہی ذات ہوجاتی ہے اور اس کے لئے محبوب سے دوری کا تصور باقی نہیں رہتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

جب مرکز دل و نگاہ محبوب ہو تو پھر اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور اس کی ہستی کے علاوہ ہر چیز معدوم ہوجاتی ہے اور کسی چیز کا وجود نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ کوئے محبوب میں عزت و ناموس اور ننگ و آبرو کو قربان کردینا ہی تقاضائے عشق ہے۔ عشاق کے قدم بے محابہ کوئے محبوب کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ خواجہ اجمیریؒ نے کیا خوب فرمایا ہے

بزن بہ سنگ ملامت زجاجۂ ناموس
بہ کوئے عشق بریز آبروئے تقویٰ را

’’محبوب کی گلی میں قدم رکھنا ہو تو پھر عزت و ناموس اور تقویٰ کے آئینے کو پتھر سے چکنا چور کر دو۔‘‘

حضرت اویس قرنیؒ سرخیل عاشقاں اور عشق و محبت کا وہ پیکر اتم ہیں جنہیں سرکار دو جہاں ﷺ کی قربت اور حضوری دور رہ کر بھی میسر تھی۔ فرط محبت میں جنوں کا غلبہ ہوا تو ان کا یہ حال ہو گیا کہ دیوانوں کی طرح گلیوں میں ننگے پاؤں چل رہے ہیں۔ پریشاں حال اور خستہ و زار۔ لڑکے پتھر مار رہے ہیں جن سے خون بہنے لگتا ہے وہ عاشق زار رک جاتا ہے اور بچوں سے کہتا ہے کہ ’’مجھے بڑے پتھروں سے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے مارو‘‘ ان میں سے کسی نے کہا ’’اویس! کیا تیرے دعویٰ عشق و محبت کی یہی حقیقت ہے کہ بڑے پتھروں کی تکلیف سے خوف زدہ ہو گئے ہو‘‘ وہ یہ سن کر رو پڑے اور فرمانے لگے ’’میں بڑے پتھروں سے نہیں ڈرتا بلکہ بات یہ ہے کہ ان سے خون بہنے لگتا ہے اور وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ یاد محبوب کا کوئی لمحہ بھی بے وضو بسر ہو۔ اس لئے میری تمنا ہے کہ محبوب سے تعلق برقرار رکھتے ہوئے تمہارے پتھر بھی کھاتا رہوں اور وضو بھی نہ ٹوٹے۔

(غنیۃ الطالبین:٦٥٦)

ہوش و مدہوشی صرف ایک ذات کیلئے ہوتی ہے

محبوب کی یاد میں بندے کا ہوش کھو بیٹھنا ایسی بے ہوشی ہے جو رشک صد ہوش مندی ہے۔ اس عالم میں وہ ماسوا اللہ سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور اس کا ہوش محبوب کے لئے بہرحال برقرار رہتا ہے۔

مشائخ عظام میں سے کسی نے ایک مرد کامل کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ عالم جذب ومستی میں مدتوں کسی ویرانے میں کھڑا رہا۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کتنی مدت سے اس حال میں ہیں؟ فرمانے لگے ’’کچھ دیر نہیں۔ البتہ مدہوشی کی یہ کیفیت نماز کے وقت ختم ہو جاتی ہے اور باقی سارا وقت عالم مدہوشی میں ہی گزرتا ہے۔‘‘

(کشف المحجوب:۴۴۷)

سہل بن عبداللہ ابوحفص حداد ابو العباس سیاری و مروزی امام مرد ابو یزید بسطامی ابوبکر شبلی ابو الحسن مصری اور جماعت کبار مشائخ رحمہم اللہ سے وابستہ اور مغلوب الحال تھے۔ جب نماز کا وقت آتا تو اپنے حال میں آکر نماز ادا کرتے جب فارغ ہوجاتے تو پھر مغلوب ہوجاتے۔

(کشف المحجوب، ۴۴۷)

نماز کے وقت عشاق کے لئے فی الحقیقت بارگاہ محبوب میں حاضری بادہ وصال سے مدہوشی اور حجابات اٹھنے کا وقت ہوتا ہے ان کا ہوش میں آنا چہرہ محبوب کا بے نقاب جلوہ دیکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہجر و فراق کی گھڑیاں مدہوشی میں کٹتی ہیں۔ نماز کا وقت آتے ہی ہجر کی گھڑیاں ختم ہوجاتی ہیں اور وصال و دید کے لمحے نصیب ہونے لگتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کا ہوش اور مدہوشی سب اللہ کے لئے ہے۔ نماز کا یہ باطنی ادب اس چیز کا متقاضی ہے کہ ساری زندگی یاد محبوب کے لئے وقف ہوجائے اور قلبی توجہ کا تمام تر میلان اس کی ذات کی طرف رہے۔ یہ کیفیت ہو تو پھر کوئی لمحہ محبوب کی یاد سے خالی نہیں گزرتا اور عشق و محبت میں محویت و استغراق کا وہ عالم نصیب ہوتا ہے کہ دل میں یاد محبوب کے سوا اور کسی کی یاد نہیں رہتی۔

۳۔ نیت کا باطنی ادب

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے نیت کے بغیر نماز عام حرکات و سکنات کا مجموعہ تو ہوسکتی ہے لیکن اسے نماز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نیت قلبی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جس کا باطنی ادب مشاہدہ جمال محبوب اور اس کی حضوری کی تڑپ و لگن ہے جو کہ طالب حق کی آخری منزل ہے۔ یہی اضطراب و بے قراری اس منزل کی طرف عاشق کو سرگرم سفر رکھتی ہے جو اس کا منتہائے مقصود تھا۔ حقیقت میں یہی وہ قیام ہے جس کے لئے اس نے اتنے جتن کئے اور طریقت کے کٹھن سفر کی اتنی صعوبتیں جھیلیں اور اسے کتنی جاں گسل آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ قرآن حکیم میں اس مقام کو اس طرح بیان کرتا ہے:

يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِيِّ

(القرآن، الانعام،٦:٥٢)

''جو صبح شام اپنے رب کو صرف اس کی رضا چاہتے ہوئے پکارتے رہتے ہیں۔''

عشاقِ حق صبح و شام اور رات گئے عبادت میں صرف اس لئے مشغول و منہمک رہتے ہیں کہ وہ محبوب کے رخ زیبا کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ان کا مدعا اور منتہائے مقصود فقط محبوب کی ایک جھلک دیکھنا ہوتا ہے اور وہ ہمہ وقت اس کے جمال کے بے حجاب نظارہ کرنے کے آرزو مند رہتے ہیں۔ ہجر و فراق کے صدمے وہ صرف اس لئے جھیلتے ہیں کہ انہیں وہ ساعت سعید نصیب ہوجائے جو بارگاہ محبوب میں حاضری کا مژدہ جانفزا لئے آتی ہے۔ یہی ان کی معراج ہے اور اسی کے لئے صحابہ کرام، عرفاء وصوفیاء اور اللہ کے برگزیدہ اور صالح بندے آرزو مند اور طلب گار رہے۔ یہی عشاق حق کی منزل مقصود تھی۔ پریشانیوں اور محرومیوں کا مداوا جمال محبوب کو بے نقاب دیکھنے سے ہی ہوتا ہے اور اسی کے لئے وہ تڑپتے اور پھڑکتے رہے۔ ان کی بیماری کا علاج سوائے دیدارِ محبوب کے اور کچھ نہیں۔ گویا وہ زبانِ حال سے پکار رہے ہوتے ہیں:

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب

درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور و مرکز جمال محبوب کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں محبوب حقیقی کی شمع کے پروانوں کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے:

تَرَاهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا

(القرآن، الفتح،٤٨:٢٩)

''تو (بھی) دیکھتا ہے کہ وہ (کبھی) رکوع کبھی سجود میں ہیں (غرض ہر طرح) اللہ سے اس کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں۔''

ان مست حال حضرات نے اپنا تن من دھن اور زندگی کی ساری راحتیں اور

آسائشیں محبوب کی ایک جھلک کے لئے قربان کردی ہوتی ہیں۔ وہ اس کی رضا کے حصول کے لئے مصروف عمل رہتے ہیں۔ جمال محبوب کی تمنا ان کے دل میں مچلتی رہتی ہے اور وہ اسی کی آرزو میں جیتے اور مرتے ہیں۔ جمال محبوب کی دید نہ ہو تو وہ اس کے آستانے کی زیارت پر ہی قناعت کرلیتے ہیں۔ ان کے حال کی کسی شاعر نے کیا خوب تصویر کشی کی ہے

نہ ہو دیدار میسر تو نہ ہو
در جاناں کی زیارت ہی سہی
نہ ہو قسمت میں مرے ساغر مے
ترے میخانے کی خدمت ہی سہی

حشر کا دن عاشقوں کی حاضری کا دن ہوگا۔ اس کا سماں کسی صاحب حال نے کیا دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے

عاشقاں را روز محشر با قیامت کار نیست
کار عاشق جز تماشائے جمال یار نیست

جمال خداوندی و مصطفوی ﷺ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں

بادہ عشق کے سرمستوں کا مزاج اور افتاد طبع جدا جدا ہے۔ ان میں سے کوئی فنا فی اللہ ہے اور کوئی فنا فی الرسول ﷺ، کوئی شمع رسالت کا پروانہ ہے تو کوئی میخانہ توحید کا رند بادہ مست۔ یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے کہ کسی کو ذکر مصطفی ﷺ سے قرار آتا ہے اور کوئی زمزمہ توحید سے راحت آشنا ہوتا ہے۔ کچھ عاشق جمال حضور کے دیدار کے لئے تڑپتے رہتے ہیں اور کچھ دل زدگان دیدار خداوندی کی آرزو میں جان جان آفریں کے حوالے کردیتے ہیں۔ کتنے لطف کی بات ہے کہ دونوں کا مرکز نگاہ بظاہر جدا ہے لیکن بباطن دونوں کے مضراب دل پر جو نغمہ چھڑتا ہے وہ ایک ہی ساز سے ہے۔ اقبالؒ نے ان عشاق کے بارے میں کیا خوب کہا ہے

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتہ شان جمالیم

مقامِ تاسف ہے کہ آج ہم نے شومئی قسمت سے توحید و رسالت کو بنائے نزاع و اختلاف بنا رکھا ہے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ ہم اس موضوع پر مناظرہ و مجادلہ کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔

عشاق کے دونوں گروہ گو اپنے اپنے احوال و کیفیات میں گم ہیں لیکن ان کے درمیان کوئی تضاد و تعارض نہیں پایا جاتا۔ ان میں کوئی اختلاف و تصادم کی صورت نہیں اور ایک کا درجہ دوسرے سے کم تر نہیں اس لئے کہ محبت تو صرف ایک ہی محبوب سے ہوسکتی ہے۔

رسم عاشق نیست بایک دل دو دلبرداشتن

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا کرنا محال ہے بلکہ درحقیقت یہ ایک ہی محبت کے دو رخ ہیں اور ایک ہی شمع حقیقت کی مختلف شعاعیں ہیں جن کا پرتو ایک ہی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ محبت کو ایک پیکر کی تلاش رہتی ہے جو کبھی خدا اور کبھی مصطفے ﷺ کے روپ میں آشکار ہوتا ہے دونوں کا منبع و سرچشمہ ایک ہی ہے۔ محبت کا مرکز تو لاریب ایک ہی ذات بے ہمتا ہے اور جس کا حسن غیر مرئی، غیر محسوس اور غیر مدرک ہے اس لئے جب حسن جلوہ نمائی چاہتا ہے تو وہ پیکر مصطفے ﷺ میں ڈھل کر جلوہ گر ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی حسن و جمال ایزدی کا مظہر اتم بن کر منصۂ شہود پر ظاہر ہوئی اور تشنہ جمال عاشقان حسن سرمدی کی محبت کا مرکز و محور بن گئی۔ اس کا حسن تو کائنات کے ذرے ذرے، دریاؤں، کہساروں، رنگا رنگ گلزاروں، سرسبز میدانوں میں ہے جس کی نیرنگی کو دیکھ کر چشم بینا مبہوت و حیرت زدہ ہے۔ اس کا حسن کائنات میں ہر سو منتشر ہے۔ محبت اس حسن منتشر کو احاطے میں لے کر اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ محبت کا کمال تک پہنچنے کے لئے

ضروری ہے کہ حسن کا ظہور بھی درجہ اتم ہو۔ پس اس حسن تام کے ظہور کے لئے خالق حسن و جمال نے وجود مصطفوی ﷺ تخلیق کیا۔ جس کا مثل اور مثیل ازل سے ابد تک پیدا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ مصور اول نے اس کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو وہ اپنے حسن و جمال کے مظہر اتم سے بے ساختہ محبت کرنے لگا۔ گویا حسن مطلق خود اپنے حسن کی محبت کا اسیر ہوگیا۔ جیسا کہ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں:

کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف

(عجلونی، کشف الخفاء، ۲: ۱۷۳، رقم: ۲۰۱٦)

''میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ سو میں نے چاہا کہ مجھے جاننے والا ہو۔''

اس ارشاد سے یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ خدا کی ذات ایک سرراز اور مخفی خزانہ تھا۔ پھر اس نے چاہا کہ اس کا حسن و جمال کائنات کی چشم بینا پر بے نقاب ہوتو اس نے وجود مصطفوی ﷺ کو اپنے دست مبارک سے تخلیق کیا اور اسے اپنے حسن و جمال کا مظہر اتم اور پیکر محسوس بنا دیا۔ حسن کی نقاب کشائی کا وقت آیا تو اپنے عاشقان جمال کو صلائے عام دی کہ آؤ اگر تم میرے حسن کو مجسم جیتا جاگتا چلتا پھرتا اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہوتو میرے اس محبوب کو دیکھ لو اور اس کے آستانہ جمال پر سر تسلیم خم کرلو۔ اگر چہ وہ خلقت کے اعتبار سے مخلوق ہے لیکن ظہور کے اعتبار سے سرتاپا میرے ہی حسن و جمال کا مظہر ہے۔

خدا اور رسول ﷺ کی محبت کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنا بڑی جسارت اور شرک کے مترادف ہوگا۔ شرک اس لئے کہ محبت کی دوئی امر محال ہے۔ اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی اصل اور ماہیت ایک ہی ہے۔ ان میں فصل اور جدائی کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ محبت کا کبھی ایک رخ غالب ہو اور کبھی دوسرا۔ تاہم محبت کا کعبۂ مقصود، مدینہ ہو یا عرش معلیٰ وہ ایک ہی مربوط اکائی کا درجہ رکھتی ہے۔

جزوِ ہفتم

ارکانِ صلوٰۃ کے آداب

نماز کے ظاہری اور باطنی آداب پر گزشتہ باب میں بحث کے دوران ان تمام پہلوؤں پر اظہار خیال شرح بسط کے ساتھ کیا جا چکا ہے جن سے نماز ایک طرف فرضیت کی حد تک ادا ہوجاتی ہے تو دوسری طرف روحانی اعتبار سے معراج کے درجہ پر جا پہنچتی ہے۔ اب ان فرائض و ارکان کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے جن کی صحتِ ادائیگی کے ساتھ نماز مشروط ہے اور اگر بفرض محال ان میں سے کوئی ایک بھی کسی کوتاہی کی وجہ سے پورا ہونے سے رہ جائے تو نماز سرے سے نہیں ہوتی۔ ایسے تمام بنیادی امور جن کی بجا آوری پر نماز کا کلی طور پر انحصار ہے ''ارکان صلوٰۃ'' کہلاتے ہیں۔ ان پر مستزاد کچھ اضافی آداب نماز بھی ہیں جنہیں واجبات، مستحبات اور سنن وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نماز کے ارکان

ارکان نماز کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ارکان اور واجبات میں کیا فرق ہے۔ نماز کے واجبات وہ امور ہیں جن میں سے اگر کوئی ادا ہونے سے رہ جائے یا اس میں کوئی کمی بیشی ہوجائے تو نماز فی نفسہ فرضیت کی حد تک ادا تو ہوجاتی ہے لیکن جب تک اس کا ازالہ سجدہ سہو کے ذریعے نہ کیا جائے ناقص رہتی ہے۔ اس کے برعکس نماز کے فرائض و ارکان میں سے کوئی فرض یا رکن چھوٹ جائے تو نماز مطلقاً ادا نہیں ہوتی اور سجدہ سہو سے بھی صرف فرائض و ارکان میں رہ جانے والے نقص یا کمی و بیشی کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ ارکان صلوٰۃ تعداد میں سات ہیں:

(۱) تکبیر تحریمہ (۲) قیام (۳) قرأت (۴) رکوع

(۵) سجود (۶) قعدہ اخیرہ (۷) خروج من الصلوٰۃ

تکبیر تحریمہ کا عمل نماز میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ قیام میں سورہ فاتحہ کے بعد قرآن مجید کا جتنا حصہ زبانی یاد ہو (حسب ضرورت) پڑھنا فرض ہے خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ قرات کے بعد رکوع و سجود کرنا اور رکعتیں مکمل کر کے قعدہ اخیرہ ادا کرنا اور پھر دائیں بائیں سلام پھیر کر نماز کی حالت سے باہر نکلنا یہ سات ارکان گویا نماز کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں جن کے اجتماع سے ہی فقہی و شرعی اعتبار سے نماز کامل متصور ہوتی ہے۔

ارکان نماز کے باطنی آداب

اس نماز کے لئے جو معراج المؤمنین کا درجہ رکھتی ہے ظاہری آداب کی تکمیل کے بعد باطنی آداب کا بہ اہتمام و کمال بجالانا لازمی اور ضروری ہے۔ ارکان و فرائض اور واجبات و سنن کی مکمل ادائیگی نماز کی ظاہری ہیئت کو فرضیت کی حد تک مکمل کرنے کا موجب بنتی ہے لیکن باطنی اعتبار سے وہ نماز جو احوال میں کسی قسم کا انقلاب اور تغیر پیدا نہ کرسکے بے روح رہتی ہے باطنی آداب کی کما حقہ بجاآوری سے ہی نماز کی روح بالیدگی اور تقویت پاتی ہے۔ حقیقی نماز وہی ہے جو فواحش و منکرات کا سدباب اور تمام نفسی برائیوں کا خاتمہ کرسکے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ

(القرآن، العنکبوت، ۲۹:۴۵)

”بے شک نماز (لوگوں کو) بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔“

یہ بات غور طلب ہے کہ آخر کیا سبب ہے کہ ہماری نماز سے مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور اس کے اثرات عملی طور پر ہماری زندگی پر مرتب ہوتے نظر نہیں آتے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم پنجگانہ نماز بھی باہتمام ادا کرتے ہیں لیکن برائی اور فحاشی کا ایک سیلاب ہمیں چاروں طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ اخلاقی خرابیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ پنج وقتہ نماز کے باوجود ہمارا ذات باری تعالیٰ سے سچا تعلق

بندگی استوار نہیں ہوتا۔ اجمالی طور پر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ناگفتہ بہ حالت نماز کے باطنی آداب کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اب ہم قدرے تفصیل کے ساتھ ان آداب کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ تکبیر تحریمہ

تکبیر تحریمہ جو نماز کا پہلا رکن ہے کے ظاہری ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مرد اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اور عورت اپنے شانوں تک اس حال میں اٹھا کر لے جائے کہ اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور انگلیاں قبلہ رخ ہوں۔ پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے حالت نماز میں داخل ہونے کے لئے ہاتھ باندھ لے تکبیر تحریمہ گویا نماز میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔

تکبیر تحریمہ کے باطنی ادب کو سمجھنے کے لئے ان حکمتوں کا جان لینا ضروری ہے کہ جو ابتدائے صلوٰۃ میں ہاتھ اٹھانے کے عمل میں کارفرما ہیں ورنہ بغیر ہاتھ اٹھائے بھی محض اللہ اکبر کہہ کر حالت نماز میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ ہماری روز مرہ گفتگو میں ہاتھ اٹھانا ''استعارۃ'' کسی شے سے کنارہ کشی کی علامت تصور ہوتا ہے جس سے یہ اظہار مقصود ہوتا ہے کہ ہم نے عملاً فلاں چیز کی محبت اور رغبت سے منہ موڑ لیا ہے تکبیر تحریمہ کا عمل بھی اپنے اندر یہ حکمت رکھتا ہے اور بنا بریں حالت نماز میں داخل ہونے کے لئے ہاتھ اٹھانے کا معنی یہ ہوا کہ ہم اپنے رب کے حضور ہاتھ اٹھا کر اس کے حکم کے آگے دنیا کی ہر شے کی محبت، رغبت اور خیال سے بریت و بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم یہ اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارے دل کے کسی گوشے میں سوائے یاد الٰہی کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ پس تکبیر تحریمہ کا باطنی ادب یہ ہوا کہ بندہ مادی چیزوں کی کشش و رعنائی اور چکا چوند سے اپنا دھیان ہٹالے اور جھوٹی آرزوں، تمناؤں کے سراب سے باہر نکل کر اپنا قلبی تعلق، محبوب حقیقی کی ذات سے اس حد تک استوار کرلے کہ دنیا کی محبت اور لذت کی کوئی رمق بھی اس کے دل میں باقی نہ رہے۔ اس باطنی ادب کا حق اس وقت تک ادا نہ ہوگا

جب تک قرآن حکیم کے اس ارشاد کے مطابق بندے کی طبیعت کا میلان ماسوا اللہ سے کٹ کر سراسر ذات باری تعالیٰ کی طرف نہ ہوجائے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً

(القرآن، المزمل، ۷۳:۸)

''اور آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیے اور سب کو چھوڑ کر (سب سے الگ ہوکر) اسی کے ہوجایئے۔''

اس آیہ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ رب العزت کا ذکر اس قدر کثرت و تواتر کے ساتھ کیا جائے کہ وہ وظیفہ حیات بن جائے اور اسے ورد زبان کرنے سے تھکن ماندگی اور بیزاری کے آثار ایک لمحہ کے لئے بھی طبیعت میں پیدا نہ ہوں بلکہ اس کی یاد بندے کے دل میں اس حد تک جاگزیں ہوجائے کہ پھر کبھی بھولے سے بھی غیر اللہ کا خیال اس میں در نہ آسکے اور علائق دنیوی سے تعلق منقطع کر کے بندہ اپنے معبود حقیقی سے آشنائی کا رشتہ اس درجہ محکم اور استوار کرلے کہ غیر کی آشنائی کا کوئی نقش لوح دل پر مرتسم نہ رہے۔

غیر اللہ کے خوف سے رہائی

دنیا کی تمام محبتوں، رغبتوں اور مکروہات سے کنارہ کشی کر کے رب کی عظمت و کبریائی اور حاکمیت اعلیٰ کا برملا اعتراف اور اقرار کرنا تکبیر تحریمہ کا دوسرا باطنی ادب ہے جس کا لازمی تقاضا ہے کہ ذات کبریا کی عظمت اور بڑائی کے زبانی اقرار کے بعد بندے کے دل سے غیر اللہ کا ہر قسم کا خوف کلیتًا نکل جائے اور وہ اس کی تصدیق اپنے عمل سے اس طرح کرے کہ ذات خداوندی کی کبریائی پر ایمان لانے کے بعد کسی اور کی بڑائی، بزرگی یا عظمت کا ذرہ بھر تصور اس کے وہم و گمان میں نہ رہے اور وہ غیر اللہ کے ہر خوف سے کلیتا بے نیاز ہوجائے۔ جب تک بندہ اس بات کو دل و جان سے تسلیم نہیں کرے گا کہ سب عظمتوں اور کبریائیوں کی مستحق و سزاوار صرف ایک ہی ذات ہے اور اس کے مقابلے میں باقی ہر چیز، ہیچ، ادنیٰ اور مہمل ہے اس کا دل غیر اللہ کے خوف کی آماجگاہ بنا

رہے گا۔ لہٰذا اللہ کے خوف کے سوا دل و دماغ کو ہر قسم کے خوف سے کلیتا پاک کر لینا ہی مومنانہ زندگی کا وہ نصب العین ہے جس کی طرف حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

هر که رمز لا اله فهمیده است
شرك را در خوف مضمر دیده است

کلمہ توحید کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ دل سے ہر قسم کا غیر اللہ کا خوف یکسر نکال دیا جائے کیونکہ غیر اللہ کا خوف ہی فی الحقیقت شرک فی التوحید ہے پس بندہ مومن وہ ہے جو خوف الٰہی کے سوا ہر دوسرے خوف سے رہائی پالیتا ہے۔ اور جو غیر اللہ کے خوف میں مبتلا رہا وہ گویا خدا کی توحید میں شرک کا مرتکب ہوا۔

اگر انسان اپنا محاسبہ کرے اور اپنے دل و دماغ کو ٹٹولے تو اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ اس نے اپنے حریم دل میں کتنے بت سجا رکھے ہیں جن کے خوف سے وہ ترساں ولرزاں رہتا ہے کوئی کسی کی سیاسی قوت، دولت اور جاہ و منصب کے آگے سرنگوں ہے تو کوئی کسی صاحب اختیار و اقتدار کی دہلیز پر اپنی جبین نیاز خم کئے ہوئے ہے اور کوئی خواہشات نفس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

اَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ

(القرآن، الفرقان، ۲۵:۴۳)

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے۔''

کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہم شرک فی التوحید کا ارتکاب شب و روز کرتے ہیں اور خدا کے حضور سجدہ ریز بھی ہوتے ہیں ہمارا حال بقول علامہ اقبالؒ

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

کا غماز ہے اور ہم نے اپنے دل کے اندر کتنے ہی صنم سجا رکھے ہیں جن کی پرستش ہمارا شعار ہے۔ ہم دن میں پانچ مرتبہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہوکر اس کی عظمت اور بڑائی کا زبان سے اقرار بھی کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم آستانہ غیر پر ناصیہ فرسائی بھی کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی منفعتوں اور مصلحتوں کی خاطر ہمیں ہر آن یہ خوف لاحق رکھتا ہے کہ کہیں دنیاوی آقاؤں کی بخشی ہوئی نعمتیں ہم سے چھن نہ جائیں۔ قول و فعل کے تضاد کا شکار ہوکر ہمیں اس امر کا رتی بھر احساس نہیں کہ خدا کے خوف سے بے نیاز ہوکر ہم باطل اور طاغوتی قوتوں کی ہیبت سے لرزہ براندام ہیں۔ اجتماعی سطح پر اغیار کی کاسہ لیسی ہمارا شعار حیات بن چکا ہے۔ اس کافرانہ طرز عمل نے ہمارے قوائے فکر و عمل کو مضمحل اور مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب اللہ رب العزت نے آنحضور ﷺ کو منصب نبوت پر فائز فرمایا تو آپ ﷺ کو اپنی پیغمبرانہ جدوجہد کے آغاز ہی میں بنی نوع انسان کو غیر اللہ کے خوف سے نجات دلانے اور ان کے دل میں خوف الٰہی جاگزیں کرانے کا حکم دیا:

یٰاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ○قُمۡ فَاَنۡذِرۡ○

(القرآن، المدثر، ۷۴:۱۔۲)

''اے کپڑے میں لپٹنے والے (محمد ﷺ) اٹھیے اور (پھر) لوگوں کو خدا کا خوف دلایئے (تاکہ وہ اپنے اعمال بد کے نتائج سے ڈریں)''

اس ارشاد خداوندی کی رو سے انسانیت کو غیر اللہ کے خوف کی زنجیروں سے رہائی دلانا اور اس کی جگہ خدا کا خوف پیدا کرنا ہی فریضہ رسالت قرار پاتا ہے جس کی بجا آوری کا حکم حضور ﷺ کو رب کائنات کی طرف سے دیا جارہا ہے کہ اے میرے محبوب ﷺ دنیائے انسانیت میں اعلان کردے کہ کبریائی کی حقدار و سزاوار صرف ذات خداوندی ہے اور اس کے خوف کے سوا ہر خوف کو دل سے نکال دیا جائے۔ تکبیر تحریمہ کا باطنی ادب بندے سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اپنی رب کی کبریائی کے تصور میں ڈوب کر نماز میں داخل ہو۔ اسی بنا پر بعض اہل اللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ

نماز میں داخل ہونے کے لئے اللہ اکبر کہتے ہیں تو اپنی آنکھوں سے اللہ کی کبریائی کا نظارہ کر لیتے ہیں۔

رسمِ عاشق نیست با یک دل دو دلبر داشتن

دل میں بیک وقت خالق اور مخلوق کی محبت یکجا نہیں رہ سکتی۔ تکبیر تحریمہ کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ صرف، اللہ کی محبت اور اس کی رضا و خوشنودی کا طالب ہوجائے۔ وہ دنیوی آرزوؤں اور خواہشوں کے سراب کے پیچھے نہ بھاگتا پھرے۔ جسے ایک مرتبہ محبوب حقیقی سے لگاؤ ہوجاتا ہے وہ لذت آشنائی کی کیفیت سے بہرہ ور ہوجاتا ہے اور اس کا دل دنیا کی ہر نعمت اور لذت سے بیگانہ و لاتعلق ہوجاتا ہے۔ حق بھی یہ ہے کہ جسے محبوب حقیقی کی محبت کی لذت نصیب ہوجائے اس کے لئے دُنیاوی محبت کی لذت ہیچ ہے۔

حضرت شیخ ذوالنون مصریؒ کا واقعہ

کسی نے حضرت شیخ ذوالنون مصریؒ سے نماز کی امامت کے لئے کہا انہوں نے بہت پس و پیش کیا لیکن لوگوں کے بڑھتے ہوئے اصرار کو دیکھ کر مصلیٰ پر کھڑے ہوگئے ابھی تکبیر تحریمہ کے لئے اللہ اکبر کہا ہی تھا کہ غش کھا کر گر پڑے اور کافی دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے۔ گویا اس مردِ حق نے ابھی زبان سے اللہ کی کبریائی کا اقرار کیا ہی تھا کہ الوہی عظمت و جبروت کا نظارہ بچشم سر کر لیا اور خرمن ہوش جل کر رہ گیا۔ زبان سے اللہ کی عظمت اور بزرگی کا اظہار کرنا تو آسان ہے لیکن لوحِ دل پر اس کی عظمت و کبریائی کا نقش کر لینا گویا جان سے گزر جانا ہے۔ اسی کا تصور علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تکبیر تحریمہ کے باطنی ادب میں ڈوب کر جب بندہ خود کو رب کائنات کے حضور پیش کرتا ہے تو اسے توکل و استغناء کی وہ دولت نصیب ہوجاتی ہے جس کی بدولت دنیا و

ماسوا کی ہر چیز اس کی نظر میں ہیچ اور بے وقعت ہوجاتی ہے اور غیر اللہ پر سے اس کا اعتماد جاتا رہتا ہے اور نتیجتاً اس کے دل سے دنیا کے ہر خوف کا کانٹا نکل جاتا ہے۔

راہ حق میں آزمائشوں اور صعوبتوں کا آنا ناگزیر ہوتا ہے لیکن بندہ حق کا طرہ امتیاز یہی ہے کہ رکاوٹیں اور مزاحمتیں خواہ کتنی ہی سنگین اور شدید کیوں نہ ہوں بالاخر وہ باطل کے مقابلے میں غالب ہوکر رہتا ہے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ چونکہ اللہ خود غالب، زبردست اور صاحب قوت و جبروت ہے وہ اپنے بندوں کو بھی غلبہ وقوت عطا فرما کر باقی دنیا کو ان کے زیرنگیں کردیتا ہے بشرطیکہ وہ صرف اور صرف اسی کی جلالت و بزرگی کا نقش اپنے دل پر ثبت کرلیں بقول اقبالؒ

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

بندہ مومن کو دریا راستہ دے دیتے ہیں اور آگ گل وگلزار ہوجایا کرتی ہے۔ وہ جب خدا کا ہوجاتا ہے تو اس خودسپردگی کے نتیجے میں کائنات کی ہر شے اس کے لئے مسخر کردی جاتی ہے اور جہان آب وگل پر اسے تصرف عطا کردیا جاتا ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

داناؤں کا قول ہے کہ اس دنیا کی مثال سائے کی سے ہے جس کے پیچھے ساری عمر بھاگتے رہو وہ ہاتھ نہیں آئے گا اور اگر اس کی طرف پشت کرکے چلنے لگو تو عمر بھر پیچھے رہے گا۔ وہ جو دنیا کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے ہیں ان کے ہاتھ سوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ نہیں آتا جبکہ دنیا کو پس پشت ڈالنے والے بندگان حق کو غلبہ وقوت سے نواز دیا جاتا ہے اور دنیائے دوں محکوم ومغلوب ہوکر ان کے زیرنگیں آجاتی ہے۔

صد افسوس کہ ہماری قلبی و ایمانی حالت اس قدر دگرگوں ہوچکی ہے کہ ہماری نمازیں نتیجہ خیزی کے اعتبار سے احوال حیات میں کوئی انقلاب برپا نہیں کرتیں۔ فی

الحقیقت ایک سجدہ بھی اگر صحیح ادا ہوجائے تو وہ پوری زندگی کے احوال کو بدل سکتا ہے۔

۲۔ قیام

قیام میں بندہ سر جھکائے ہوئے اپنے رب کے حضور دست بستہ کھڑا ہوتا ہے قیام کا باطنی ادب مجاہدہ ہے جس کے بارے میں اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں یوں ارشاد فرمایا ہے:۔

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ

(القرآن، البقرۃ،۲:۲۳۸)

’’اوراللہ کے حضور سراپا ادب و نیاز بن کر قیام کیا کرو۔‘‘

اس آیہ کریمہ میں باری تعالیٰ کا روئے سخن اپنے بندوں کی طرف ہے کہ میرے حضور سراپا عجز و نیاز اور پیکر ادب بن کر اس غلام کی طرح کھڑے ہوجاؤ جو اپنے آقا کے روبرو فرط ادب و نیاز سے اپنی نگاہیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

قیام کا باطنی ادب پکار پکار کر یہ تقاضا کر رہا ہے کہ ہاتھ باندھتے ہی بندہ اس تصور میں کھوجائے کہ وہ بہت بڑے دربار میں حاضر ہے جہاں بڑے بڑے صاحب جبروت بادشاہ بھی سائل کی طرح کھڑے ہوکر پیکر عجز و نیاز بنے رہتے ہیں اس کیفیت میں سرشاری کی دولت خال خال خوش بختوں کونصیب ہوتی ہے اور یہ بخت رسا کی علامت ہے اور اس سے محرومی کو سوائے حرماں نصیبی کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

غلامی اور اطاعت کا عہد

جس طرح ایک عظیم و برتر آقا کے حضور دست بستہ کھڑا ہوا غلام اپنے آقا اور ولی نعمت کا شناسا بندہ سب سے بڑے بادشاہ حقیقی کا اتنا مطیع و منقاد بن جاتا ہے کہ اس کے حکم سے سرمو انحراف کی تاب بھی اس میں باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اس کے حکم کی تعمیل کو اپنی فلاح و کامیابی اور اس کی نافرمانی کو اپنی تباہی و بربادی جانتا ہے تو قیام بندے کو

تربیت کے مراحل سے گزار کر اسے مجاہدے میں راسخ کر کے اس کے نفس کی تہذیب کا کام کرتا ہے۔

قیام کا باطنی ادب گویا وہ عہد ہے جو بندہ بحالت نماز اپنے رب سے باندھتا ہے کہ وہ زندگی بھر ہر حال اور ہر معاملے میں اس کی اطاعت و غلامی کو مقدم رکھے گا اور اس کی پوری زندگی رضائے الٰہی کے گرد گھومے گی۔ اس عہد و پیمان کے بعد اگر کوئی بندہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جس میں ذات خداوندی سے قطع نظر دوسروں کی خوشنودی اور رضا جوئی کو اولیت حاصل ہو اور وہ چند روزہ مال و دولت اور جاہ وشہرت کی خاطر غیر کی دریوزہ گری کرتا پھرے تو یہ کھلی منافقت اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوگا۔ باری تعالیٰ بندے کے دل میں چھپے ہوئے ارادوں سے بھی آگاہ ہے اور حسب ارشاد ربانی:

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوْبِكُمْ

(القرآن، الاحزاب، ۳۳:۵۱)

''اور جو کچھ تمہارے دل میں ہے اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔''

اس سے کوئی حال پوشیدہ نہیں۔ ہمارے طرزِ عمل میں کتنا بڑا تضاد اور منافقت پوشیدہ ہے کہ ہم نماز کی چند ساعتوں میں خالق حقیقی کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں اور باقی زندگی جھوٹے دنیاوی آقاؤں کی کاسہ لیسی میں گزار دیتے ہیں۔ اس کھلم کھلا منافقت اور دوغلا پن کے نتیجے میں سوائے محرومی اور ذلت و رسوائی کے ہمارے ہاتھ کیا آ سکتا ہے۔

مجاہدہ نفس

قیام کا باطنی ادب بندے کو مجاہدہ نفس کا درس دیتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(القرآن، العنکبوت، ۲۹:۶۹)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں (ہمارے لیے) کوشش کرتے ہیں ہم ضرور اپنا

راستہ انہیں دکھا دیتے ہیں اور بلاشبہ اللہ (کی حمایت و نصرت) نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

مجاہدے کا مقام کتنا بلند ہے کہ وہ بیدار بخت جو اللہ کی راہ میں اور اس کی رضا کی خاطر اپنے نفس سے جہاد کرتے ہیں ان پر سے تمام پردے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور الطاف و نوازشات کے دروازے ان پر کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہ خوش نصیب جب رضائے مولا کے تابع ہوکر حلقہ غلامی میں آجاتے ہیں تو وہ خودکو مالک حقیقی کے مملوک قرار دیتے ہیں یہ مسلمہ دستور ہے کہ کوئی مالک اپنی ملکیت میں کسی دوسرے کی شرکت کو گوارا نہیں کرتا اور غلامی صرف ایک ہی کی کی جاتی ہے ایسے میں غیر کی غلامی کا دم بھرنا بقول اقبالؒ صرف شرمندگی اور ندامت کو مول لینا ہے

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

جب بندہ آستانہ غیر پر جھکتا ہے تو اس کا اپنے تن اور من سے اختیار اور تصرف چھن جاتا ہے اور وہ مجبور محض ہوکر دوسروں کی مسلط کردہ زندگی گزارنے لگتا ہے۔

بنا بریں ''قیام'' کا باطنی ادب بندے کو تعلیم دیتا ہے کہ غلامی اور اطاعت صرف ایک ہی ذات کی ہونی چاہئے جو علیم و خبیر اور غالب و کارساز ہے۔ غیر کی غلامی سے تن اور من کی دنیا اجڑ کر رہ جاتی ہے جب بندہ ایک عظیم و برتر شہنشاہ اور کائنات کے خالق و مالک کا تصور اپنے اوپر حاوی کرلیتا ہے تو اس کے دل میں وہ رقت اور سوز و گداز پیدا ہوجاتا ہے کہ آنکھیں پرنم ہوجاتی ہیں، خود سپردگی کی کیفیت دل میں گھر کرلیتی ہے دنیا کے ہر خوف کا کانٹا دل سے نکل جاتا ہے اور دھیان میں باری تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے سوا اور کسی کے تصور کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

۳۔ قرأت

نماز کا تیسرا رکن قراءت ہے جس کے بارے میں قرآن پاک میں یوں ارشاد

فرمایا گیا ہے:۔

فَاقْرَءُ وَامَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ

(القرآن، المزمل،۷۳:۲۰)

''پس جتنا آسانی سے ہوسکے اس (قرآن) سے پڑھ لیا کرو۔''

دوران نماز قراءت کے حکم میں آسانی کوملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے یعنی صرف اس قدر قرآن پڑھا جائے جو طبیعت پر بوجھ اور گرانی کا باعث نہ بنے۔ خدا کا اپنے بندوں پر کتنا بڑا احسان، شفقت اور مہربانی ہے کہ اس نے اتنا قرآن پڑھنے کی اجازت دے دی ہے جتنا انہیں آسانی سے یاد ہوسکے۔ قرآن کلام ربی ہے اور اس کا پڑھنا گویا اللہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرنے کی بنیاد پر بڑی فضیلت کا حامل ہے اس میں ایسے ایسے مقامات آتے ہیں کہ کہیں بندہ اپنے مولا سے کچھ طلب کر رہا ہوتا ہے تو کہیں التجاء و دعا اور مناجات میں محو اپنے گناہوں کی معافی مانگ اور اس کی حمد وثناء بیان کر رہا ہوتا ہے جیسے جیسے پیرایہ بیان اور اسلوب و انداز کلام بدلتا ہے تو نجات، فوز و فلاح اور جنت کی بشارتوں کا ذکر آتے ہی دل میں غنچہ امید کھل اٹھتا ہے۔ عذاب نار، عقوبت سقر اور ہاویہ کا بیان ہوتا ہے تو خشیت الٰہی سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔

قرآن سرتاپا ذکر الٰہی ہے جس سے دلوں کا حزن و ملال راحت و اطمینان میں بدل جاتا ہے قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(القرآن، الرعد،۱۳:۲۷)

''جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

اہل اللہ کو بلا شبہ اطمینان اور سکون اللہ کی یاد سے ہی ملتا ہے۔ قراءت کا باطنی ادب و دوام ذکر ہے جس کا تقاضا ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے بندہ اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنے اوپر ایسی کیفیت طاری کرلے کہ وہ خدا سے ہمکلام ہورہا ہے۔ دل و دماغ

میں یہ تصور جاگزیں ہو کہ وہ ذات کبریا کی بارگاہ میں حاضر ہے اور اس کی زبان سے نکلا ہوا قرآن کا ایک ایک لفظ اس کی صفات کو لوح دل پر مرتسم کر رہا ہے گویا ہر لمحہ اس کی نئی سے نئی شان کا مظہر بنا آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا ہے، دوام ذکر سے مراد یہ ہے کہ ذکر الٰہی رگ و پے میں اس طرح سما جائے کہ کوئی لمحہ اس سے خالی نہ ہو۔ ہجر و وصال میں اس کی یاد یکساں مزہ دے اور دل و جان کو سکون و اطمینان اور راحت کا مژدہ نصیب ہو۔ ذکر خداوندی کی لذت اور شیرینی و حلاوت میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کسی دنیاوی چیز کے مل جانے سے لذت اور چھن جانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ محبوب کا مل جانا راحت جاں اور اس کی جدائی رنج و آزار کا باعث بنتی ہے لیکن صرف اللہ کی یاد اس سے مستثنیٰ ہے وصال ہجر کی دونوں صورتیں

وداع و وصل جداگانہ لذتے وارد

کا مصداق ہیں گویا اس کا وصل لذت و سرشاری کا موجب تو ہے ہی، ہجر و جدائی کی ساعتوں میں بھی اس کی یاد بشاشت طبع اور طمانیت کا باعث بنتی ہے۔

اہل ذکر ہر حال میں مست رہتے ہیں۔ محبان الٰہی جن کے دل میں عشق و محبت کی شمع جل رہی ہو۔ اس کے ہجر میں مصروف گریہ رہتے ہیں، ان کو تڑپنے اور پھڑکنے میں وہ مزہ اور بندگی میں وہ سرور ملتا ہے کہ وہ زبان حال سے بقول اقبالؒ پکار اٹھتے ہیں:

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

یہی اللہ کے مقبول بندے ہیں جن کے لئے **لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ** کا مژدہ جانفزا ہے۔ مکروہات دنیا کا کوئی خیال اور کوئی خوف انہیں حزن و ملال سے آشنا نہیں کرسکتا۔ وہ ہر حال میں اللہ کی یاد کو حرز جاں بنائے رہتے ہیں اور اسی میں انہیں سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

کلام محبوب سے بہتر کوئی کلام نہیں

جنہیں قرأت کے باطنی ادب کی شناسائی نصیب ہوجاتی ہے۔ انہیں محبوب حقیقی

کے کلام میں وہ قرار ملتا ہے کہ دنیا کا ہر ایک کلام اس کے مقابلے میں ہیچ اور بے مایہ نظر آتا ہے ان کی طبیعت کو کسی اور ذکر سے لطف نصیب ہی نہیں ہوتا۔ وہ جو لذت قراء ت کی دولت سے محروم ہیں۔ انہوں نے گویا قرآن کو سمجھا ہی نہیں۔

ایک مرید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگا کہ حضرت کیا سبب ہے کہ ایک اچھا شعر سن کر طبیعت جس طرح مچل اُٹھتی ہے اور جو لطف آتا ہے وہ کیفیت قرآن سن کر نصیب نہیں ہوتی۔

شیخ نے مرید کو جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ تو ابھی خدا کے قرب ومحبت کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوا ورنہ قرآن کے علاوہ کسی اور کلام سے تجھے لطف وسرور حاصل نہ ہوتا۔ جو کوئی قرب کی دولت سے بہرہ ور ہوجاتا ہے اسے قرآن سننے سے وہ ناقابل بیان سوز وگداز اور لذت وحلاوت ہوتی ہے کہ غیر اللہ کے کلام کی سماعت سے اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔

حق یہ ہے کہ محبوب کا کلام بھی محبّ کو حد درجہ محبوب ہوتا ہے، اس کی یاد وجہ کیف ونشاط اور اس کا تذکرہ مسرت انگیز، لذت آفریں اور نشاط آگیں ہوتا ہے۔ اس کی شیرینی وحلاوت، ہمہ وقت مشام جان میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ دنیا کے کسی کلام کو یہ مقام حاصل نہیں ہے۔

حدیث مصطفوی ﷺ کی شان وعظمت

اللہ کے اپنے کلام کی محبوبیت میں تو کسی کو کلام نہیں لیکن اسے اپنے محبوب ﷺ کے کلام سے جس غایت درجہ محبت ہے وہ احاطہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ حضور اکرم ﷺ کا کلام پاک جو مدون ہوکر حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اس کی بے مثال عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مقام جہاں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ درس حدیث دیا کرتے تھے، وہاں آج تین سو سال گزر جانے کے باوجود انوار وتجلیات الٰہی کا نزول رہتا ہے۔ جس کا مشاہدہ اہل نظر دن رات کرتے ہیں۔

راقم کو بھارت کے گزشتہ دورے میں اس مقام کی زیارت سے شرف یاب ہونے کا موقعہ نصیب ہوا۔ اس مقام کو تقدس کا یہ درجہ اس لئے حاصل ہوا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے محبوب کی باتیں دہرائی جاتی رہی ہیں۔ اللہ کی نظر میں کلام محبوب اسی عظمت و رفعت کا حامل ہے کہ اس سے نسبت رکھنے والے محراب ومنبر، انوار وتجلیات کا مہبط ومصدر بن کر زیارت گاہ خاص و عام ہوگئے ہیں۔ اللہ کے محبوب کے کلام کی عظمت شان کا یہ حال ہے تو خود اللہ کے کلام کی عظمت ونورانیت کا عالم کیا ہوگا۔ اللہ اکبر! قرآن کا پڑھنا سننا اور سینے میں جگہ دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ ہمارا جزو ایمان ہے کہ قرآن لفظاً اورمعناً سراسر کلام الٰہی ہے جسے باری تعالیٰ نے جبرائیل امین کے ذریعے اپنے حبیب ﷺ کے قلب انور پر نازل فرمایا پس قراءت کا باطنی ادب ذکر دوام سے محبوب کی یاد کو دل میں تازہ اور اس تصور کو پختہ کرتے رہنا ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کی یاد سے خالی بسر نہ ہو۔

۴۔ رکوع

رکوع کا معنی جھکنے کا آتا ہے جو حالت تواضع و انکساری کا آئینہ دار ہے رکوع کا باطنی ادب یہ ہے کہ بندہ اپنی زبان سے سبحان ربی العظیم پکارے یعنی اپنے رب کی عظمت اور اس کے ہر نقص وعیب سے پاک ہونے کا اقرار و اعلان کرے تو جس طرح اس نے اس کی عظمت و بڑائی کے آگے ہر ایک کو حقیر اور کم تر اور ادنیٰ تسلیم کرلیا تھا اسی طرح سبحان ربی العظیم کہہ کر اس کی عظمت کے مقابلے میں خود کو نہایت عاجز' بے کس اور ادنیٰ تصور کرے۔ ربی العظیم میں متکلم کے صیغہ کا استعمال اسی اعتراف پر دلالت کر رہا ہے کہ بار الٰہ میں تیرے مقابلے میں حد درجہ حقیر بے کس و بے بس عاجز اور ناتواں ہوں، یہ حقیقت انسان پر آشکارا ہوجائے کہ اس عظیم اور بزرگ و برتر ذات کے مقابلے میں اس کی اپنی کوئی حقیقت وحیثیت نہیں تو تکبر و رعونت اور تفاخر و مباہات کا شائبہ بھی نہاں خانہ دماغ میں باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا رکوع کا باطنی ادب انسان میں یہ احساس جاگزیں کرنا چاہتا ہے کہ چونکہ خلقت کے اعتبار سے وہ تواضع و انکساری اور عاجزی وفروتنی کا مرقع ہے اسے قطعاً زیب نہیں دیتا کہ وہ تکبر، غرور، رعونت اور برتری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں کو

ہیچ و کمتر سمجھے اگر وہ اپنی اس روش سے باز نہیں آتا تو گویا وہ اپنے عمل سے رکوع کے اس باطنی ادب کی نفی کر رہا ہے جو انسان کو سرتاپا متواضع و منکسر دیکھنے کا متقاضی ہے۔

تواضع و انکساری رفعت کا پیش خیمہ ہے

رسول مقبول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے آگے جتنا جھکتا چلا جاتا ہے وہ ذات اسے اتنا ہی سربلند کرتی چلی جاتی ہے، عاجزی، تواضع، خاکساری اور تذلل اسے انتہائی پسند ہے جب کہ غرور، تکبر، رعونت و تفاخر اور بے بس و مجبور بندگان خدا پر ظلم و ستم اس کے قہر و غضب کو دعوت دیتا ہے اللہ کی راہ میں جھکنے والے بلندی و رفعت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ درخت کی جس شاخ پر جس قدر زیادہ پھل ہوتا ہے وہ جھکتی چلی جاتی ہے یہی حال انسان کے شجر حیات کا ہے۔ اللہ کا جتنا زیادہ فضل و احسان اور لطف و کرم کسی انسان پر ہوتا ہے وہ اسی قدر جھکتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی عجز و انکساری کا پیکر بن جاتی ہے اس کے برعکس جوں جوں وہ اس کے الطاف و عنایات سے محروم ہوتا ہے اس میں جھوٹی عزت، برتری، انا پرستی اور غرور و تکبر کے جذبات فروغ پانے لگتے ہیں۔ جو شخص منصب، جاہ و عزت اور قدر و منزلت کو اپنا حق سمجھتا ہے اور ان سے محرومی کی صورت میں پیکر غیض و غضب بن جاتا ہے اس نے گویا اپنے آپ کو مقام بندگی پر نہیں بلکہ خدائی کے مقام پر متصور کر رکھا ہے جو ہرگز اس کے لئے روا نہیں۔ اس لئے کہ عظمت و کبریائی کی سزاوار اور مستحق صرف خدا کی ذات بے ہمتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حضور ﷺ کی تعظیم کے لئے قیام

حضرات صحابہؓ حضور ﷺ کی تعظیم و تکریم کس طرح کرتے تھے، اس کا تذکرہ کتب احادیث میں جا بجا ملتا ہے۔ جب آپ تشریف لاتے اور مجلس میں بیٹھے ہوئے صحابہ کرام کھڑے ہونے لگتے تو حضور ﷺ انہیں اس سے منع فرما دیتے البتہ جب آپ جانے لگتے تو حضور ﷺ انہیں کھڑا ہونے سے منع نہ فرماتے۔ حضور ﷺ کا یہ وطیرہ صحابہ کو آداب سکھانے کے لئے تھا جس سے بعض کم فہم اور سطح بین لوگوں نے غلط معانی اخذ

کئے ہیں۔ حضور ﷺ کا آنے والے کے لئے قیام کرنے سے صحابہ کرام کو روکنا، معاشرتی ادب کی تعظیم کے لئے تھا اور فی الواقع انہیں تعظیم سے روکنا نہ تھا ورنہ واپسی کے وقت بھی انہیں کھڑا ہونے سے روک دیتے۔ حضور ﷺ کی آمد پر صحابہ کا تعظیماً قیام بھی روایت نے ثابت کیا ہے اور یہ صحابہ کی سنت ہے صحابہ کا شعار یہ تھا کہ نماز با جماعت کے آغاز میں جب تکبیر کہنے والا حی علی الصلاۃ کے الفاظ پر پہنچتا تو بالعموم آپ ﷺ اسی وقت حجرہ مبارک سے باہر تشریف لاتے اور صحابہ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی باجماعت بہر تعظیم کھڑے ہوجاتے۔ صحابہ کی تعظیماً کھڑے ہونے کی یہ ادا اللہ رب العزت کو اتنی پسند آئی کہ حی علی الصلوۃ کے کلمات پر کھڑے ہوجانا شریعت مطہرہ میں امت کے لئے مسنون و مستحب قرار دیا گیا۔ اللہ کے محبوب بندوں کی ادائیں بسا اوقات بارگاہ خداوندی میں اتنی مقبول و پسندیدہ ہوجاتی ہیں کہ انہیں شعائر اللہ کے تحت قیامت تک جمیع امت کے لئے قابل تقلید و اتباع ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ یہ ادب و عشق کے وہ تقاضے ہیں کہ عقلی طور پر ان کی توجیہہ ممکن نہیں۔ صفا و مروہ پہاڑیوں کے درمیان پانی کی تلاش میں دیوانہ وار دوڑنا اور مسلسل سات چکر لگنا، حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی یہ ادا اللہ کے ہاں اتنی مقبول ہوئی کہ قیامت تک کے لئے ہر حاجی اور زائر بیت اللہ کے لئے اس کی اتباع لازم ٹھہرا دی گئی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ واقعہ اسی طرح تازہ ہے اور اس کی یاد امتداد زمانہ سے محو نہیں ہوئی۔ اللہ کو اپنے محبوب بندوں کی اداؤں سے اس قدر محبت ہوجاتی ہے کہ انہیں بار بار دہراتے رہنے کا عامۃ الناس کو حکم دے دیا جاتا ہے اگرچہ عقلاً اس کا کوئی جواز ہی سرے سے موجود نہیں اللہ کے بندوں کی یاد سے رحمت خداوندی جوش میں آجاتی ہے اور عصیاں کوش انسانوں کے لئے بخشش و مغفرت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

حضور ﷺ بطور معلم انسانیت

حضور اکرم ﷺ تمام نوع انسانی کے لئے معلم اخلاق ہیں، آپ ﷺ انسان کی نفسیاتی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ و آشنا تھے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ص کے ذریعے آنے والے دور کے تمام انسانوں کو مجلسی آداب کی تعلیم دی تاکہ ان کو معاشرتی اور

اخلاقی ناہمواریوں سے بچنے کی تربیت دی جاسکے۔ حضور ﷺ نے اپنے سے بڑوں، بزرگوں اور استادوں کی تعظیم وتکریم کے انداز سکھائے اور تعلیم دی کہ جب کوئی قابل تعظیم کسی مجلس میں آنے لگے تو اس کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے سے احتراز کیا جائے کیونکہ اس طرح اس کے دل میں کبر و رعونت اور خود ستائی جیسے سفلی جذبات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے البتہ جب وہ جانے لگے تو اس کی عزت و احترام ملحوظ رکھنا بہرحال لازمی ہے اور اس کے لئے تعظیماً کھڑا ہوجانا چاہئے۔ یہ اخلاقی اور نفسیاتی تعلیم تھی جو معلم انسانیت نے حکمت و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق اپنی امت کو دی تاکہ لوگ نفس کی کبر و رعونت سے چھٹکارا پاکر اپنے اندر تواضع و انکساری اور خاکساری کے اوصاف حمیدہ پیدا کریں۔

حضرت غوث اعظمؒ کی مجلس وعظ کا واقعہ

حضرت سیدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے احوال میں مذکور ہے کہ جب آپ مجلس وعظ میں تشریف لاتے تو لوگ احتراماً کھڑے ہوجاتے۔ ایک دفعہ آپ لوگوں کے جم غفیر میں وعظ کے لئے تشریف لائے اور مجمع کو چیرتے ہوئے مسند پر پہنچ گئے۔ لیکن ایک شخص بھی تعظیماً کھڑا نہ ہوا۔ اس پر حاضرین میں سے ایک شخص کے دل میں یہ خیال گزرا کہ آج حضرت کے استقبال کے لئے کوئی شخص بھی نہیں اٹھا۔ آپ فورا اس کے خیال سے مطلع ہوگئے اور اسے پکڑ کر فرمانے لگے کہ بندگان خدا کے دل اہل اللہ کے تصرف میں ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں تو کسی کو اپنی تعظیم کے لئے اٹھنے دیں اور چاہیں تو روک دیں یہ احوال کی مختلف صورتیں اور کیفیات ہیں جو بدلتی رہتی ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صاحب حال ان معاملات و کیفیات سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔ کوئی ان کے لئے اٹھے یا نہ اٹھے وہ اسے ذرہ جتنی بھی اہمیت نہیں دیتے۔

استغفار سے دل ریا سے پاک ہوتا ہے

حضرت داتا گنج بخشؒ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ دو صاحب حال بزرگ آپس میں ملے ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ میں اپنے آپ کو اس لئے برا بھلا کہتا ہوں

کہ لوگوں کی نظروں سے چھپ سکوں اور میری نیکیاں ان کی نظر سے اوجھل رہیں تا کہ اس طرح میں ریا سے بچ جاؤں اور میرا عمل خالصتاً اللہ کے لئے ہو جائے دوسرے بزرگ یہ سن کر کہنے لگنے کہ آپ ابھی ریا سے پاک نہیں ہوئے اگر آپ کا عمل خالصتاً اللہ کے لئے ہوتا تو اس خیال تک سے بے نیاز ہوتے کہ کون آپ کو دیکھ رہا ہے اور کون نہیں دیکھ رہا۔

انسان کو چاہئے کہ وہ اس حد تک عجز و نیاز اور انکساری و تواضع کا پیکر بن جائے کہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے پھر نہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو اور نہ گالیاں سن کر بدمزہ۔ اگر اسے یہ شان بے نیازی اور استغناء بھی نصیب نہیں ہوا تو وہ سمجھ لے کہ ابھی اس کا باطن نفسانی کمزوریوں میں لت پت ہے۔

بحالت نماز رکوع کا باطنی ادب اس بات کا متقاضی ہے کہ بندہ دل سے غرور و تکبر، رعونت ونخوت اور فخر و مباہات کے ہر شائبے کو مٹا کر انکسار و تذلل کا پیکر بن جائے کہ یہی عافیت اور نجات کی راہ ہے۔ وہ اپنے آپ سے عہد کرے کہ اس کا رویہ اور طرز عمل تمام مخلوق خدا سے بالعموم اور مظلوموں، کمزوروں اور ناتوانوں سے بالخصوص تواضع و انکساری پر مبنی ہوگا۔ البتہ اس کا سابقہ اگر ظالم و جابر انسانوں، متکبر و مستبد حاکموں اور وقت کے فرعونوں، شدادوں اور نمرودوں سے ہو تو ان کے ساتھ وہ تکبر آمیز انداز اختیار کرے کہ یہ تکبر خود صدقہ اور عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ متکبر لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا ہمیشہ سے اللہ والوں کا شیوہ رہا ہے وہ فقراء کے لئے پیکر عجز و نیاز اور بدمست و جابر حکمرانوں کے سامنے چٹان بن جاتے ہیں۔

سیدنا غوث اعظمؒ کا معمول تھا کہ آپ وقت کے کسی حاکم کو خط لکھتے تو اس کا مضمون کچھ اس طرح ہوتا اے فلاں! ابن فلاں! عبدالقادر تجھے اس کام کا حکم دیتا ہے یعنی آپ کے خطاب کا لہجہ تحکمانہ ہوتا تھا۔ اولیائے کرام کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ سلاطین وقت کے سامنے کبھی دامن مراد نہیں پھیلاتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مغل فرمانروا جلال الدین محمد اکبر کی غیر شرعی حرکات پر اسے سختی سے ٹوکا۔ انہوں نے کفر و الحاد کی یلغار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے صدائے حق بلند کی اور ایمان کی طاقت سے اکبر کے غرور شہنشاہی کو

خاک میں ملا دیا۔ اللہ کی کبریائی پر ایمان و ایقان کا تقاضا ہے کہ جابر و متکبر حاکموں کے سامنے ڈٹ کر کلمہ حق بلند کیا جائے۔ یہ وہ جہاد ہے جس کا علم بلند کرنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ فقراء و غرباء اور یتامی و مساکین کی خاطر مدارات کرنا اور ان سے تواضع و انکساری سے پیش آنا ہمیشہ اہل حق کا شیوہ رہا ہے۔ اور یہی رکوع کا باطنی ادب ہے۔

حرف آخر

رکوع کا باطنی ادب ہر ایک کے لئے یہ امر لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ عزم صمیم کے ساتھ اس بات کا عہد کرے کہ زندگی بھر ذاتی پندار اور جھوٹے فخر و غرور کے بت کے آگے اپنی جبین نیاز خم نہیں کرے گا اور تواضع و انکساری کو اپنا مستقل وطیرہ اور شعار بنائے گا۔

یہ ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم نے عزت کا معیار مال و دولت، جاہ و حشم اور مادی شان و شوکت کو بنا رکھا ہے۔ ہم نے لوگوں کی عزت کا معیار ان کے لباس، ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمود و نمائش، طاقت اور اقتدار کو سمجھ لیا ہے جبکہ کسی غریب، خستہ حال اور دریدہ لباس شخص کے ساتھ ہمارا برتاؤ انتہائی مضحکہ خیز اور ہتک آمیز ہوتا ہے جب تک ہم ان جھوٹے اور خود ساختہ تصورات اور بزرگی و برتری کے جھوٹے معیارات کو نہیں بدل لیتے اعلیٰ اسلامی اقدار ہماری زندگی میں فروغ نہیں پاسکتیں اور نہ ہی احترام آدمیت پر مبنی اسلامی معاشرے کی تعمیر کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔

اسلام انسانی فکر کے تراشیدہ معیارات کو عزت ناپنے کا پیمانہ تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اللہ کے ہاں عزت و تکریم کا مستحق صرف وہی ہے جو صاحب تقویٰ ہو۔ کفار و مشرکین حضور اکرم ﷺ کو طعنہ دیتے تھے کہ آپ کے ساتھی غلام، یتیم، غریب اور مفلوک الحال لوگ ہیں جن کے ساتھ ہمیں اٹھنا بیٹھنا گوارا نہیں۔ اس لئے ہم آپ پر ایمان نہیں لاسکتے۔ ان بدبختوں کی اس برخود غلط سوچ کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ

(القرآن، الانعام، ۶:۵۲)

’’آپ ان (شکستہ دل و خستہ حال) لوگوں کو (اپنی صحبت و قربت سے) دور نہ کیجئے جو صبح وشام اپنے آپ کو صرف اس کی رضا چاہتے ہوئے پکارتے رہتے ہیں۔‘‘

اللہ رب العزت نے اپنے حبیب ﷺ سے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کی طعن و تشنیع آمیز باتوں میں آ کر ان بظاہر مسکین اور خستہ حال لوگوں سے اپنی نظریں مت پھیر کہ یہ محروم اور بدحال لوگ تیری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں اگر ان سے صرف نظر کیا گیا تو ہم چشم التفات تجھ سے پھیر لیں گے۔ یہ انتباہ امت کی تعلیم کے لئے تھا کہ وہ امارت، جاہ و منصب اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہوکر سوسائٹی کے غریب اور محروم (Have Nots) طبقہ کے لوگوں کو حقیر اور ادنیٰ نہ جانیں ورنہ حضور ﷺ کا اپنا طرز عمل اس حکم کے مصداق نہیں تھا۔ امیری اور غریبی، مال و دولت کی زیادتی، یا کمی فی نفسہ قابل نفرت نہیں۔ عزت اور شرف انسانی کا معیار صرف تقوی اور خدا خوفی ہے۔

مقام افسوس ہے کہ ہم میں سے بہت سے عابد شب زندہ دار اور عالم دین الا ماشاء اللہ اقتدار اور صاحبان جاہ و منصب کے دریوزہ گر ہیں، اہل ثروت اور متمول لوگوں کی خوشامد اور کاسہ لیسی ان کا شعار ہے۔ جب ان کے پاس اللہ کے غریب پریشان حال اور عاجز بندے کسی غرض سے آتے ہیں تو وہ انہیں اپنے زہد وورع اور تبحر علمی کے زعم میں دھتکار دیتے ہیں۔ ان حضرات کو اپنے احوال بدل کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں تائب و نادم ہونا چاہئے ورنہ ایسے رعونت پسند اور متکبر افراد کا انجام فراعین مصر سے مختلف نہ ہوگا۔

ارکان صلوٰۃ میں سے تکبیر تحریمہ، قیام، قراءت اور رکوع کے آداب باطنی پر بالتفصیل گفتگو کے بعد اب بقیہ تین ارکان (سجدہ، قعدہ اخیرہ اور خروج عن الصلوۃ) ہمارے موضوع سخن ہیں۔

۵۔ سجدہ

رکوع کے بعد قومہ سے فارغ ہوتے ہی نماز کا اگلا رکن سجدہ ہے جس میں بندہ

اپنے جسم کے آٹھوں اعضاء زمین پر بچھا دیتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قبلہ رخ پھیلا کر اپنی ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دیتا ہے۔ حالت سجدہ انسان کی غایت درجہ عاجزی، تذلل، تضرع اور کمال خشوع وخضوع کی آئینہ دار ہے جس میں وہ اپنے رب سے ہمکلام ہوتا ہے اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ’’پاک ہے میرا بلند مرتبہ رب‘‘ کہہ کر اس کے بلند و برتر، پاک اور منزہ ہونے کا دل سے اقرار کرتا ہے۔

سجدہ کے آداب اور اس کے باطنی تقاضے

سجدہ انسان کو معرفت نفس عطا کرتا ہے جس سے اسے بارگاہ ایزدی میں انتہائی قرب نصیب ہوتا ہے بالفاظ دیگر سجدہ معرفت نفس کا ذریعہ اور قرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ و زینہ ہے۔

عام طور پر انسان اپنے چہرے، ناک، پیشانی اور سر کو اپنی عزت، شان وشوکت، بزرگی اور عظمت و وجاہت کی علامت تصور کرتا ہے۔ سر بلند ہونا انسان کی عزت اور اس کی شوکت کا آئینہ دار سمجھا جاتا ہے اور یہ اپنا سر اپنے ابنائے جنس میں سے کسی کے آگے جھکانا گوارا نہیں کرتا۔ لیکن اپنے رب کے حضور اس کا سر جھکانا اس کی عاجزی، تضرع، خاکساری و انکساری، نفی ذات اور بے بضاعتی و تذلل کی وہ انتہائی حالت ہے جس سے بڑھ کر بارگاہ خداوندی میں اور کسی حالت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی سجدے کا منتہائے مقصود ہے۔

سجدہ میں انسان کے بے بضاعت ہونے کا اعتراف

اللہ ﷻ کی کبریائی اور عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بندہ جب اپنی ناک، پیشانی اور دونوں ہاتھ اوندھے منہ زمین پر رکھ کر اپنے سر کو خاک پر ٹیک دیتا ہے اور سبحان ربی الاعلیٰ کے الفاظ کے ساتھ اپنے رب کو پکارتا ہے کہ اے اللہ! تو کتنا بلند و برتر اور پاک ہے، تو اسے اپنے نفس کی حقیقت اور معرفت کا ادراک ہوجاتا ہے اور وہ سراپا عجز و نیاز،

اپنی کم مائیگی اور اپنے ادنیٰ ہونے کا اعتراف کرلیتا ہے۔ اس سے اس کی رعونت، تکبر، انا اور خود پسندی جیسی نفسانی قباحتوں کے سارے بت پاش پاش ہوجاتے ہیں۔ انسان کا ضمیر اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتا ہے کہ اے ظالم انسان تو نے اپنی جھوٹی عزت و پندار کا بھرم قائم رکھنے کے لئے کتنے بے گناہوں، کمزوروں اور زیر دستوں کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا، جھوٹی آن بان، شان و شوکت اور عارضی دبدبے کو برقرار رکھنے کے لئے ہوائے نفس کے سرکش گھوڑے پر سوار رہا۔ گویا سجدہ انسان پر اس کے نفس کی اصل حالت اور حقیقت بے نقاب کر دیتا ہے اور اسے انکشاف حقیقت کا وہ لمحہ نصیب ہوتا ہے جس میں وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور اپنی جبین نیاز خاک آلود کر کے اپنی زبان سے اس کی بلندی، بزرگی اور برتری اور اپنی بے حقیقتی اور کم مائیگی کا اعتراف و اقرار کرلیتا ہے۔

سجدۂ خدا سے براہ راست تعلق کا ذریعہ ہے

بحالت سجدہ بندہ اپنی پیشانی اور سر کو مالک حقیقی کی دہلیز پر خم کر کے اپنے آپ کو اس کی مخلوق میں سب سے ادنیٰ اور ہیچ تصور کرتا ہے اور زمین پر گرا ہوا تذلل اور شکستگی کی انتہائی حالت میں اپنے جھوٹے پندار، کبر و نخوت اور عظمت و برتری کی نفی کر کے بارگاہ خداوندی میں تائب ہوتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ تو ہر ایک سے بلند و برتر ہے اور مجھ سے بڑا روسیاہ اور گنہگار کوئی نہیں۔ میرا دامن سیاہیوں اور لغزشوں سے داغدار ہے۔ سبحان ربی الاعلیٰ کہہ کر وہ ذات باری تعالیٰ کو ہر نقص، عیب اور خامی سے پاک و منزہ سمجھتے ہوئے اس سے براہ راست اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور اسے وہ کیفیت نصیب ہوجاتی ہے جسے معرفت نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت انسان پر صرف اس وقت منکشف ہوتی ہے جب وہ خدا کو خالق و مالک یگانہ، ہر چیز پر غالب، قابض و محیط تسلیم کرتا ہے سجدہ کے ذریعے حاصل ہونے والی معرفت نفس اسے معرفت حق اور قرب و وصال ایزدی کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔

جیسا کہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ نے ''کشف المحجوب'' میں معرفت نفس

کے بارے میں مشہور قول نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ حضور سید یوم النشور ﷺ نے فرمایا:

من عرف نفسه فقد عرف ربه

(کشف المحجوب: ۳۶۸)

''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا یقیناً اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ای من عرف نفسه بالفناء فقد عرف ربه بالبقاء و يقال من عرف نفسه بالذل فقد عرف ربه بالعز و يقال من عرف نفسه بالعبودية فقد عرف ربه بالربوبية

''جس نے اپنے نفس کی فنا کو سمجھ لیا اس نے یقیناً ذات باقی (اللہ تعالیٰ) کی بقا کو جان لیا۔ بعض نے کہا جس نے اپنے نفس کو ذلت کے ساتھ جان لیا (یعنی اسے کم تر اور اپنی نظروں میں حقیر کہا) اس نے اپنے رب کی عزت مان لی۔ اور بعض نے کہا جس نے اپنے نفس کو حقیقت عبودیت کے ساتھ پہچان لیا یقیناً اس نے اپنے رب کو شان ربوبیت کے ساتھ جان لیا۔''

چنانچہ داتا صاحبؒ کی اس بات کی توضیح کے لئے ان کی اسی کتاب میں مذکور ایک اور حدیث شریف قابل غور ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

اذا اراد بعبد خيرا بصره بعيوب نفسه

(کشف المحجوب: ۳۶۷۔۳۶۸)

''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے چشم بصیرت عطا فرماتا ہے کہ وہ اس سے اپنے نفس کے عیوب دیکھتا رہے۔''

ان احادیث مبارکہ کے بعد یہ بات محتاج بیان نہیں رہی کہ نفس کا عرفان انسان کو بے بسی، کم مائیگی اور بے چارگی سے باخبر کرتا ہے۔ اس کی اصل حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ پھر وہ نفس کے حربوں اور شیطان کے مختلف النوع ہتکھنڈوں کو سمجھنے لگتا ہے اور اس تباہی و بربادی کی راہ سے بتوفیق ایزدی بچ جاتا ہے۔

یوں سجدہ درحقیقت انسان پر اپنی اصل کی طرف لوٹ جانے کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

سجدہ حقیقت انسانی کا مظہر ہے

حضور اکرم ﷺ نے انسان کو اس کی حقیقت و حیثیت سے آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

والناس بنو آدم و خلق الله آدم من تراب

(ترمذی، السنن، ۵: ۳۸۹، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجرات، رقم: ۳۲۷۰)

''تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔''

حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ تمام بنی نوع انسان اولاد آدمؑ ہیں جن کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ اس پر انسان کی رعونت اور فخر و تکبر چہ معنی دارد؟

انسان سجدے کی حالت میں بے بسی اور عاجزی سے جب اپنی جبین نیاز بے اختیار زمین پر رکھتا ہے تو یہ سجدہ انسان کو اس حقیقت کی آگہی عطا کرتا ہے کہ اس کی خلقت مٹی سے ہوئی ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔ انسان کے سفر زیست کا یہی آغاز و انجام ہے جس کی یاد دہانی شب و روز اسے سجدے کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔ سجدے سے یہ حقیقت انسان پر بخوبی آشکار ہوجاتی ہے کہ خدا کی ذات لازوال کے سامنے ہر چیز ہیچ اور بے مایہ ہے۔ قرآن حکیم میں اس نکتے کی طرف بڑے لطیف اشارے ملتے ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

كُلُّ شَيءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

(القرآن، القصص، ۲۸: ۸۸)

''اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔''

سجدے کی ماہیت وحقیقت

انسان کے ذہن وشعور میں جب اس حقیقت کا ادراک ہوجائے کہ وہ معرض فنا میں ہے اور اس کا وجود اور عدم وجود ایک عظیم و برتر ذات کی مشیت کا پابند و منقاد ہے تو وہ اپنی اصل سے باخبر اور اپنے آغاز و انجام سے آگاہ ہوجاتا ہے اس آگہی سے بندے پر معرفت نفس کے دروازے وا ہوجاتے ہیں۔ جو ذات باری تعالیٰ کی معرفت کا پیش خیمہ ہے۔ عرفان ذات سے عرفان حق کا مرحلہ وار سفر طے کرنے سے اسے شناسائی حق کا وہ مقام حاصل ہوجاتا ہے جو قرب الٰہی کی منزل پر منتج ہوتا ہے۔ سجدے کی حقیقت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھئے وہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سجدے کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ ایک شب آدھی رات کے وقت میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر خالی دیکھا تو متجسس نگاہوں سے اندھیرے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش کرنے لگی۔ آخرکار ایک گوشے میں مجھے ایک چیز محسوس ہوئی اور میرے ہاتھ بے خبری میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقدام مبارک سے چھو گئے اور مجھے احساس ہوا کہ آپ سجدے کی حالت میں ہیں۔ آپ ؓ فرماتی ہیں کہ حضور کا سجدہ اتنا طویل تھا کہ مجھے گمان گزرنے لگا کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح قفس عنصری سے پرواز تو نہیں کرگئی؟ میں نے قریب جاکر کان لگائے تو یہ آواز سنائی دی ''اے اللہ تعالیٰ! میرا جسم، میرا وجود، میری روح اور میرے ذہن و خیال سب تیرے حضور سجدہ ریز ہیں۔ اے اللہ! میں تیری ناراضگی اور غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ! میں تیری حمد و ثناء اور توصیف کیسے بیان کروں کہ مجھ میں اتنی سکت ہی نہیں۔ مجھے اتنی ہی توفیق حاصل ہے جتنی تو نے عطا فرمائی ہے''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس پر یہ الفاظ جاری تھے جبکہ چشمان مقدس سے اشکوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ طویل سجدے خدا کی بارگاہ میں اس ذات ستودہ صفات کے تھے جن کی عظمت پر کائنات کی سب عظمتیں نثار ہیں اور جس کو ساکنان فرش وعرش ہر آن درود وسلام کے گجرے پیش کرتے ہیں۔

شب خیزی کی سعادت کے لئے شرطِ اولین ...... معصیت سے اجتناب

رات کی خلوت میں جب لوگ خواب گراں میں مدہوش ہوتے ہیں۔ قیام اللیل اور سجدہ ریزی بہت بڑی فضیلت کی حامل ہے یہ خاص قرب اور حضوری کا وقت ہوتا ہے جس میں اٹھنے کی توفیق صرف اسی کو ملتی ہے جو دن بھر گناہوں اور جرم و معصیت سے اپنا دامن بچائے رکھتا ہے۔

کسی بزرگ سے ان کے ایک عقیدت مند نے پوچھا کہ حضرت! روزانہ نصف شب یا اس کے آخری حصہ میں اٹھنے کا ارادہ باندھ کر سوتا ہوں اور اس کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن اٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ قیام اللیل سے میری اس محرومی کا کیا سبب ہے؟ یہ سن کر موصوف فرمانے لگے کہ بیٹا! دن کو گناہ کم کیا کر تجھے باری تعالیٰ شب خیزی کی توفیق مرحمت فرمائیں گے۔ اس لئے کہ دن کے اجالوں میں گناہوں کی آلودگی میں ملوث رہنے سے راتوں کو قیام اور سجود کی نعمت چھن جاتی ہے معصیت کوشی انسان کے پاؤں جکڑ لیتی ہے اس سے سربسجود ہونے کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے اور وہ شب خیزی کی سعادت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بدگمانی گناہ ہے

گناہ خواہ چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں وہ بسا اوقات انسان کو شب خیزی اور سجدہ ریزی کی سعادت و برکات سے محروم کر دیتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوریؒ کا شمار اکابر صوفیاء میں ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو شدت سے نالہ و فغاں اور آہ و بکا میں مصروف تھا اور زار و قطار روتے ہوئے گڑگڑا کر بارگاہ خداوندی میں التجاء و مناجات کر رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے گمان گزرا کہ یہ شخص ریاکاری کر رہا ہے۔ یہ خیال ذہن میں آیا اور اس بدگمانی کی پاداش میں ذات باری تعالیٰ نے مجھے ساتھ ماہ تک

شب خیزی کی سعادت سے محروم کردیا اور شب خیزی و قیام و سجود کی توفیق مجھ سے سلب کرلی گئی۔

یہ اس مرد کامل حضرت سفیان ثوریؒ کا حال تھا جس کی زندگی زہد و ورع، تقویٰ و پرہیزگاری، مجاہدہ اور عبادت سے عبارت تھی۔ انہیں صرف ایک اللہ کے بندے کے بارے میں ذرا سی بدگمانی کی اتنی سزا ملی کہ سات ماہ کے لئے اللہ نے اپنی بارگاہ میں حاضری سے محروم کردیا۔

ہماری زندگی کا اصلاح طلب پہلو

ایک ہم ہیں کہ شب و روز دوسروں کی بدگمانی، عیب بینی اور غیبت کرتے نہیں تھکتے۔ لوگوں کے بارے میں سوءظن ہماری زندگی کا شعار بن چکا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ہم شعوری اور لاشعوری طور پر برائی اور گناہ میں ملوث ہوتے ہوئے بھی اسے برائی اور گناہ نہیں سمجھتے اور ہمیں رسول مقبول ﷺ کے اس فرمان کا ذرہ بھر پاس نہیں کہ مومن کو دوسروں کے بارے میں نیک گمان اور حسن ظن رکھنا چاہیئے۔ ہمارا رویہ اور معمول یہ بن چکا ہے کہ روز مرہ زندگی میں ہم کسی کے پاس دولت کی فراوانی دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی ہمارا گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ ضرور رشوت، بے ایمانی، غبن یا کسی حرام ذریعے سے حاصل کی گئی ہے۔ ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں کہ حلال طریقوں سے بھی دولت کمائی جا سکتی ہے۔

اسی طرح جب ہم کسی شخص کو محبت، الفت، تواضع و انکساری سے پیش آتا دیکھتے ہیں تو یہ گمان گزرتا ہے کہ اس کے پیش نظر ضرور کوئی نہ کوئی ذاتی مفاد، منفعت اور مصلحت ہوگی اور یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اس کا طرزِ عمل خلوص پر مبنی بھی ہوسکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہماری سوچ الا ماشاء اللہ من حیث المجموع ایک دوسرے کے بارے میں برے خیالات اور نظریات کی عکاس ہے۔ حالانکہ نیت کا حال سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا اور ہمیں کسی کی نیت پر خواہ مخواہ شک کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ستم بالائے ستم ہماری فطرت ثانیہ بن چکی ہے کہ ہم بدگمانی کو گناہ ہی نہیں سمجھتے اور اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

اللہ کے مقبول بندوں کی تو معمولی سی لغزش بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل گرفت ہے لیکن ہم جو دوسروں کے بارے میں دن رات ہزارہا بدگمانیاں اور بداندیشیاں کرتے ہیں اور اس طرح ایک گناہ میں مبتلا رہتے ہوئے بھی ہمیں یہ احساس نہیں کہ ہمارا مقام اللہ تعالیٰ کی نظر میں کتنا گر چکا ہے جس کی پاداش میں ہمیں بارگاہ رب العزت میں شب خیزی کی نعمت سے محروم کر دیا گیا ہے۔

سجدہ قربِ الٰہی کا باعث کیوں ہے؟

سجدہ سے بندہ کس طرح اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے اس کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ

(القرآن، العلق، ۹۶:۱۹)

’’اور (اے حبیب مکرم! آپ سربسجود رہئیے اور (ہم سے مزید) قریب ہو جائیے۔‘‘

بنا بریں سجدہ ہی وہ منفرد عمل ہے جس کے بارے میں قرآن مجید اتنے دوٹوک انداز میں ارشاد فرما رہا ہے کہ یہ عمل کر اور اللہ کی قربت کی نعمت حاصل کر لے۔ دنیا کا کوئی اور عمل ایسا نہیں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس انداز میں حکم فرمایا ہو حالانکہ اعمال تو اور بھی بہت سے ہیں جو صلہ و اجر کے اعتبار سے رضائے الٰہی کے حصول کا موجب ہیں لیکن اس آیہ کریمہ میں بڑے واضح الفاظ میں بطور خاص سجدے کو قربِ الٰہی اور وصالِ حق کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سجدہ صحیح معنوں میں سجدہ ہو چنانچہ سجدے کے متذکرہ بالا تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر قرآن حکیم کے اس حکم کا مفہوم سمجھنا چاہیں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اے بندے! اگر تو اپنے رب کے حضور ایسا سجدہ کرے گا تو تجھے وہ مقام نصیب ہو جائے گا کہ ابھی تیرا سر سجدے سے اٹھے گا نہیں کہ تجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے قریب ترین بندوں میں شامل کر دیا ہو گا۔

اس آیہ کریمہ کی تائید میں حضرت ربیعہ بن کعب ص سے مروی مسلم شریف کی ایک حدیث قابل ذکر ہے جس میں حضور ﷺ کے یہ برگزیدہ صحابی فرماتے ہیں کہ ''مجھے خوش قسمتی سے اپنی زندگی کا کچھ حصہ حضور ﷺ کی خدمت میں گزارنے کا موقع ملا ان با سعادت ایام میں میرے ذمے رات کو حضور ﷺ کے لئے وضو کا پانی اور دیگر چھوٹی موٹی اشیائے ضروریات کی فراہمی تھی۔ میں ہمیشہ آپ کی خدمت اقدس میں مستعدی کے ساتھ حاضر رہتا تھا ایک شب ایسی آئی جب حضور ﷺ کا بحر جود وسخا موجزن تھا اور وہ ساعت سعید آ گئی جب اہل سخا اپنے خدام کو نوازتے ہیں کیونکہ یہ کریموں کا شیوہ ہے کہ وہ جلد یا بدیر اپنے متعلقین خدمت گزاروں کو صلہ خدمت سے نوازا کرتے ہیں'' حضرت ربیعہ ص فرماتے ہیں کہ سرکار دو جہاں ﷺ کی نگاہ التفات مجھ پر پڑی اور آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ''مانگ کیا مانگتا ہے'' حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ کے لئے یہ اچانک ایک بہت بڑا اور غور طلب سوال تھا جس کا جواب بلا تاخیر دیا جانا مطلوب تھا۔قربان جائیں صحابہ کرام ث کی دور رس نگاہوں اور عظیم فراست پر کہ انہوں نے آئندہ آنے والی نسل انسانی کو مانگنے کا بھی کیسا اعلیٰ معیار عطا فرمایا چنانچہ وہ بے ساختہ پکار اٹھے:

انی اسئلک مرافقتک فی الجنۃ

''حضور! میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طلب گار ہوں۔''

''آقا! مجھے دنیا وآخرت میں آپ کی معیت وصحبت سے زیادہ اور کوئی چیز عزیز نہیں اور مجھے اسی کی تمنا ہے''

حضور ﷺ نے یہ جواب سن کر ازراہ شفقت اپنے اس پیارے صحابی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا:

او غیر ذالک

''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی حاجت ہے؟''

مراد یہ کہ جنت تو اب تجھے مل ہی جائے گی اور کچھ بتا اور اس کے سوا کچھ

مانگ وہ بھی آج تجھے ملے گا۔ لیکن وہ صحابی رسول ﷺ تھے اور جانتے تھے کہ اس سے بڑھ کر اور نعمت کون سی ہوسکتی ہے جو اس وقت مانگنے کے قابل ہو انہوں نے عرض کی ھو ذاک یا رسول اللہ ''حضور! آپ کا قرب اور صحبت نصیب ہوجائے تو مجھے اور کس چیز کی حاجت ہوگی؟ کیونکہ

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس سعادت عظمیٰ کے حصول کا تقاضا پھر یہ ہے کہ

فاعنی علی نفسک بکثرۃ السجود

''اگر یہی خواہش ہے تو زیادہ سجدوں سے میری اعانت کر''

مذکورہ حدیث مبارکہ مع ترجمہ ومتن ملاحظہ فرمائیں:

عن ربیعة بن کعب قال کنت ابیت مع رسول اللہ ﷺ فاتیته بوضوئه وحاجته فقال لی سل (وفی روایه سلنی) فقلت اسئلک مرافقتک فی الجنه قال او غیر ذالک قلت ھو ذا ک قال فاعنی علی نفسک بکثرۃ السجود

(مسلم، الصحیح، ۱: ۳۵۳، رقم: ۴۸۹)

''حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں خدمت کی غرض سے میں رات گزارتا تھا۔ ایک دفعہ میں آپ ﷺ کے پاس پانی اور دیگر ضروریات (مسواک اور مصلیٰ وغیرہ) لایا تو حضور ﷺ نے فرمایا ''ربیعہ! مجھ سے مانگ لے'' میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے جنت میں آپ کی رفاقت کا طلبگار ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''اس کے سوا بھی کچھ مانگ'' میں

نے عرض کیا ''بس یا رسول اللہ میری تو یہی خواہش ہے'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہی خواہش ہے تو زیادہ سجدوں سے میری اعانت کر۔''

قربِ خدا و قربِ مصطفیٰ ﷺ جدا نہیں

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات خصوصی توجہ کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا قرب دو علیحدہ اور جدا تصورات نہیں ہیں بلکہ ان کی اصل ایک ہی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ دراصل ایک ہی بارگاہ ہے جس طرح دونوں کی محبت و اطاعت میں کوئی دوئی نہیں اسی طرح دونوں کی قربت بھی ایک ہی متصور ہوگی۔ بلکہ اطاعت رسول ﷺ تو اطاعت الٰہی کی شرط ہے اور قرب رسول ﷺ ہی قرب الٰہی کا ذریعہ اور وسیلہ و واسطہ ہے۔

اسی لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ کی تمنا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے فرمایا ''**فاعنی علی نفسک بکثرۃ السجود**'' یعنی سجدوں کی کثرت سے تو میری اعانت کر اور میرے ساتھ ایک وعدہ کر کہ تو بکثرت سجدے کرتا رہے گا یعنی میرا قرب تو تجھے ملے گا مگر اس قرب کا اہل بننے کے لئے کچھ تقاضے ہیں جو کثرت سجود سے پورے ہوتے ہیں۔

گویا حضور ﷺ نے اپنے صحابی رضی اللہ عنہ کو یہ بات سمجھائی کہ تو جتنے زیادہ سجدے کرتا جائے گا اتنا ہی تجھے قرب حاصل ہوتا جائے گا۔ اس سے یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا قرب حاصل کرنے کا ایک ہی گر ہے اور وہ ہے خلوص عبادت اور کثرت کے ساتھ بارگاہ ذوالجلال میں اپنی جبین نیاز جھکاتے رہنا۔

افضل سجدے

ویسے تو فرض نمازوں کے سجدے بھی قرب خداوندی کا ذریعہ ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے بعض اوقات اور چند لمحات کو بطور خاص سجدوں کے لئے مستحسن فرمایا ہے۔ ان میں سے پچھلی رات کے سجدے بارگاہ خداوندی میں نہایت افضل ہیں کیونکہ اس وقت اللہ کی

رحمت اپنے بندوں کی تلاش میں ہوتی ہے جو اپنے نرم و گرم بستروں کو چھوڑ کر اپنے رب کے ہاں حاضر ہوتے ہیں۔ ایمان و عشق کی دولت میں اس وقت کے سجدے ہی بہتر اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی وقت کی فضیلت میں فرمایا ہے

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

اس لئے اگر خداوند قدوس اپنی رحمت خاص سے کسی کو پچھلی رات اٹھنے کی توفیق عطا فرمائے تو اس وقت کا قیام اور سجود لمبے کرنے چاہئیں۔

جگر گوشہ رسول ﷺ حضرت فاطمہؓ کے سجدے

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی لذت آشنائی کی دولت سے کچھ حصہ عطا فرماتا ہے وہ پھر اس محبوب کو منانے کے لئے خلوت کدوں میں راتوں کی نیندیں ترک کرکے اس کی بارگاہ میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ اپنی راتیں کبھی قیام میں گزارتے ہیں اور کبھی سجدوں میں۔

میاں محمد صاحبؒ فرماتے ہیں:

رات پوے تے بے درداں نوں نیند پیاری آوے
درد منداں نوں تانگ سجن دی ستیاں آن جگاوے

شہزادی کونین جگر گوشہ رسول ﷺ حضرت فاطمہ الزہراؓ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ جب سردیوں کی راتوں میں بھی نوافل ادا کرنے کے لئے پہلا سجدہ فرماتیں تو وہ سجدہ اتنا طویل ہوتا اور آپؓ اس سجدے میں اس قدر مستغرق ہوتیں کہ تہجد کی اذان ہوجاتی اور اس وقت جب سجدے سے سر اٹھاتیں تو عرض کرتیں ''اے باری تعالیٰ تو نے یہ رات کتنی چھوٹی بنائی ہے کہ فاطمہ ایک سجدہ بھی اطمینان سے نہیں کرسکی''

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اسی لذت آشنائی سے حصہ وافر عطا فرمائے تاکہ ہم بھی اپنی

بندگیوں کو ان کی طرح ایسے سجدوں سے مزین کریں۔ آمین

خلاصۂ کلام

سجدوں کا اثر اور ثمر یہ ہونا چاہیئے کہ انسان کو اس سے معرفت نفس نصیب ہو اسے خدا کی جلالت و بزرگی کے سامنے اپنی ہستی کا اندازہ ہوجائے کہ یہ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ سجدہ وہی مقبول ہے جو نفس کے کبرونخوت اور انسان کی ''میں'' کے بت کو توڑ دے۔ اگر انسان اپنے جھوٹے وقار اور عزت وتمکنت کے بتوں کو پاش پاش نہ کرسکا تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے سجدے بے اثر ہیں۔ان سجدوں کا اثر ہماری زندگیوں میں ظاہر ہونا چاہیئے۔میل ملاپ اور رہن سہن میں عجز و انکساری کا پیدا ہوجانا بھی سجدے کے فلسفہ بندگی کا پرتو ہے ورنہ ایسے سجدوں کے بغیر نمازیں عملی میدان میں اپنا بھرپور کردار ادا نہیں کرسکتیں۔

سجدے میں انسان کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ یکسر خاک ہے اور اسی خاک سے وجود میں آیا ہے اور انجام بھی اسی میں ہونا ہے تو لا محالہ اس کی بندگی میں چاشنی،حلاوت اور لگن پیدا ہوگی اور بالاخر وہ سجدے اسے مقبول بارگاہ بنادیں گے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

۶۔ قعدہ اخیرہ

نماز کا چھٹا رکن قعدہ اخیرہ ہے۔ تکبیر تحریمہ سے لے کر سجدہ کی ادائیگی تک سارے عمل میں انسان نماز کے ذریعے اپنا روحانی سفر طے کرتا ہے قعدہ اخیرہ سے قبل تکبیر، قیام، قراء ت، رکوع اور سجود میں اس پر اللہ کی بے شمار رحمتوں اور نعمتوں کے دروازے کھلے۔ ایک ایک لفظ سے اس پر اللہ کی معرفت اور اس کی قربت کے پردے وا ہوئے۔ انسان اس دوران دنیا کی محبت سے تائب ہوکر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پہنچا اور اللہ

کی محبت کا عزم کیا۔ اب وہ قعدے میں اپنے دونوں ہاتھوں کو رانوں پر رکھ کر تشہد کی حالت میں یہ کہتا ہے۔

التحیات للہ والصلوات والطیبات

(مسلم، الصحیح، ۱: ۳۰۱، رقم: ۴۰۲)

''باری تعالیٰ میری ساری عبادتیں خواہ وہ بدنی ہیں یا مالی، قولی ہیں یا فعلی سب تیرے لئے ہیں۔''

اس طرح نمازی جب صدق دل سے سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو اس پر عالم ملکوت کے بعد عالم لاہوت کے پردے اٹھتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ '' جس طرح تو نے رکوع، سجود، قیام اور قراءت غرضیکہ اپنی عقیدتوں کا جو نذرانہ بھی نماز کی حالت میں پیش کیا۔اب اس کی بارگاہ کی طرف دیکھ'' وہ اسی حالت میں جب اپنی باطنی نظر سے حریم بارگاہ ایزدی میں دیکھتا ہے تو اسے وہاں حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی نظر آتی ہے اس طرح گویا قعدہ اخیرہ میں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اے بندے! تجھے جو کچھ عطا ہوا وہ اسی ہستی کے طفیل عطا کیا گیا ہے۔

جب اسے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ کائنات کا جو کچھ جس حالت میں بھی اللہ کی طرف سے اس کے احسانات و عنایات کی صورت میں مل رہا ہے وہ حضور ﷺ کے تصدق سے نصیب ہو رہا ہے تو وہ حضور ﷺ پر نظر پڑتے ہی عرض کرتا ہے۔

السلام علیک ایھا النبی و رحمة اللہ و برکاته

(مسلم، الصحیح، ۱: ۱۷۳)

''یا رسول اللہ آپ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو۔''

قعدہ اخیرہ کا باطنی ادب

اس لحاظ سے تشہد اور قعدہ اخیرہ کا باطنی ادب بھی یہ ہے کہ نمازی کو اس بات کا

یقین ہوجائے کہ بارگاہ خداوندی سے مجھے جو کچھ نصیب ہوتا ہے وہ میرے آقا نبی کریم ﷺ کے ذریعے سے ہے۔ جس طرح کہ حدیث پاک کے یہ الفاظ ہیں:

انما انا قاسم و اللہ یعطی

(بخاری، الصحیح، ۱: ۳۹، رقم: ۷۱)

''بے شک اللہ کی عطاؤں اور نعمتوں کو میں ہی تقسیم کرنے والا ہوں مجھے عطا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔''

گویا حضور سید عالم ﷺ کے ارشاد سے مراد یہ ہے کہ سب عطائیں اللہ عزوجل کی ہیں اور تقسیم ہر سمت اس کے حبیب مکرم ﷺ کی ہے۔ پس جب انسان پر تشہد کی حالت میں یہ حقیقت کھلتی ہے تو وہ اس کے شکرانے کے طور پر حضور ﷺ کی بارگاہ میں اپنے سلام کا تحفہ پیش کرتا ہے۔

تشہد کی حالت میں حضور ﷺ پر سلام پیش کرنے کا ادب

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تشہد میں حضور ﷺ پر سلام پیش کرنے لگے تو اپنے دل میں ظاہری اور باطنی طور پر حضور ﷺ کو حاضر تصور کرو اور ان کے حلیہ یا نقش مبارک کا روحانی تصور قائم کرتے ہوئے نہایت ادب سے حضور پُر نور ﷺ پر ہدیہ درود وسلام پیش کرو۔ ایک تصور تو اُوپر بھی آداب قعدہ کے ضمن میں گزر چکا ہے کہ حضور ﷺ کو بارگاہِ ایزدی میں پا کر یہ تصور کیا جائے کہ مجھے دُنیا و آخرت کی جملہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اس ہستی مکرم کے طفیل عطا فرمائی ہیں۔ بس اس تصور میں ڈوب کر حضور ﷺ پر سلام عرض کرنا اس سلام کا ادب اور تقاضا ہے۔ احیاء العلوم کے الفاظ یہ ہیں:

واحضر فی قلبک النبی ﷺ فی شخصه الکریم و قل السلام علیک ایها النبی ورحمة اللہ وبرکاته و لیصدق املک فی انه

یبلغه ویرد علیک ما هو اوفی منه

(احیاء علوم الدین الغزالی، ۱:۱۶۹)

''(تشہد میں سلام عرض کرتے ہوئے) نبی کریم ﷺ کے وجود مبارک کو دل میں حاضر کرو اور کہو اے پیارے نبی آپ پر سلامتی اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں، اور دل میں سچی آرزو کرو کہ یہ سلام ان کو پہنچے گا اور وہ اس کا جواب تمہارے سلام سے بہتر مرحمت فرمائیں گے۔''

یہ ان لوگوں کی تعلیم ہے جنہوں نے نماز کو کما حقہ اس کے ظاہری و باطنی آداب کے ساتھ ادا فرمایا اس سلسلے میں حضور ﷺ کا ایک ارشاد گرامی طبرانی نے ابودرداءؓ سے اس طرح نقل کیا ہے:

لیس من عبدیصلی علی الا بلغنی صوته حیث کان قلنا وبعد وفاتک؟ قال و بعد وفاتی ان الله حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء

''جو شخص بھی مجھ پر درود بھیجتا ہے وہ جہاں بھی ہو اس کی آواز مجھے پہنچتی ہے ہم نے عرض کیا بعداز وصال بھی آپ اسی طرح سُنیں گے فرمایا ہاں وصال کے بعد بھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ انبیاء کے اجسام مبارک کھائے۔''

(جلاء الافہام لابن قیم: ۶۳)

بلکہ یہاں تک ارشاد فرمایا کہ کوئی مسلمان بھی شرق سے غرب تک ہر دور میں جب بھی مجھ پر سلام پڑھتا ہے اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ ارشادِ گرامی ہے:

ما من مسلم یسلم علی الارد الله الی روحی حتی ارد الیه السلام

(جلاء الافہام: ۱۸)

''کوئی مسلمان ایسا نہیں جو مجھ پر سلام بھیجے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری روح میری طرف واپس لوٹا دیتا ہے اور میں اس سلام کو جواب دیتا ہوں۔''

تو جب ہر سلام کو جواب حضور ﷺ خود دیتے ہیں تو اس سلام کا جواب جو حالتِ نماز میں نمازی آپ ﷺ کو اللہ کے حریم ناز میں پاکر سلام پیش کرتا ہے، کتنا بلند ہوگا! جس قدر عظمت کا حامل یہ سلام ہوگا اسی قدر بلند مرتبہ آقا ﷺ کا جواب ہوگا جو آپ ﷺ نمازی کے سلام کے جواب میں مرحمت فرمائیں گے۔

والدِ گرامی کو ان کے شیخؒ کی وصیت

اسی سلسلے میں میرے والد گرامی حضرت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ نے مجھ سے فرمایا کہ اُنہوں نے اپنے شیخ حضرت سیدنا ابراہیم سیف الدین النقیبؒ سے، جو بہت عظیم المرتبت ولی اللہ اور نقباء بغداد میں سے تھے، سوال کیا کہ حضرت جب آدمی تشہد کی حالت میں حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر سلام پیش کرے تو اس کا کیا ادب ہے؟ وہ فرمانے لگے کہ اللہ کے کئی بندے تو ایسے ہیں جو **السلام علیکم ایھا النبی ورحمة اللہ وبرکاته** کہہ کر تھوڑی دیر رُک جاتے ہیں اور حضور ﷺ کے جواب کا انتظار کرتے ہیں اور جب سلام کا جواب سُن لیتے ہیں تو پھر آگے چلتے ہیں اور بقیہ نماز مکمل کرتے ہیں۔ کیونکہ حضور ﷺ نے جب وعدہ فرمایا ہے کہ میں ہر ایک کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ اب اس میں قریب یا بعید، چھوٹے بڑے اور متقی یا گنہگار کی کوئی شرط باقی نہ رہی۔

وہ آقا ﷺ تو اتنے کریم ہیں کہ انہیں جو بھی خلوص کے ساتھ سلام کا نذرانہ پیش کرے اُسے قبول فرماتے ہیں اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔

ہر کان سزاوار سماعت نہیں

جس طرح ہر آنکھ دیدار جمال رُخ زیبائے محمدی ﷺ کی اہل نہیں، اسی طرح ہر کان حضور ﷺ کے اس جواب کے سُننے کا سزا وار نہیں۔ حضور ﷺ تو سب کو برابر جواب دیتے ہیں۔ ان کی چادر رحمت تو سارے جہان پر جلوہ فگن ہے۔ جس طرح بارش تو بیک وقت پوری زمین پر برستی ہے مگر زمین حسبِ استطاعت اس سے مستفیض ہوتی ہے۔

بقول شیخ سعدیؒ

باراں که در لطافت طبعش خلاف نیست

در باغ لاله روید در شور بوم و خس

حضور اکرم ﷺ کے سلام کے سماعت قبول کرنے والے کان بھی عام کانوں سے مختلف ہوتے ہیں اور دیکھنے والی آنکھیں بھی۔اسی طرح وہ دل جس میں آپ ﷺ ہمہ وقت جلوہ افروز رہتے ہیں، عام دلوں سے منفرد ہوتے ہیں۔ ان میں بظاہر تو کوئی خاص فرق نہیں ہوتا مگر اس کی روحانی طہارت اور باطنی کمال اُنہیں دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے ۔مولانا رومؒ نے اس حقیقت کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کیا ہے۔

محرم ایں هوش جز بے هوش نیست

مر زبان را مشتری چوں گوش نیست

اُنہوں نے اس شعر میں بڑے اُچھوتے انداز میں اس فلسفے کو بیان کیا ہے کہ سماعت و بصارت کا یہ حال اس وقت تک نصیب نہیں ہوتا جب تک حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے عشق ومحبت میں انسان اپنے آپ کو فنا نہ کر لے اور جب ان کی محبت و طاعت میں بے ہوش یعنی یکسو ہو گا تو اُسے یہ باطنی شعور اور رُوحانی قوت نصیب ہو جائے جو براہِ راست حضور ﷺ کے جلوؤں کا نظارہ کر سکے گی ورنہ جس طرح کان کے سوا جسم کے دوسرے اعضاء زبان سے کہی ہوئی بات سمجھنے اور سُننے سے قاصر ہیں، عام انسان بھی حضور ﷺ سے بے خبر ہیں۔

برسماع راست هر کس چیز نیست

طعمه هر مرغکے انجیر نیست

''جس طرح انجیر ہر حقیر پرندے کی خوراک نہیں ہے اسی طرح سچی بات سُننے پر ہر شخص قادر نہیں''

بلکہ قبول حق کے لئے اپنے من کو صاف سُتھرا کرنا پڑتا ہے تب جا کر اس میں

نورِ ہدایت مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

بعض خوش نصیب ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جنہیں ہر سلام پر حضور ﷺ کی طرف سے جواب ملتا ہے اور وہ اُسے خود سنتے ہیں۔اسی طرح تشہد میں اللہ والوں کے سلام کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اس وقت تک نماز سے فارغ ہی نہیں ہوتے جب تک حضور ﷺ کی طرف سے سلام کا جواب اپنے کانوں سے نہ سُن لیں بلکہ ہمیں ایسے عشاق کا ذکر بھی ملتا ہے جو نہ صرف حضور ﷺ کے روضۂ انور پر جاکر سلام کا جواب سُنتے ہیں بلکہ حضور ﷺ کا جسم اطہر چومتے تھے مثلاً:

شیخ احمد الرفاعیؒ کے متعلق بڑے محتاط محدثین نے بیان کیا ہے کہ جب آپؒ حضور ﷺ کی بارگاہ میں یہ خواہش لے کر حاضر ہوئے کہ حضور ﷺ سلام کا جواب یوں دیں کہ اپنا دست مبارک بھی روضۂ اطہر سے باہر نکالیں تاکہ میں اس کی زیارت کرسکوں اور چوم کر آتشِ عشق کو ٹھنڈا کرسکوں۔چنانچہ امام جلال الدین سیوطیؒ اور امام نبھائیؒ بالصراحت بیان فرماتے ہیں کہ شیخ احمد الرفاعیؒ نے جب سلام عرض کیا تو مصافحہ اور دست مبارک کی زیارت کی خواہش پر روضہ مبارک سے دست مبارک باہر آگیا اور مسجدِ نبوی میں موجود نوے ہزار زائرین نے حضور ﷺ کے دستِ اقدس کی زیارت کی۔اس واقعہ کو مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی کتاب ''افاضات یومیہ'' میں بیان کیا ہے۔

غرضیکہ اسی طرح ہر محبوب کے حسب حال اسے جواب سے نوازا جاتا ہے۔

امام اعظم ابوحنفیہؒ کے متعلق منقول ہے کہ جب آپ حضور ﷺ کی بارگاہ میں سلام عرض کرتے السلام علیک یا امام الانبیاء ''اے نبیوں کے امام آپ پر سلام ہو'' تو جواب آتا ''اے میری اُمت کے امام تجھ پر بھی سلام ہو''

حضرت مولانا عبدالرحمٰن نور الدین جامیؒ جب بھی حاضری دیتے اور الوداعی سلام عرض کرتے تو حضور ﷺ کی طرف سے انہیں سلام کا جواب بھی ملتا اور ساتھ یہ بھی

فرماتے کہ ’’خوش روی و باز آئی‘‘ (جامی! خوش جاؤ اور ہمیں ملنے کے لئے پھر لوٹ کر بھی آؤ) ۱۸ سال حضور ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں اسی طرح حاضری ہوتی رہی اور حضور ﷺ کی طرف سے اُسی طرح جواب ملتا رہا ’’خوش روی و باز آئی‘‘ اٹھارویں مرتبہ حاضری کے بعد جب مولانا جامیؒ نے الوداعی سلام عرض کیا تو جواب ملا ’’خوش روی‘‘ مولانا جامیؒ سنتے ہی زار و قطار رو پڑے کہ آقا ﷺ! میں سمجھ گیا مجھے اس کے بعد حضور ﷺ کے درِ اقدس کی حاضری نصیب نہیں ہوگی اگر پھر آنا نصیب میں ہوتا تو آپ ’’خوش روی‘‘ کے ساتھ ’’باز آئی‘‘ بھی فرماتے۔

بہر حال حضور ﷺ کی طرف سے سلام کا جواب ہر کسی کو اس کے حال کے مطابق ملتا ہے۔ کسی کو اس کی خبر ہوتی ہے، کسی کو نہیں۔ کوئی صرف سُنتا ہے اور کوئی مشاہدہ بھی کر لیتا ہے۔ بس یہ ہم ہی کوتاہ نظر اور نابینا ہیں کہ محبوب کے جلووں کی رعنائیاں ہمہ وقت موجود ہونے کے باوجود ہم ان کا ادراک نہیں کر پاتے۔ خُدا تعالیٰ ہمارے گوش و چشم کو بھی اس نعمتِ عظمیٰ کے اہلِ بنا دے۔ آمین!

قعدہ اخیرہ اور درود و سلام

اس مختصر ضمنی بحث کے بعد آیئے دیکھتے ہیں کہ قعدہ اخیرہ میں خروج عن الصلوٰۃ سے پہلے ہم درود شریف کیوں پڑھتے ہیں؟

جب تشہد میں اپنی ساری عبادتیں اللہ کے حضور بطور نذرانہ پیش کر دیں اور اللہ کے فضل و کرم اور عنایت خاص سے انسان حریم ناز میں اس نازنین محمد عربی ﷺ کو پاتا ہے تو یہ تصور کرتے ہوئے کہ مجھے اللہ کی یہ سب مہربانیاں اور بخششیں، عنایتیں حضور ﷺ کے تصدق سے عطا ہوئی ہیں تو نمازی حضور ﷺ پر سلام کا ہدیہ پیش کرتا ہے پھر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں اسے اظہار تشکر کے لئے کچھ نہیں سوجھتا کہ ...... مجھ جیسے عاجز و ناتواں بندے پر اللہ کا اتنا کرم ہے کہ وہ ذات حضور ﷺ کے طفیل ہم پر اپنی رحمتوں کی بارش کر رہی ہے۔ ان کی نسبت سے ہمیں اللہ کے کرم کی دولتیں، نعمتیں اور رحمتیں

ہو رہی ہیں تو جواباً وہ شخص بطور ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی طریقہ مناسب نہیں سمجھتا کہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اپنے مہربان و کریم آقا سید الانبیاء ﷺ کے لئے رحمت، برکت اور سلامتی کی دعائیں کرے پھر وہ حضور ﷺ پر درود شریف پڑھتا ہے اوران کی آل پاک پر درود پڑھتا ہے۔

درود اور سلام میں فرق

اب جبکہ نمازی پہلے سلام عرض کرلیتا ہے اس کے بعد درود پاک پڑھتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں میں فرق ہوگا۔

پہلا فرق ...... باعتبار صدور

پہلا فرق تو یہ ہے کہ سلام انشاء ہے جس میں اپنی طرف سے حضور ﷺ کو دعائیہ کلمات کا ہدیہ پیش کیا جاتا ہے۔ اور درود دعا ہے جس میں بندہ اللہ کی بارگاہ عالی وقار میں حضور ﷺ پر سلامتی اور رحمت بھیجنے کی التجا کرتا ہے وہ خدا سے عرض کرتا ہے۔

اللھم صل علی محمد و علی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی ال ابراھیم

(مسلم، الصحیح، ۱: ۳۰۵، رقم: ۴۰۵)

’’اے ہمارے پروردگار! حضور نبی کریم ﷺ حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی پر اوران کی آل پاک پر اسی طرح رحمت بھیج جس طرح حضرت ابراہیم ں اور ان کی آل پر تو نے رحمت فرمائی۔‘‘

تو پہلا فرق یہ واضح ہوا کہ پہلے سلام میں حضور ﷺ کو براہ راست مخاطب کر کے انہیں سلام کا ہدیہ پیش کیا جاتا ہے اور دوبارہ درود کے ذریعے اللہ سے التجا کی جاتی ہے کہ اے اللہ! تو بھی ہمارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کی بارش نازل فرما۔

بعد ازاں سلام کے بعد درود پڑھنے میں یہ حکمت بھی مضمر ہے کہ بندہ جب براہ راست اپنی طرف سے سلام پیش کرتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ میں خود ایک ناقص العمل اور گناہگار شخص ہوں کہیں میرا یہ سلام بھی ناقص نہ رہ جائے اور

حضور ﷺ کی بارگاہ میں بجائے سلامتی کے بارگاہ کی گستاخی اور عدم تعظیم کا مرتکب نہ ہوجاؤں، تو اپنی طرف سے نیاز مندانہ سلام عرض کر کے وہ اپنا حق تو ادا کرتا ہے، مگر پھر اللہ سے بھی التجا کرتا ہے کہ اے ہمارے محمد ﷺ کے رب ذوالجلال میں تو اس قابل نہیں تھا کہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ان کے شایان شان سلام پیش کرتا پھر بھی جو میں کرسکتا تھا کیا اب تجھ سے التجا اور دعا ہے کیونکہ تو دعا رد نہیں فرماتا اس لئے ہمارے آقا حبیب مکرم ﷺ پر سلامتی، رحمت اور برکت کا بے پایاں نزول فرما اور صرف میرے آقا پر ہی نہیں قیامت تک آنے والی حضور ﷺ کا آل پاک پر بھی سلامتی نازل فرما۔

دوسرا فرق ...... باعتبار صلہ

درود اور سلام میں دوسرا فرق اجر وثواب اور صلے کے اعتبار سے ہے اس لحاظ سے ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ درود کا صلہ سلام کے صلہ کے قریب بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے اس کے دس گناہ معاف فرمادیئے جاتے ہیں، اس کے نامہ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کے دس درجے بلند کئے جاتے ہیں۔'' اور سلام کا صلہ یہ ہے کہ جو حضور ﷺ کو ایک دفعہ سلام عرض کرتا ہے اس کو حضور ﷺ کی زبان مبارک سے سلامتی کی دعائیں ملتی ہیں۔ کہاں دس نیکیاں، دس درجات کی بلندی اور دس گناہوں کی معافی اور کہاں زبان مصطفیٰ ﷺ سے نکلی ہوئی دعائیں اور سلام! اور یہ الفاظ کہ ''مجھ پر سلام بھیجنے والے میرے امتی! میں اپنی زبان سے تجھ پر بھی سلام بھیجتا ہوں'' جس شخص کے حق میں حضور ﷺ نے اپنی زبان سے سلام بھیج دیا اس کے مقدر اور نصیب کا کیا عالم ہے اس پر تو فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

اس لئے جب کبھی حضور ﷺ پر درود بھیجیں سلام بھی ضرور پڑھیں۔ سلام کا جواب حضور ﷺ خود لازماً مرحمت فرماتے ہیں۔ علاوہ ازیں درود میں تو خطاب بھی حضور ﷺ سے نہیں ہوتا۔ اللھم کہہ کر آدمی خدا سے ان کے لئے رحمتیں طلب کر رہا ہوتا

ہے۔ لہٰذا اس کا جواب بھی حضور ﷺ کے ذمے لازم نہیں۔ لہٰذا دونوں کا فرق واضح ہوگیا اور یہ بھی مترشح ہوگیا کہ حضور ﷺ کی زبان اقدس سے نکلی ہوئی سلامتی کی دعا کے مقابلے میں کوئی صلہ برابری نہیں کرسکتا۔

۶۔ خَرُوُجٌ عَنِ الصَّلٰوۃِ

نماز کا ساتواں رکن ''خروج عن الصلوۃ'' یعنی نماز سے کسی عمل کے ذریعے باہر آنا اور نماز ختم کرنا ہے۔ نماز کے پچھلے چھ ارکان کے ذریعے جب انسان اللہ کی رحمت سے سب مرحلے طے کرتا چلا جاتا ہے اور قعدہ اخیرہ میں ہدیہ درود وسلام بھی پیش کرتا ہے تو اب حضور ﷺ کی طرف سے تعلیم دی جاتی ہے کہ اے میرے امتی تو نے یہ سب کچھ اللہ کی رضا کے لئے کیا، مجھ پر اور میری آل صلوٰۃ وسلام بھی بھیجا۔ اب اس نعمت میں اور رحمت و برکت کی دعا میں اگر میری ساری امت شامل نہ ہوئی تو میرا جی خوش نہیں ہوگا۔ لہٰذا درود کے بعد امت مصطفوی ﷺ کے لئے بالعموم اور اپنے خویش اقارب کے لئے بالخصوص دعا کی تعلیم دی جاتی ہے اور اللہ کی اس نعمت کے حصول کا شکریہ خاتمہ نماز پر یوں ادا ہوتا ہے کہ نمازی اپنے دائیں بائیں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہتا ہے۔ ایک طرف کہنے سے دائیں طرف کی ساری امت اور دوسری طرف کہنے سے بائیں طرف کی ساری امت اس دعا میں شامل ہوجاتی ہے۔ حضور ﷺ نے کبھی صرف اپنے اور اپنی آل کے لئے سلامتی کی تلقین نہیں کی بلکہ وہ تو ہیں ہی کریم آقا ﷺ ان کی رحمتیں اور برکتیں تو نادار اور بے سہارا امتیوں کے لئے خاص ہیں لہٰذا وہ دعا حضور ﷺ کو سب سے زیادہ پسند ہے جس میں حضور ﷺ کی ساری امت کو بھی شامل کیا جائے۔

اللہ کی رحمت کو محدود نہ کرو

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں دعا مانگ رہا تھا اللھم ارحمنی ''اے اللہ مجھ پر رحم فرما'' حضور رحمۃ اللعالمین میرے پاس سے گزرے اور میرے دعائیہ کلمات سماعت فرمائے اور مجھے قریب آ کر تھپکی دی پھر فرمانے لگے ''اے علی! اللہ کی رحمت کو تنگ کیوں کرتے ہو؟ یوں کیوں نہیں کہتے کہ اے اللہ حضور ﷺ کی ساری امت پر رحم فرما''

اس لئے کہ سب کے لئے دعا مانگنے میں اپنی ذات تو خود بخود ہی آ جاتی ہے۔ مزید فرمایا:

ان بین العموم و الخصوص کما بین السماء والارض

''بے شک دعا کو سب کے لئے عام کرنے اور محض اپنے لئے خاص کرنے میں اتنا فرق ہے جتنا آسمان اور زمین کی وسعتوں میں۔''

خَرُوُجُ عَنِ الصَّلٰوۃ میں سلام کا ادب

مندرجہ بالا وضاحت سے اس سلام کا ادب بھی مترشح ہوگیا کہ اس سلامتی کی دعا میں حضور ﷺ کی پوری امت شامل کر لی جائے اور جب تک ایسا نہیں ہوگا عبادت اپنے کمال کو نہیں پہنچتی اور مکمل نہیں ہوتی۔

اس سے دوسرا یہ ادب سکھانا مطلوب ہے کہ بندہ جب تک دوسروں کے لئے سراسر پیکر رحمت نہ بن جائے اس وقت تک اس کی بندگی اتمام و کمال کا درجہ حاصل نہیں کرسکتی۔ بندے کا تو کام ہی دوسروں کی بھلائی چاہنا ہے۔ اب دوسروں کے لئے برا چاہنا، ان کو اذیت دینا، تکلیف پہنچانا یا کسی کی مجبوری سے بے جا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی کو پریشان کرنا کہاں کی مسلمانی ٹھہری؟

اسلام اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اپنے جملہ ارکان کے ذریعے سلامتی کا آئینہ دار ہے۔ بالفرض اگر کوئی شخص نمازیں بھی پڑھے، روزے رکھے، حج و زکوٰۃ بھی ادا کرے لیکن اس کا عمل یہ ظاہر کرے کہ وہ حضور ﷺ کی امت کے حق میں مہربان اور شفیق نہیں بلکہ انہیں گزند اور بے جا تکلیف پہنچاتا ہے تو اس کا کوئی عمل عنداللہ اور عندالرسول قابل قبول نہیں ہوگا۔ نیک اعمال تو تب قبول کئے جاتے ہیں جب انسان مخلوق خدا کے لئے بھی پیکر رحمت و شفقت بن جائے اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں مقبولیت تب ہوتی ہے جب حضور ﷺ کے حکم کے مطابق پوری امت کو بھلائی میں شامل کرلیا جائے۔

قابلِ توجہ نکتہ

گویا نماز سے خارج ہونے کا سبق یہ بھی ہے کہ انسان نماز سے فارغ ہوکر جب دنیوی زندگی کی طرف نکلتا ہے تو اس کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اے بندے! ابھی تو

اللہ کے گھر میں بیٹھ کر پوری امت کے لئے رحمت مانگ کر آیا ہے اور اگر تو اس کے بعد بھی کلمہ گو مسلمان بھائی کو اپنے عمل سے تکلیف، دھوکا یا فریب دے گا تو تیری وہ نماز تیرے منہ پر مار دی جائے گی کہ جس کا اختتام تو نے السلام علیکم و رحمۃ اللہ کے ذریعے سلامتی کی دعاؤں پر کیا اس طرح زبان سے دعا اور عمل سے تکلیف دے رہا ہے۔ تیرے قول و عمل میں اس قدر تضاد ساری عبادتوں قیام، رکوع، سجود وغیرہ کے اثرات کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسی نمازیں منکرات سے ہمیں کس طرح بچائیں اور ہماری زندگیاں کس طرح انقلاب آشنا ہوسکیں نیز ہم اپنے قلب و باطن میں کیونکر تغیر لا سکتے ہیں؟

حرف آخر

حضرات محترم! اگر ہم نماز کے مندرجہ بالا آداب سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنی نمازوں کو ان کے مطابق ادا کریں تو یہ نماز ہماری پوری زندگی کے جملہ اُمور کو اپنے دائرہ کار میں لاکر انہیں بہتری میں بدل دے گی۔ ورنہ یہ ایسا ہی ہوگا جس طرح ہم کسی شخص سے کہیں کہ فلاں آدمی پیاس سے مر رہا ہے اسے پانی دو اور جب وہ پانی دینے لگے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی گرا دیں اور کہیں کہ ''اسے مرنے دو۔''

ہمارے اعمال و افعال اور روز مرہ زندگی میں کس قدر تضاد ہے۔ نماز میں ہم لوگوں کے لئے اللہ سے سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں اور اس کے بعد انہی لوگوں کو تکلیف اور دھوکہ دیتے ہیں پھر انہی نمازوں کو باعث اجر و ثواب بھی تصور کرتے ہیں۔ پھر ہم کس منہ سے اگلی نماز کے لئے رب ذوالجلال کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں؟

اللہ ہمیں نماز کے جملہ ظاہری و باطنی آداب پورے کرنے اور ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

اللھم طھر قلوبنا و نور صدور نابحرمۃ راحۃ العاشقین ﷺ

باب سوم

فلسفہ حج

جزو اوّل

حج ...... مظہر محبت

زیر نظر عنوان کے تحت جملہ ارکان اسلام میں حج کی خصوصی اہمیت کو اس حوالے سے بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ ایسی عبادت ہے جو عشق و محبت الٰہیہ کی مظہر و آئینہ دار ہے اور اسے عقل و خرد کے کسی پیمانے سے ماپا نہیں جا سکتا۔

قرآن کریم میں فرضیت حج کے باب میں ارشاد ربانی ہے:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا

(القرآن، ال عمران، ۳:۹۷)

''اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔''

درج بالا آیہ کریمہ میں اللہ رب العزت نے ان لوگوں کے لئے حج کرنا لازم قرار دے دیا ہے جو صاحب استطاعت ہیں اور مالی حیثیت کے ساتھ ساتھ بیت اللہ پہنچنے کی توفیق و طاقت سے بہرہ ور ہیں۔

انسانی شخصیت میں داعیہ محبت کا جوہر لطیف

حج کیا ہے؟ اور اس کے پیچھے کون سی مقصدیت کارفرما ہے اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہو گا کہ انسانی شخصیت کا سرسری تجزیہ کر لیا جائے۔

خالق موجودات نے اپنی تمام مخلوقات میں حضرت انسان کو مکمل اور جامع مخلوق بنایا ہے۔ خلقت کے اعتبار سے اس کی شخصیت کی اس ہمہ گیر جامعیت ہی کی بناء پر اسے

’اشرف المخلوقات‘ قرار دیا گیا ہے۔ انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیں تو اس کا پیکر خاکی محض عقل، فکر و خیال، قوت مدرکہ ومتخیلہ سے ہی عبارت نہیں بلکہ خالق کل نے اس کے اندر مختلف النوع صلاحیت و استعداد کے جوہر اور لطیف جذبات و داعیات محبت بھی ودیعت کر رکھے ہیں جن کی بنا پر اسے عقل و خرد کے ساتھ ایک دل بھی عطا کیا گیا ہے گویا سوچنے کے مادے کے ساتھ اسے کسی کو چاہنے کا جذبہ بھی تفویض ہوا ہے۔ اب سوچنے اور چاہنے میں بہت بڑا بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں سوچ نفع و نقصان اور سود و زیاں کے تابع ہوتی ہے اور انسان کوئی کام کرنے سے پہلے اس کے نتیجے پر نظر رکھتے ہوئے تامل اور پس و پیش کرتا ہے کہ میں یہ کام کروں یا نہ کرو۔ وہاں چاہت ومحبت ان تصورات و خیالات سے ماوراء اور بے نیاز ہوتی ہے۔ انسان جس کسی کو دل و جان سے چاہنے اور محبت کرنے لگتا ہے پھر وہ مادی سود و زیاں پر مبنی عقل و خرد کے تمام فیصلوں کو بالائے طاق رکھ کر اس کی طرف بے اختیار کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس کے اندر رکھا ہوا داعیہ محبت اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ سوچے سمجھے بغیر آستانہ محبوب پر اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دے۔ دل جو گہوارہ محبت ہے اس کے بارے میں رب ذوالجلال نے قرآن حکیم میں ارشادفرمایا:

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡئِدَةَ

(القرآن، الملک، ۶۷:۲۳)

’’اورتم کو کان، آنکھیں اور دل دیئے۔‘‘

چنانچہ انسان کو حواس خمسہ ظاہری اور حواس خمسہ باطنی عطا کئے گئے اور اسے قلب و روح اور وجدان ارزانی ہوئے۔ ان سب عناصر کو ملا کر ہی انسانی شخصیت کا جامع مرقع تیار ہوتا ہے۔ خالق مطلق نے اس کے دل میں کسی سے محبت کرنے کا بنیادی تقاضا اور داعیہ ودعیت فرما دیا اور اسے ایمان و ایقان اور اطاعت ومحبت کے لطیف جذبات سے بہرہ ور کیا۔ بناء بریں انسان کی مختلف حیثیات ہیں جن میں بنیادی تقاضائے محبت کی تکمیل کے لئے مختلف مظاہر محبت پیدا کئے گئے جن سے تعلق کی نسبت سے انسان اپنے جذبہ محبت

کی تسکین اور اس کی تکمیل کا سامان فراہم کرتا ہے۔

مظاہر محبت قرآن حکیم کی نظر میں

قرآن حکیم نے اس بارے میں ارشاد فرمایا:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنُ

(القرآن، ال عمران، ۳:۱۴)

''لوگوں کے لئے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد۔''

گویا یہ چیز انسان کی سرشت و جبلت میں شامل ہے کہ اس کے نفس میں عورتوں، اولاد اور مال و دولت کی محبت کی کشش رکھی گئی ہے۔ مادی محبت کے مختلف روپ اور زاویہ ہائے نگاہ ہیں۔ صنف نازک کی محبت، جاہ و منصب کی محبت، دنیوی سامان کی محبت اور طاقت و اقتدار کی محبت وغیرہم اس کی متنوع صورتیں ہیں جن کی طرف مذکورہ آیہ کریمہ میں واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ یہ سب مظاہر محبت جن کی طرف انسان کا میلان الطبع ہے اور وہ جبلی طور پر ان کی طرف لپکتا ہے اور اس کے دل میں ان کا ایک مقام ہے، انسان کے اندر بتقاضائے بشریت ودیعت ہوئے ہیں۔

مادی مظاہر محبت کا خدا و رسول ﷺ کی محبت سے موازنہ

محبت کے دنیاوی مظاہر کا ایک حد سے متجاوز ہو جانا انسانی شخصیت کو توازن و اعتدال کی راہ سے دور لے جا کر تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیتا ہے جیسا کہ سورۂ توبہ میں اللہ رب العزت نے مظاہر محبت گنوا کر انسان کو ان کے نتائج وعواقب سے متنبہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاؤُكُمْ وَ اَبْنَاؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ

عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

(القرآن، التوبہ، ۹:۲۴)

''(اے نبی مکرم) آپ فرما دیں اگر تمہارے باپ (دادا) اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں) اور تمہارے بھائی (بہنیں) اور تمہاری بیویاں اور تمہارے (دیگر) رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے (محنت سے) کمائے اور تجارت و کاروبار جس کے نقصان سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے۔''

اس آیہ کریمہ میں رب ذوالجلال نے اپنے حبیب ﷺ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر ان کی ساری محبتیں جن کا اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے انہیں اللہ و رسول کی محبت اور فی سبیل اللہ جہاد سے بڑھ کر عزیز ہیں تو انہیں ہلاکت و تباہی کی راہ پر ڈال کر قعر مذلت میں پھینک دیا جائے گا۔ وہ لوگ جو فسق و فجور کی راہ میں آگے نکل جاتے ہیں انہیں ہدایت ایزدی نصیب نہیں ہوتی اور عذاب الٰہی ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

بایں ہمہ یہ ثابت اور طے شدہ ہے کہ یہ سب دنیاوی محبتیں انسان کے خمیر میں شامل ہیں۔ ماں باپ کی محبت، بیوی بچوں کی محبت، کنبہ اور قبیلہ کی محبت، تجارت و معیشت کی محبت، خوبصورت عمارتوں اور سامان و اسباب کی محبت۔ ان سب کا حصول اس کی زندگی کا مطمح نظر ہے اور ان سے اس کے داعیہ محبت کی تسکین ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ان مادی محبتوں اور رغبتوں کو زندگی سے کلیتاً ختم کر دینا ہرگز مشیت خداوندی نہیں ہے۔ اس لئے انسان سے یہ تقاضا مطلقاً نہیں کیا جا رہا کہ وہ ان بشری تقاضوں اور میلانات کو یکسر اپنی زندگی سے خارج کر دے بلکہ اس بنیادی نکتہ کی طرف توجہ مبذول

کروائی جا رہی ہے کہ یہ مادی محبتیں اور رغبتیں اللہ و رسول ﷺ کی محبت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی رغبت پر غالب نہ آ جائیں اگر خدا و رسول ﷺ کی محبت اور ان کی راہ میں جہاد کا شوق باقی سب آنی و فانی محبتوں پر غالب و حاوی ہو جائے تو پھر ایمان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں اور دنیا کی عارضی محبتوں کی خود بخود تہذیب وتحدید ہوتی رہے گی اور وہ ایک مقام اور حد سے آگے نہ بڑھنے پائیں گی۔

مجاز سے حقیقت کی طرف محبت کے ارتقائی مدارج

خدا کی ذات کریمانہ نے انسان کے جذبات و داعیات عشق و محبت کی تسکین کے لئے اس مادی دنیا میں بے شمار اسباب مہیا فرمائے ہیں۔ مجازی محبت کسی دنیاوی محبوب سے والہانہ قلبی تعلق اور وابستگی کا تقاضا کرتی ہے لیکن اس محبت میں آخرکار ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جذبہ محبت سرد اور ماند پڑنے لگتا ہے اور شوق کے والہانہ پن میں بتدریج کمی آنے لگتی ہے اگر محبت کا جذبہ خلوص اور وفاداری بشرط استواری پر مبنی ہو تو مشیت ایزدی انسان کی قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہے اور اسے داعیہ شوق کی تسکین کے لئے وہ راہ سجھاتی ہے جس سے دنیاوی فانی محبتوں اور رغبتوں کا ہر نقش اس کے لوح دل سے محو ہو کر اس کی جگہ وہ دائمی نقش ثبت ہو جاتا ہے جو محبوب حقیقی کی لازوال یاد کا مظہر بن جاتا ہے۔ باری تعالیٰ بندوں کی رہنمائی کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

(القرآن، البقرۃ، ۲:۱۶۵)

’’اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔‘‘

اس آیہ کریمہ کی رو سے اہل ایمان کا شیوہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں ان کا ایمان اپنے کمال کو پہنچتا ہے وہ محبوبان دنیوی سے کٹ کر ذات باری سے جو محبوب حقیقی اور صاحب حسن و جمال ہے ٹوٹ ٹوٹ کر محبت کرنے لگتے ہیں جب ان کے قلوب میں

عشق الٰہی کی آگ بھڑکتی ہے تو سب دنیاوی محبتیں اس میں خس و خاشاک کی طرح بھسم ہو جاتی ہیں اور یاد الٰہی کی شعاعوں سے ان کے من کی تیرہ کائنات مستنیر ہو جاتی ہے۔ محبت الٰہی جب قلب و باطن میں فروغ پا کر جاگزیں ہو جاتی ہے تو اس کی نوعیت محض رسمی و قانونی اور عقلی نہیں رہتی بلکہ ایسا پختہ تر قلبی تعلق ذات باری تعالیٰ سے استوار کر لیتی ہے کہ اس کے پیمانہ محبت میں باقی سب وابستگیاں اور رشتہ و پیوند کے سب مظاہر ہیچ اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔

بندۂ مومن اور منطقی کے تعلق باللہ میں فرق

خدا کی ذات سے عقل و منطق کی اساس پر تعلق قائم کرنا صرف فلسفی و منطقی کا کام ہے۔ جتنا بڑا فلسفی ہو گا اتنا ہی وہ ہر معاملے میں فلسفہ بگھارنے اور عقلی گتھیاں سلجھانے میں سر پیٹتا رہے گا اور ذات و صفات کے اثبات میں عقلی دلائل جمع کرنے میں شب و روز لگا رہے گا لیکن ایک فلسفی کبھی بندۂ مومن کا مقام نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر ہر بات میں عقلی استدلال کا سہارا لیتا ہے اور باری تعالیٰ سے اپنا تعلق قانونی اور رسمی حوالے سے قائم کرتا ہے جبکہ موخر الذکر (بندۂ مومن) کا تعلق خدا کی ذات سے قانونی نسبت سے بدرجہا بلند و بالا ہے۔ وہ اپنے رب سے اس نوعیت کا تعلق استوار کرنے کا متمنی و خواستگار ہوتا ہے جس میں عشق کا جذبہ، محبت کی چاشنی اور ذوق و شوق کی حلاوت ہوتی ہے۔ تڑپنے پھڑکنے کی کیفیت، ایثار و قربانی اور سوز و ساز سے مملو جذبات محبت بندۂ مومن کے قلب و باطن میں یک گونہ اضطراب و التہاب کا شعلہ بھڑکا دیتے ہیں پھر وہ راتوں کی خلوتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کے حضور اشکوں کی سوغات کے ساتھ حاضر ہوتا ہے اور اسے منانے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ رب تعالیٰ اپنے بندے سے اسی قسم کا والہانہ تعلق چاہتا ہے جس میں عقل و خرد کی مصلحتیں قانون اور رسم و رواج کے تقاضے اور رشتے سب مہمل و مجہول ہو جائیں اور تعلق محبت جنون کی حد تک پہنچ جائے۔ اس کیفیت سے سرشار ہو کر بندۂ مومن احکام الٰہی کو بلاچوں و چرا ماننے لگتا ہے اور کسی بات کو عقل و منطق کی کسوٹی پر نہیں پرکھتا۔ محبت خود سپردگی اور وارفتگی کی متقاضی ہوتی

ہے، اس کو تنقید سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ وہ محبوب کے اشارۂ ابرو پر نام و ناموس، عزت و آبرو، آرام وسکون حتی کہ جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

بندۂ مومن اور عشق و محبت کی کرشمہ سازیاں

بندۂ مومن کا رب کی ذات سے والہانہ تعلق اسے دنیا و ماسوا سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس کی راتوں کی ساعتیں سجود و قیام، گریہ و زاری، آہ و بکا اور نالہ و مناجات سے عبارت ہوتی ہیں۔ وہ بتضرع و زاری گڑگڑا گڑگڑا کر ندامت کے آنسوؤں سے تر جبیں کو خاک آلود کرتا ہے اور اپنے رب کو منانے کے لئے عرق انفعال کے موتی خاک میں رولتا ہے۔ عقل ان میں سے کسی شئے کی اجازت نہیں دیتی۔ قانونی تقاضے اور رسم و رواج ان کیفیات جذب و مستی سے قطعاً ناآشنا و بیگانہ ہیں کیونکہ یہ سب باتیں عقل و خرد کی نہیں بلکہ عشق و محبت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اللہ رب العزت اپنے حال مست شب خیزی کرنے والے اور راتوں کی تنہائیوں میں سجود و قیام میں منہمک رہنے والے بندوں کا تذکرہ اپنے کلام پاک میں یوں فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَ قِيَامًا

(القرآن، الفرقان، ۲۵:۶۴)

''اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیام (نیاز) میں راتیں بسر کرتے ہیں۔''

اور ایک دوسرے مقام پر ان کی شان میں ارشاد فرمایا گیا:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ

(القرآن، ال عمران، ۳:۱۹۱)

''یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے

ہیں۔‘‘

وہ بندگانِ حق صبح و شام اپنے رب کے شوق دید کے لئے پیکر اضطراب بنے اسے یاد کرتے رہتے ہیں اور یہ تعلق عشق و محبت کی بناء پر استوار ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ بندے کی سرشت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ جسے اپنے عشق و محبت کا محور بناتا ہے کسی نہ کسی روپ میں اس کی آرزوے دید میں بیتاب اور ناشکیبا رہتا ہے اور صبر و قرار کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اقبال اسی کیفیت کو کس خوبصورتی سے زبانِ شعر میں بیان کرتے ہیں:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبیں نیاز میں

وہ جب اپنے من میں جھانکتا ہے اور دل کے حرم میں دنیاوی علائق کی محبتوں کے کئی بت سجے ہوئے دیکھتا ہے تو اپنے رب کے حضور حالت سجدہ میں جھکے ہوئے اسے یہ ندا سنائی دیتی ہے:

میں جو سربسجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات محبّ کی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے داعیہ محبت کی تسکین اور تعلق بندگی کی تکمیل کے لئے محبوب کو دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے اور اس کے ہجر میں محبوب کے گلی کوچوں اور ہر اس چیز سے جسے اس سے نسبت ہو دیکھ کر اسے تسکین ملتی ہے۔ محبت میں کیا گزرتی ہے؟ اس کا حال پوچھنا ہو تو مجنوں سے پوچھو جسے لوگوں نے دیکھا کہ ایک کتے کے تلوے چوم رہا تھا۔ پوچھا یہ کیا دیوانگی کی حرکت کر رہے ہو؟ کہنے لگا: تمہیں کیا خبر! یہ کتا اکثر میری لیلیٰ کی گلی سے گزر کر جاتا ہے۔

پائے سگ بوسید مجنوں خلق گفتہ ایں چہ بود
گفت گاھے گاھے ایں در کوئے لیلیٰ رفتہ بود

محبت میں وارفتگی اور ٹوٹ کر چاہنے کا انداز

یہ تقاضائے محبت ہے کہ محبوب کے ہجر میں عاشق زار کو اس سے منسوب کوئی چیز نظر آ جائے تو وہ اپنی جان سوختہ اور قلب بریاں کی تسکین کے لئے اس کی طرف دیوانہ وار لپکتا ہے اور بہ دل و جان اسے چاہنے لگتا ہے۔ محبوب سے جنون و وارفتگی کی حد تک ٹوٹ ٹوٹ کر محبت کرنے اور سب سے کٹ کر اسی کا ہو کر رہ جانے کا ذکر اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

(القرآن، المزمل، ۸:۷۳)

''اور آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیئے اور سب کو چھوڑ کر (سب سے الگ ہو کر) اس کے ہو جایئے۔''

محبت میں اس حد تک آگے نکل جاؤ کہ ہمہ وقت محبوب کا نام ہی وردِ زبان اور حرز جاں ہو کر رہ جائے محبّ کی سرشت میں رکھ دیا گیا ہے اور درج بالا ارشادِ قرآنی کی رو سے مولا اپنے بندے سے اسی قسم کی محبت کا طالب ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جذبہ محبت کی اس شدت و وارفتگی کی تسکین کا بھی کوئی سامان مہیا کیا گیا جس سے بندۂ اپنے مولا سے ایسی وابستگی کا تعلق استوار کر سکے؟ عبادات میں نماز کو لیجئے جس میں بندہ اپنے رب کی یاد میں یکسوئی اور محویت کے عالم میں مستغرق ہو کر آنسو بہاتا ہے لیکن نماز میں رونا دھونا اور نالہ و زاری، جذبہ محبت الٰہی کی تسکین نہیں کرتا بلکہ بندۂ مومن کے سینے میں عشق و محبت کی آگ کو اور بھڑکا دیتا ہے اور محبوب حقیقی کے ہجر سے پیدا ہونے والے اضطراب و ناشکیبائی میں دوچند اضافہ کر دیتا ہے۔

روزے سے محبوب کے حکم کی تعمیل تو ہو جاتی ہے لیکن اس جذبہ محبت کی تسکین نہیں ہو پاتی۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی محبوب کے احکام کی تعمیل اور پیروی تک محدود ہے اور اس سے عشق و محبت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ حکم ماننا اور بات ہے اور محبوب

کے پیکرِ حسن و جمال کو دیکھ دیکھ کر جینا اور اس کی تلاش و جستجو میں آوارہ و سرگرداں پھرنا اور بات ہے۔

تقاضائے محبت کی تکمیل و تسکین کا ذریعہ صرف حج ہے

ہم نے دیکھا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور کسی بھی نفلی و فرض عبادت سے حکم الٰہی کی تکمیل تو ہو جاتی ہے لیکن عشق و محبت کی وہ آگ جو بندۂ مومن کے سینے میں محبوب کے ہجر و فراق کی وجہ سے ہر لحظہ بھڑکتی رہتی ہے فرو نہیں ہوتی پھر بندہ سراپا سوال بن کر اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اسی نے سب داعیات محبت اور جذبات عشق و مستی انسان کے اندر پیدا کئے ہیں اور وہی ان کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے تو اسے جواب ملتا ہے کہ اگر اپنے عشق و محبت کے تقاضوں کی تکمیل چاہتے ہو تو میرے گھر میں حج کے لئے آ جاؤ کہ سب عبادات میں صرف حج ہی ایسی عبادت ہے جو سرتاپا جنون و وارفتگی اور عشق و محبت کی آئینہ دار ہے اور اس میں عقل و منطق اور قانون کا کوئی عمل دخل نہیں۔

حج کا اگر تجزیہ کریں تو اس کے مناسک و ارکان سراسر شعائر اللہ کی تعظیم اور محبوبانِ الٰہی کی یاد میں عشق و محبت کے والہانہ پن سے عبارت ہیں۔ اللہ کے گھر میں داخل ہوتے ہی آنکھیں برسات کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں اور آنسوؤں کی پہلی جھڑی سے ہی اس جذبہ عشق و مستی کی تسکین محسوس ہوتی ہے جسے مہجوری کی آنچ نے اور سوا کر دیا تھا۔ خانہ خدا میں قدم رکھتے ہی بندہ دیوانہ وار خشت و سنگ سے بنی ہوئی ایک عمارت کے گرد دوڑنا اور چکر لگانا شروع کر دیتا ہے۔

وہ اس شہر اس بلد امین میں یہ سمجھ کر قدم رکھتا ہے کہ میرے محبوب کا شہر ہے، حرم کعبہ میں پہنچ کر وہ ابھی سجدہ ریز نہیں ہوتا۔ رکوع و قیام اور نماز میں داخل نہیں ہوتا بس غلاف کعبہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کے پیمانے اشکوں سے لبریز ہو جاتے ہیں اور پلکوں تلے برسات کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی اسے پوچھے کہ یہ رقت اور گریہ و زاری کی کیفیت کیوں طاری ہو گئی تو اس کے پاس عقلی طور پر کوئی جواب نہ بن پائے گا، وہ بے

ساختگی سے بس یہ کہہ سکے گا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہ میرے محبوب کا گھر ہے جسے جاگتی آنکھوں دیکھنے کی آرزو مدت العمر اس کے نہانخانہ دل میں پرورش پاتی رہی ہے اور اس کی زندگی کے یہ لمحات عمر بھر کی تمنا کا حاصل ہیں جن کے لئے اس نے ہزاروں میل کی مسافت طے کی ہے اور طویل سفر کی صعوبتیں اور مشقتیں جھیلی ہیں۔

مناسک حج ...... عشق و شیفتگی کا آئینہ دار ہیں

پھر وہ بیت اللہ کے صحن میں آ کر سجود و رکوع و قیام کسی قسم کی چیز نہیں کرتا بلکہ آتے ہی اپنے قیمتی اور بڑے چاؤ سے سلائے ہوئے کپڑے اتار پھینکتا ہے اور دو کھلی ان سلی چادریں جو کفن سے مشابہ ہیں، زیب تن کر لیتا ہے۔ ٹوپی و دستار جسے عزت کا نشان سمجھا جاتا ہے، اتار کر ننگے سر اور ننگے پاؤں محبوب کے گھر کے صحن میں آ جاتا ہے اور یک گونہ بیخودی سے دیوانہ وار دوڑنے لگتا ہے اور حرم کعبہ کے گرد سات چکر مکمل کرتا ہے جسے عرف عام میں 'طواف' کہا جاتا ہے۔ وہ ایک گوشے میں ایک پتھر نصب دیکھتا ہے جس کی طرف وہ دیوانہ وار لپکتا ہے اور ہزار دھکم پیل کے باوجود بڑی محنت و جانفشانی سے اس کے قریب پہنچتا ہے اور بے اختیار اسے چومنے لگتا ہے۔ وہ اس کی عقلی توجیہہ نہیں کر پاتا اسے بس اتنا پتہ ہے کہ یہ حجر اسود ہے جسے سرکارِ دوجہاں ﷺ نے بوسے دیئے تھے اور اسی نسبت سے اسے بوسہ دینا وہ بہت بڑی سعادت خیال کرتا ہے۔ یہ سب کچھ سوائے جذبہ محبت کی تسکین کے اور کیا ہے؟

طواف سے فارغ ہو کر وہ ایک مقام پر جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشان ثبت ہیں رک جاتا ہے اور وہاں اس ارشاد خداوندی کی تعمیل میں سجدہ ریز ہوتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى

(القرآن، البقرة، ۲:۱۲۵)

''اور (حکم دیا کہ) ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ کو مقام نماز بنا

لو۔‘‘

کی صورت میں تمام حجاج کے لئے تا قیام قیامت ابدی حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ یوں تو تمام روئے زمین امت مسلمہ کے لئے سجدہ گاہ ہے لیکن اس مقام کو خصوصیت کے ساتھ مصلی (جائے نماز) بنانے کا حکم ہوا اس لئے کہ یہاں اللہ کے ایک محبوب بندے کے مبارک قدم لگے تھے۔

پھر وہ حرم پاک سے کچھ فاصلے پر دو پہاڑ صفا و مروہ دیکھتا ہے جن کی طرف اس کے قدم بے اختیار اٹھ جاتے ہیں اور وہ دوڑ کر کبھی اس پہاڑ پر چڑھتا ہے اور کبھی اس پہاڑ پر اور اس طرح ان کے درمیان سات چکر مکمل کرتا ہے جسے سعیٔ صفا و مروہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ عجیب ماجرا اور طرفہ تماشا ہے کہ یوں تو دنیا میں ہزار ہا پہاڑ ہوں گے لیکن ان دو پہاڑوں کی بات ہی کچھ اور ہے، ان دو پہاڑوں کی نسبت اللہ کی پیاری بندی حضرت ہاجرہ اور اس کے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہے جن کی بنا پر انہیں شعائر اللہ قرار دے دیا گیا۔

والہانہ عشق و محبت کے مظاہر

اللہ کا بندہ احرام باندھے ہوئے ننگے سر جب صفا و مروہ کی سعی کر لیتا ہے تو اس کی حجامت بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور بال کنگھی سے بے نیاز کھلے چھوڑے ہوتے ہیں۔ جب وہ سات چکر مکمل کر لیتا ہے تو وہ بال جن کو اپنی زیب و زینت سمجھ کر بنا سنوار کر رکھتا تھا انہیں استرے سے منڈوا ڈالتا ہے، پہلے ناخن بڑھے ہوئے تھے جنہیں وہ کٹوانے سے اجتناب کرتا تھا اب انہیں کٹوا لیتا ہے۔ کبھی منیٰ کی طرف بھاگتا ہے، خیمے گاڑتا ہے اور عرفات میں شام تک قیام کرتا ہے اور پھر خیمے اکھڑوا کر خانہ بدوشوں کی طرح چل پڑتا ہے۔ نماز ظہر کا وقت آتا ہے تو وہ جو عمر بھر قانون خداوندی

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا

(القرآن، النساء، ۴:۱۰۳)

’’بے شک نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے حساب سے فرض ہے۔‘‘

کی تعمیل میں ہمیشہ نماز اپنے وقت پر پڑھنے کا عادی تھا۔ عصر کی نماز قضا کر کے ظہر کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ اس کے محبوب ﷺ نے اس میدان عرفات میں ظہر و عصر کو ملا کر پڑھا تھا۔ اب اس کا اتباع ہر کس و ناکس کے لئے واجب قرار پایا۔ اس میں عقل و منطق کا کوئی دخل نہیں۔ نہ کوئی سفر درپیش ہے نہ جہاد ہے اور نہ کوئی مجبوری۔ بس حکم ہے کہ عصر کو ظہر کے وقت میں ادا کیا جائے پھر مغرب کا ہنگامہ سر پر آ جاتا ہے۔ وہ عمر بھر غروب آفتاب کے بعد نماز مغرب ادا کرنے کا پابند تھا لیکن یہاں آ کر قانون شریعت کی وہ پابندی معطل ہوگئی وہ نماز کا وقت دیکھا ہے لیکن اس کی ادائیگی سے اس لئے گریز کرتا ہے کہ محبوب خدا ﷺ نے اس وقت نماز ادا نہیں کی تھی وہ اسے قضا کر کے مزدلفہ جا کر عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھتا ہے۔

مزدلفہ پہنچ کر سفر سے گریزپا انسان سوچتا ہے کہ رات گزرنے کے بعد کچھ سستاؤں اور آرام کرلوں لیکن ندا آتی ہے کہ مزدلفہ کو چھوڑ کر خیمہ یہاں گاڑھ لے اور پتھر کے ستونوں کو شیطان سمجھ کر انہیں کنکریاں مار! عقل لاکھ کہتی ہے کہ شیطان کہاں یہ تو پتھر ہیں انہیں کنکریاں کیوں ماری جائیں؟ لیکن عشق کہتا ہے کہ یہاں تیرا حکم نہیں چلتا میرا حکم ہے کہ ان پتھروں کو کنکریاں ماری جائیں پس وہ محبت کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے تین دن تک انہیں کنکریاں مارنے جاتا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس فعل کو اللہ کے ایک مقرب بندے سے نسبت ہے جس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اللہ کو یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اب اس کی یاد کو قیامت تک دہرانے کا حکم دے دیا گیا۔

پھر اللہ کا بندہ منیٰ پہنچ کر قربانی کرتا ہے اور قربانی کے بعد شہر مکہ لوٹ آتا ہے کبھی یہ صحرا نوردی اور بادہ پیمائی اور کبھی یہ شہر گردی، عجیب معاملات عشق ہیں! شعائر اللہ کی بغیر سوچے سمجھے تعظیم اور دیوانہ وار طواف اور بھاگ دوڑ یہ سب باتیں پاس ادب اور تقاضائے محبت ہیں ان کی کوئی عقلی توجیہہ ممکن نہیں بس محبوبان الٰہی کی یادیں ہیں جنہیں جاری و ساری کرنے کا اہتمام عبادت کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔

شعائر اللہ کی تعظیم اور حج

شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم فریضہ حج میں اساسی اہمیت کی حامل ہیں، ارشاد ربانی ہے:

ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ

(القرآن، الحج، ۲۲:۳۲)

”یہی (حکم) ہے اور جو شخص اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ (تعظیم) دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔“

شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم اور ان کا ادب اللہ کی نظر میں اتنا مقام رکھتا ہے کہ اسے دلوں کے تقویٰ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

بادی النظر میں پہاڑ، پتھر اور قربانی کے جانوروں کی حیثیت عام چیزوں جیسی ہے لیکن خدا کے محبوب و مقبول بندوں سے نسبت ہونے کی بناء پر ان کی تعظیم و ادب اتنی بڑی عبادت بن گیا جو دلوں کے تقویٰ کا موجب ہے، ارشاد فرمایا گیا:

ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰہِ فَھُوَ خَیْرٌ لَّـہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ

(القرآن، الحج، ۲۲:۳۰)

”یہی (حکم) ہے اور جو شخص اللہ (کی بارگاہ) سے عزت یافتہ چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے رب کے ہاں اس کے لئے بہتر ہے۔“

پس جو شخص شعائر اللہ کا احترام اور تعظیم بجا لاتا ہے اس کا یہ فعل مندرجہ بالا فرمودۂ خداوندی کے مطابق اللہ کے ہاں بہتر قرار دیا گیا ہے۔

عبادت اور ادب میں فرق

یہاں ایک نکتہ غور و فکر اور توجہ کا محتاج ہے کہ عبادت خدا کے لئے ہوتی ہے جبکہ

ادب و تکریم مخلوق خدا کا ہوتا ہے جس کا عبادت سے کوئی سروکار نہیں جب شعائر اللہ کی تعظیم و ادب کا حکم دیا جا رہا ہے تو اس کے پس پردہ حکمت یہ ہے کہ رب العزت نے انسان کے داعیہ محبت کو بلند و بالا مقام عطا کیا ہے وہ اس طرح کہ اپنے انبیاء کرام اور برگزیدہ و مقبول بندوں کی داستانوں اور زندگی کے ان واقعات کو چن چن کر بنی نوع انسان کے سامنے رکھا ہے جو عشق و محبت، ایثار و قربانی اور وفا کے باب میں سب کے لئے ابدی معیار کا درجہ اختیار کر گئے ہیں لہٰذا شعائر اللہ کی یاد کو قلوب و اذہان میں جاری و ساری رکھنے کے لئے گویا رب ذوالجلال کی طرف سے

گاهے گاهے بازخواں ایں قصه پارینه را

کا پیغام تمام دنیائے انسانیت کو دیا گیا۔

براہیمی علیہ السلام امتحان و آزمائش کے بصیرت افروز واقعات

پہلا امتحان

حضرت ابراہیم علیہ السلام قافلہ عشاق کے سرخیل اور سردار ہیں۔ جدالانبیاء ہونے کے ناطے قرآن حکیم نے خصوصیت کے ساتھ ان کی داستان عشق و محبت، امتحان و آزمائش کے واقعات اور نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ میں بے خطر کود جانے کا قصہ جس کے بارے میں روایات ہیں کہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اگر وہ چاہیں تو آتش نمرود کو پر مار کر اس پر الٹا دیں لیکن اس پیکر تسلیم و رضا نے امتحان عشق سے گریز پائی کہ راہ اختیار نہ کی اور انجام سے بے پروا ہو کر

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

کی داستان کا جلی عنوان تاریخ کے صفحات پر چھوڑ گئے۔ عشق کے اس امتحان میں کامیابی کا تذکرہ جو

يَا نَارُ كُونِيْ بَرْدًا وَ سَلَامًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ

(القرآن، الانبیاء، ۲۱:۶۹)

''ہم نے فرمایا اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سراپا سلامتی ہو جا۔''

کے الفاظ میں قرآن حکیم نے بیان کی وہ آج بھی زبان زد خاص و عام ہے۔

دوسرا امتحان

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دوسرا امتحان عشق اس وقت لیا گیا جب بیٹا ابھی شیرخوار تھا حکم ہوا کہ اپنی محبوب زوجہ حضرت ہاجرہ اور بیٹے کو لق و دق صحرا اور بے آباد ویرانے میں لے جا کر چھوڑ آؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزمائش کا یہ مرحلہ بھی خندہ پیشانی اور کامیابی سے سر کر لیا اور مکہ کے قریب بے آب و گیاہ وادی میں انہیں چھوڑ آئے جس کا ذکر قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

اِنِّی اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ

(القرآن، ابراہیم، ۱۴:۳۷)

''بے شک میں نے اپنی اولاد (اسماعیل) کو (مکہ کی) بے آب و گیاہ وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا ہے۔''

یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی کعبہ کی تعمیر عمل میں نہ آئی تھی لیکن چشم افلاک اس بات کا نظارہ کر رہی تھی کہ یہ مقام جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ اور لخت جگر کو چھوڑ کر جا رہے ہیں خدا کے گھر کے طور پر منتخب کر لیا گیا ہے پھر مشیت خداوندی کی تکمیل خانہ کعبہ کی ازسرنو کی صورت میں جریدۂ عالم پر نقش دوام کا درجہ اختیار کر گئی۔ قرآن حکیم نے اس عظیم اور یادگار واقعے کو ان لافانی الفاظ میں ہمیشہ کے لئے اسلامی تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے:

وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰھِیۡمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ

(القرآن، البقرۃ، ۲:۱۲۷)

''اور (یاد کرو) جب ابراہیم اور اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔''

کیا دیدنی منظر تھا! باپ راج اور بیٹا مزدور کی حیثیت سے کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے جب وہ گھر تعمیر ہو چکا تو بارگاہ خداوندی کی طرف سے عام اعلان کر دیا گیا کہ یہ گھر جو میرے دو عاشقوں نے اپنے خون پسینے کی محنت سے تعمیر کیا ہے میرا اپنا گھر ہے۔ یہ مقبول و محبوب بندے جن پر میرے عشق و محبت میں جتنے بھی امتحان آئے سب میں وہ کامیاب اور سرخرو نکلے ہیں۔ اب ان کو جزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا اجابت کے مقام کو پہنچی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جدامجد کی یادگاروں کو شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جزو لاینفک بنا کر حج کے ارکان و مناسک کی صورت میں ابدالاباد تک جاری و ساری کر دیا۔

تیسرا امتحان

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تیسرے امتحان کا مرحلہ اس وقت آیا جب ان کے بڑھاپے کی اکلوتی اولاد فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام جو ناز و نعم کی آغوش میں پلے بڑھے ان کے بارے میں حکم ہوا کہ اسے میرے نام پر قربان کر دو۔ قرآن حکیم میں باپ بیٹے کے درمیان جو مکالمہ مذکور ہے وہ قربانی کی تاریخ کا فقید المثال اور شاندار باب ہے، ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يَا بُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّي اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يَاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَآءَ اللهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ

(القرآن، الصفت، ۱۰۲:۳۷)

''حضرت ابراہیم نے فرمایا اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں پس تم بھی غور کر لو کہ تمہارا کیا خیال ہے (اسماعیل نے بلاتردد) عرض کیا اے باپ! پھر دیر کیا ہے جو کچھ آپ کو حکم ہوا کر ڈالیئے (جہاں تک میرا تعلق ہے) آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں

گے۔‘‘

عشق کے امتحان میں باپ اور بیٹے نے جو دونوں ایک ہی ذات کے عاشق اور قتیل تھے، بلاتامل اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ باپ چھری ہاتھ میں لئے حلقوم پسر کی طرف بڑھا اور بیٹا خودسپردگی کے عالم میں اللہ کی رضا پر قربان ہونے کے لئے بہ دل و جان آمادہ و تیار ہو گیا۔ شیطان نے لاکھ بہکانے اور ورغلانے کے جتن کئے لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ باپ نے بیٹے کی گردن پر تسلیم و رضا کی چھری چلا دی اور چشم فلک نے زیرآسمان وہ عجیب و غریب منظر دیکھا جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے راہ خدا میں قربان ہونے کا جذبہ قربانی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، بقول اقبال:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ یادگار قربانی بارگاہ ایزدی میں یوں شرف قبولیت پا گئی کہ اس ذبح عظیم کی یاد کو رہتی دنیا تک علامتی طور پر قربانی کی صورت میں زندہ جاوید کر دیا گیا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے راہ خدا میں جس طرح تسلیم و رضا کی گردن خم کر دی اس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا:

فَلَمَّا اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ○ وَ نَادَيۡنَاهُ اَنۡ يّٰاِبۡرَاهِيۡمَ○ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡيَا اِنَّا كَذَالِکَ نَجۡزِیۡ الۡمُحۡسِنِيۡنَ○

(الصفت، ۳۷:۱۰۳۔۱۰۵)

’’پھر جب دونوں نے (اللہ کا) حکم مان لیا اور (ابراہیم نے) ان کو ماتھے کے بل لٹایا اور ہم نے ان کو ندا دی کہ اے ابراہیم (کیا خوب) تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا ہم نیکوکاروں کو یوں ہی بدلہ دیتے ہیں۔‘‘

اس امتحان عظیم میں کامیابی کا مژدہ جان فزا قرآن حکیم نے ان الفاظ کے

ساتھ اپنے محبوب بندے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سنایا:

وَ فَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ وَ تَرَکۡنَا عَلَیۡهِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ

(الصفت، ۳۷:۱۰۷۔۱۰۸)

''اور ہم نے ایک عظیم قربانی کو ان کا فدیہ (بنا) دیا اور ہم نے ان کے آنے کے بعد آنے والوں میں ان (کے ذکر خیر) کو (یوں) باقی رکھا۔''

اللہ رب العزت کو اپنے ان خاص بندوں کی ادا اتنی پسند آئی کہ اس واقعہ کو ذبح عظیم قرار دے کر ہر سال اس کی یاد کی تجدید کا حکم امت مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے شریعت مطہرہ کا حصہ بنا دیا جس کا اتباع تا قیام قیامت سنت ابراہیمی کے طور پر واجب قرار پایا۔

جزو دوم

حج کا تاریخی پس منظر

سب سے پہلی مقدس عمارت جو روئے زمین پر عبادت خداوندی کے لئے تعمیر کی گئی اور جو گم کردہ راہ انسانیت کے لئے رشد و ہدایت کا مرکز اولین قرار پائی، قرآن حکیم کی نص قطعی کے مطابق کعبۃ اللہ ہے جس کی بنیادیں منشائے ایزدی کی تعمیل میں ایک اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدد و معاونت سے جزیرہ نمائے عرب کے قدیم تاریخی شہر مکہ میں اٹھائیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ

(القرآن، ال عمران،۳:۹۶)

’’بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لئے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ ہے برکت والا ہے اور سارے جہان والوں کے لئے (مرکز) ہدایت ہے۔‘‘

آیہ کریمہ بصراحت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ زمین پر حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سرزمین مکہ کو بنی نوع انسان کی ہدایت کا پہلا مرکز ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ تاریخی تناظر میں دیکھیں تو یہ بات قرین فہم معلوم ہوتی ہے کہ وہ خطہ زمین جسے خانہ خدا کی تعمیر کے لئے منتخب کیا گیا کوئی بے آباد اور ویران مقام نہ تھا بلکہ مدت سے یہ انسانوں کی بستی بن چکا تھا چونکہ اس معمورہ خاک کو آنے والی نسلوں کے لئے تہذیب و ثقافت اور علم وعرفان کا گہوارہ بننا تھا اس لئے سب سے پہلے گھر (بیت اللہ) کی مقدس تعمیر کا فریضہ ان مقدس ہاتھوں سے سرانجام پایا جو اللہ کے انتہائی برگزیدہ اور محبوب بندے تھے۔

اللہ اللہ! وہ کیا دیدنی منظر ہو گا جب انسانیت کے اولین معمار پتھر اور گارے سے وہ لافانی اور یادگار عمارت تعمیر کر رہے ہوں گے جسے جریدۂ عالم پر ثبت دوام حاصل کرنا تھا۔ قرآن حکیم میں اس اولین تعمیر کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

(القرآن، البقرۃ، ۲: ۱۲۷)

''اور (یاد کرو) جب ابراہیم اور اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دونوں دعا کر رہے تھے) کہ اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ خدمت) قبول فرما لے بے شک تو خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔''

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے اولین گھر کی تعمیر سب سے پہلے نسل انسانی کے اب و جد حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی اور یہ قرن ہا قرن تک دعوت و تبلیغ حق کا مرکز بنی رہی۔ یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں کفر و شرک اور الحاد کے غلبے کی بنا پر ان کی دعا سے وہ عظیم طوفان (Great Deluge) آیا جس میں دنیائے کفر و شرک کی ہر شے صفحہ ہستی سے ناپید ہو گئی۔ روایات میں ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام میں کعبہ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا اور روئے زمین پر اس کے کوئی آثار باقی نہ رہے۔

سرزمین مکہ کی عظمت کا سبب

وہ مقدس قطعۂ زمین جسے خدا کے پہلے گھر کے لئے انتخاب کیا گیا اسے یہ عزت و تکریم اور شرف اس لئے حاصل ہوا کہ اسے فخر دو عالم نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جائے پیدائش ہونے کا اعزاز ملنا تھا۔ اس سرزمین بطحا پر فاران کی چوٹیوں سے اس ابدتاب نور کا ظہور ہونا تھا جس کی تابانیوں سے ایک دن شرق و غرب کے سب اندھیرے دور ہونے والے تھے تاکہ خدا ناآشنا دنیا کو توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جاسکے اور آفتاب رشد و ہدایت کی کرنوں سے ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی کائنات بقعہ نور بن جائے۔ یہی سبب

ہے کہ تعمیر کعبہ کے بعد خانوادہ اسماعیل علیہ السلام جسے آنحضور ﷺ کے آباء ہونے کا شرف حاصل ہونا تھا اس سرزمین میں آباد ہوگیا اور وہ نورِ سرمدی پاکیزہ صلبوں میں منتقل ہوتا ہوا آخرکار پہلوئے آمنہ رضی اللہ عنہا سے ہویدا ہوگیا۔

کعبہ...... دعوت وتبلیغ کا عالمگیر مرکز

کعبۃ اللہ کی تعمیر کی بنیاد ایمان و اخلاص کے خمیر سے اٹھائی گئی۔ اگرچہ یہ تعمیر انتہائی سادگی کا مرقع اور ظاہری حسن و آرائش سے خالی تھی تاہم اس میں وہ کشش اور مقناطیسیت رکھ دی گئی کہ اطراف و اکنافِ عالم سے لوگ جوق در جوق اس کی طرف آنے لگے۔ قرآن حکیم زائرین کعبہ کے لئے اس مقام کی تقدس مآبی کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے:

فِيهِ آيٰتٌ بَيِّنَاتٌ مُقَامُ اِبْرَاهِيمَ

(القرآن، ال عمران، ۳: ۹۷)

''اس میں کھلی نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) ابراہیم کی جائے قیام ہے۔''

وہ جگہ جہاں اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک لگے ایسی روشن نشانیوں کی دلیل بن گئی کہ اس کی یاد انسانی قلوب و اذہان سے امتدادِ زمانہ کے باوجود کبھی محو نہ ہوسکی۔ وہ تعمیر جس کی بنیاد موحدِ اعظم نے صدق و اخلاص پر رکھی تھی رہتی دنیا تک مینارِ نور بنی رہے گی۔ اس مقام کو عالمگیر دعوت وتبلیغ اسلام کے مرکز اور نقطہ آغاز کے طور پر منتخب کرلیا گیا اور جس دینِ حنیفی کی بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سرزمین کعبہ میں ڈالی اس کی تکمیل حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد اپنے انجام کو پہنچ گئی گویا وہ بیج جو حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ارضِ بطحا میں بویا تھا صدیوں بعد نمو پا کر ایک چھتنار شجر کی صورت میں عالم پر سایہ فگن ہوگیا۔

دعوتِ ابراہیم کی ہمہ گیریت

نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے خدائے واحد و قدوس نے بنائے

کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ سب جہاں والوں کو اللہ کے گھر میں آنے کی دعوت دیں۔ اس عالمگیر دعوت اور پکار کا ذکر قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ○

(القرآن، الحج،۲۲: ۲۷)

''اور تم لوگوں میں حج کا بلند آواز سے اعلان کرو وہ تمہارے پاس پیدل اور تمام دبلے اونٹوں پر (سوار) حاضر ہو جائیں گے جو دور دراز کے راستوں سے آتے ہیں۔''

احادیث مبارکہ میں اس دعوت ابراہیمی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بوقبیس نامی پہاڑ پر چڑھ گئے اور وہاں سے تمام ساکنانِ عالم کو بیت اللہ میں حاضر ہونے کے لئے ندا دی۔ روایات میں ہے کہ یہ ندائے ابراہیمی نہ صرف عالم ارضی کے ہر متنفس نے سنی بلکہ عالم ارواح میں بھی اسے سنا گیا اور ہر ایک نے اس کے جواب میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق لبیک کہا۔

خدائے قدوس نے پھر اپنے برگزیدہ پیغمبروں حضرت ابراہیم و اسماعیل کو اپنے گھر کے آداب ملحوظ رکھنے کی تعلیم بایں الفاظ فرمائی:

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِیَ لِلطَّائِفِیْنَ وَالْعَاكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ

(القرآن، البقرہ،۲: ۱۲۵)

''میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک (صاف) کر دو۔''

اس آیۂ کریمہ میں انسانوں کو بیت اللہ کی حاضری کے آداب و قواعد اور تقاضوں کی بجا آوری کے بارے میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے اور اسے ہر قسم کی نجاست اور

آلائش سے پاک و صاف رکھنے کی تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ یہ ہر پہلو سے خدا کے جمال و جلال کا مظہر اور اپنے تقدس کے اعتبار سے اس ظاہری و باطنی حسن و زیبائی کا آئینہ دار ہو جس میں خدائے واحد کی شان خلاقیت و معبودیت جھلکتی ہو۔ خدا کا یہ گھر اپنے اچھوتے انداز میں شرق یا غرب رہنے والے انسانوں کی عبادت، طواف اور قیام و سجود کے لئے ہمہ وقت وقف ہے اور روز و شب کی کوئی ساعت ایسی نہیں جب پرستاران توحید اس میں محو عبادت نہ ہوں۔

موجودہ تاریخ انسانی اور حج

موجودہ تاریخ اسلام کا آغاز آج سے کوئی ساڑھے چار ہزار سال پہلے ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کے جواب میں حرم کعبہ کی تعمیر کے بعد پہلے حج کا آغاز ہوا انسانی محفوظ تاریخ (History Recorded) زمانہ گوشہ گمنامی میں پڑے ہونے کے باعث قبل از تاریخ(Prehistoric) زمانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ موجودہ انسانی تہذیب و تمدن کے بانی اور موسس اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے ظلم و جہالت کی تیرگی میں بھٹکنے والے قافلۂ انسانیت کو ایک ایسا روشنی کا مرکز عطا فرمایا جس نے شبستان جہاں میں ایمان و ایقان کے اجالے بھر دیئے۔ اسلام (بطور دین فطرت) کے پہلے داعی حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جن کی دعوت و تبلیغ حق سے دنیائے کفر والحاد توحید سے آشنا ہوئی اور خود ساختہ جھوٹے خداؤں کا پندار مٹی میں مل گیا۔

آغاز حج کی تاریخ

تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت ابھرتی دکھائی دیتی ہے کہ باقاعدہ سلسلہ حج کا آغاز بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی تین ہزار سال قبل ہوا اور یہ کسی نہ کسی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ورودِ مسعود تک جاری رہا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ حج کے طور طریقے اور ضابطے بدلتے چلے گئے اور ان میں ایسے رسوم اور رواج شامل کر لئے گئے جو دین

ابراہیمی کی روح کے منافی تھے۔ ان کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

حضرت ابراہیم کے بعد بنی اسرائیل کے ادوار میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر منصب نبوت وحکومت پر متمکن ہوئے تو بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس قرار پایا وہ حکم خداوندی کے تحت اپنی عبادت بیت المقدس کیطرف منہ کرتے تھے۔ جب خاتم الانبیاء فخرِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہوئی تو دین ابراہیم کے پیرو بیت المقدس کو ہی اپنا قبلہ مانتے تھے۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے نام لیوا ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نمازیں ادا کرتے رہے۔ حتی کہ خدائے ذوالجلال نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کی تکمیل میں بیت المقدس کی جگہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے تعمیر کردہ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قراد دیا۔

حج کے مناسک (ابراہیمی) میں تحریف

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقرر کردہ حج کے طریقوں میں تحریف اور تبدیلی کی جانے لگی اور اس کی ہئیت وشکل پے بہ پے تبدیلیوں کے عمل سے مسخ ہوتی چلی گئی اور بالآخر ایسی بے سروپا رسموں کی صورت اختیار کرگئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کی روح سے ہم آہنگ نہ تھی۔ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر ان تحریفات کا ذکر کیا ہے۔

منجملہ رسوم میں ایک رسم جسے زمانۂ جاہلیت کے عربوں نے اپنے ہاں بطور خاص رواج دے رکھا تھا وہ احرام باندھنے سے متعلق تھی۔ اہل عرب جب حج کے ارادے سے احرام باندھ لیتے تو وہ اپنے اوپر گھر میں اصل دروازوں سے داخل ہونا حرام قرار دے لیتے بلکہ عقبی دیوار پھاند کر یا پچھواڑے میں کسی کھڑکی یا روزن کے راستے سے گھروں کے اندر داخل ہوتے اور اپنے اس فعل کو وہ مناسک حج کا حصہ اور عبادت تصور کرتے۔ قرآن حکیم نے اس مضحکہ خیز اور بلاجواز رسم کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ اس میں کسی قسم کی نیکی کا کوئی تصور نہیں ارشاد ربانی ہے:

وَ لَيۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَأۡتُوۡا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰى

(القرآن، البقرہ،۲: ۱۸۹)

''اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم (حالت احرام میں) گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی تو (ایسی الٹی رسموں کی بجائے) پرہیزگاری اختیار کرنا ہے۔''

ارشادِ خداوندی کی رو سے نیکی تو اللہ کے ہاں تقویٰ کا نام ہے اور گھر کے عقبی دیواروں کو پھاند کر اندر داخل ہونا محض توہمات کے ذیل میں آتا ہے جو نیکی کے کسی تصور سے ہرگز لگاؤ نہیں رکھتا۔ قرآن مجید نے اس طرح نیکی کا اصل الاصول بیان فرما کر اس بیہودہ اور لغو رسم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

عربوں کے دور جاہلیت کی ایک اور رسم حج اور عمرے سے متعلق تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرے کی ادائیگی یک جا نہیں ہوسکتی۔ اس غلط عقیدے کی بنا پر انہوں نے حج اور عمرے کے لئے الگ الگ مہینے مقرر کر رکھے تھے جس کے لئے وہ جدا جدا سفر اختیار کرتے۔ اس سے دور دراز کی مسافت طے کر کے آنے والے لوگوں کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسلام کی آمد سے اس خود ساختہ رسم کو منسوخ کر دیا گیا اور ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج کرنے کی ہر ایک کو اجازت مل گئی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنۡ حَجَّ الۡبَيۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ اَنۡ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا

(القرآن، البقرہ،۲: ۱۵۸)

''چنانچہ جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے (درمیان) چکر لگائے۔''

اسلام دین فطرت ہونے کے ناطے سہل العمل ہے اور وہ اس لئے مبعوث ہوا ہے کہ انسانوں کو ان تمام ناروا پابندیوں اور رسم و رواج کی زنجیروں سے رہائی دلا دے جو مدت مدید سے توہمات پر مبنی اعتقادات اور بے بنیاد نظریات نے ان پر مسلط کر رکھی تھیں۔

اس ضمن میں سرِ درود عالم رحمت مجسم ﷺ کا یہ ارشاد خصوصی توجہ کا مستحق ہے:

کل شئ من أمر الجاهلية تحتَ قَدمی

(مسلم، الصحیح، ۲: ۸۸۹، رقم: ۱۲۱۸)
(ابوداؤد، السنن، ۲: ۱۸۵، رقم: ۱۹۰۵)

''زمانہ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے قدموں کے نیچے روند دی گئی ہیں۔''

ایک اور غلط نظریہ اور تصور زمانہ جاہلیت کے عربوں کے ہاں جکڑ پکڑ چکا تھا۔ جس کی رو سے انہوں نے اپنے اوپر حج کے سفر کے دوران زادِ راہ ہمراہ لے جانا حرام قرار دے دیا تھا۔ وہ حج کے لئے سفر پر نکلتے تو اپنے ساتھ کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا سامان لے جانا اپنے نام نہاد تقویٰ کے منافی سمجھتے تھے۔ قرآن حکیم میں ذات باری تعالیٰ نے ان کے اس بے بنیاد اور لغو تصور کی قلعی کھول دی۔ ارشاد فرمایا:

وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۹۷)

''اور (آخرت کے) سفر کا سامان کر لو بے شک سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے اور اے عقل والو! میرا تقویٰ اختیار کرو۔''

یہاں یہ بات ذہن میں مستحضر کر لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کریم زندگی کے ہر گوشے ہمہ نوع انسانی مسائل کی تہہ پر نظر رکھتی ہے اور اسے ہرگز گوارا نہیں کہ غلط سوچ اور نادانی کی بناء انسان نے معاشرتی سطح پر جو ناروا پابندیاں یک طرفہ طور پر عائد کر رکھی ہیں انہیں جاری رکھا جائے۔ اس لئے اللہ رب العزت نے حج کے سفر پر نکلنے والوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنا زادِ راہ اور خورد و نوش کا سامان ساتھ لے کر نکلا کریں۔ پھر فرمایا کہ بہترین زاد راہ تو تمہارا تقویٰ ہے اور باقی دنیاوی سامان تو سب گزشتنی ورفتنی ہے۔

پھر اس پر مستزاد حج کے سفر پر نکلنے والوں کی سہولت اور آسانی کے لئے اللہ

رب العزت نے تجارت کو حلال قرار دیتے ہوئے اس کی اجازت مرحمت فرمادی جیسا کہ ارشاد ایزدی ہے:

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلاً مِّنۡ رَّبِّكُمۡ

(القرآن، البقرہ،۲: ۱۹۸)

''اورتم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں اگر تم (زمانہ حج میں تجارت کے ذریعے) اپنے رب کا فضل (بھی) تلاش کرو۔''

تجارت کو فضل ربی سے تعبیر کر کے اور اس کی خصوصی اجازت و رخصت عطا کر کے ان لوگوں کے لئے حج کا سفر آسان فرما دیا جو تمام حالات میں معاشی طور پر اپنے ہمراہ زاد سفر لے جانے کے متحمل نہیں۔ یہ اللہ رب العزت کا کتنا احسان ہے کہ اس نے ان لوگوں کو بھی حج کے مواقع عطا فرمادیئے جو اگرچہ معاشی طور پر خود کفیل نہیں لیکن دوران سفر محنت و مشقت اور مزدوری کے ذریعے مصارف حج پورا کرنے کی اہلیت و استعداد سے بہرہ ور ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل صراحت کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے اسلام نے دور جاہلت کے تمام فرسودہ رسم و رواج اور غلط و ناروا پابندیوں کو یک قلم موقوف کر دیا جو اہل عرب نے ایک طویل عرصہ سے حج کے ضمن میں عائد کر رکھی تھیں۔ اسلام زندگی کے ہر میدان میں عدل و مساوات کی روح کارفرما دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اپنے اس آزادانہ طرز عمل (Liberal Approach) سے اس نے حج کو بطور Institution کے سب معاشی ناہمواریوں اور اقتصادی رکاوٹوں(Economic Constraints) سے پاک کردیا جس کے نتیجے میں حج کے تمام تر عمل کو اس قدر سادہ اور آسان بنا دیا کہ معاشرے کے ہر طبقے کے لئے سماجی امتیازات سے قطع نظر مصارف حج کی فراہمی ممکن ہوگئی۔

حج اور دورِ جاہلیت کی طبقاتی تقسیم

جب مناسک وطرائق حج میں دین وسنت ابراہیمی کی روح مفقود ہوگئی تو زمانہ

جاہلیت کے عربوں میں قبائلی تفاخر، خود پسندی اور تکبر و رعونت کی بناء پر سرمایہ دارانہ سوچ اور ذہنیت کا پیدا ہوجانا فطری بات تھی جس نے ان کو دو طبقوں میں تقسیم کردیا۔ ایک طبقہ صاحب ثروت اور متمول افراد اور دوسرا غریب اور مفلوک الحال لوگوں کا تھا۔ اس طبقاتی نظام کی بنیاد پر حج کے معاملے میں ان کے درمیان یہ تفریق پیدا ہوگئی کہ ان کے سردار اور امراء حج کے لئے صرف مزدلفہ تک جاتے جبکہ غرباء اور نادار لوگوں کے لئے مزدلفہ سے آگے میدان عرفات تک جانا ضروری و لازمی سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے آ کر اس تفریق و امتیاز کو ختم کردیا اور حج کو صحیح معنوں میں اسلامی مساوات کا عملی نمونہ بنادیا۔ اب سنت ابراہیمی و اسماعیلی کے مطابق ہر ایک کے لئے لازم قرار دیا کہ وہ نو (۹) ذوالحج کو مقام منیٰ سے روانہ ہوکر میدان عرفات میں حاضری دے اور پھر اسی شام مزدلفہ پہنچ کر قیام کریں اور پھر منیٰ پہنچ کر قربانی دیں اس طرح حج کے ایام جنہیں ایام تشریق سے تعبیر کیا جاتا ہے، کی ترتیب جو قریش مکہ نے دور جاہلیت میں ختم کردی تھی کا احیاء ہوگیا اور نتیجتاً طبقاتی اونچ نیچ اور عدم مساوات کا نظام جو عربوں کے ہاں مدتوں سے رائج تھا اسلام کی تعلیمات عدل و مساوات کے باعث اپنی موت مرگیا۔

قبائلی فکر و مباہات کا خاتمہ

دور جاہلیت کے عربوں میں ایک قبیح رسم یہ بھی پائی جاتی تھی کہ وہ حج سے لوٹتے وقت منیٰ میں میلہ لگا لیتے جس میں رب تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کرنے کی بجائے وہ کھل کر قبائلی فخر و مباہات کا اظہار کرتے اور اپنے قبیلے کے آباء و اجداد کے کارنامے بیان کرتے ہوئے انتہائی مبالغے سے کام لیتے اور اپنے مد مقابل کی ہجو میں زور بیان صرف کرتے۔ اسلام کے ظہور کے بعد اس قبائلی مسابقت اور باہمی محاذ آرائی کی فضا ختم ہوگئی۔ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے موعظت آمیزہ پیرایۂ بیان میں اس قبائلی تفاخر و تعلّی کے اظہار پر قدغن عائد کردی۔ ارشاد ہوا:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۰۰)

’’اللہ کا خوب ذکر کیا کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کا (بڑے شوق سے) ذکر کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ شدت شوق سے (اللہ کا) ذکر کیا کرو۔‘‘

چنانچہ اسلامی تعلیمات نے حج کے ماحول میں میلے ٹھیلے کی فضا کو بدل کر تقدس اور سنجیدگی کا عنصر پیدا کر دیا۔ نتیجتاً لوگ اپنے باپ دادا کی بڑائی اور بزرگی اور دوسروں کی ہجو اور تنقیص کی بجائے خدائے ذوالجلال کی عظمت و کبریائی کے نغمے الاپنے لگے اور کمال خشوع و خضوع اور انہماک و محویت سے مشغول عبادت ہو گئے۔

حج سے فحاشی، عریانی اور باطل رسموں کے خاتمے کا اعلان

دور جاہلیت میں عرب طواف کعبہ کرتے وقت برہنہ ہو کر تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے جنہیں وہ بزعم خویش عبادت تصور کرتے۔ قرآن حکیم نے ان کے اس فعل قبیح کی یوں بیان فرمایا:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً

(القرآن، الانفال، ۸: ۳۵)

’’اور بیت اللہ (یعنی خانہ کعبہ) کے پاس ان کی (نام نہاد) نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے منشائے ایزدی کے مطابق حج کی ان تمام قبیح، بیہودہ، لغو اور بے سر و پا رسموں کا قلع قمع فرما دیا اور دورِ جاہلیت کے سب آثار اور نقش حرف غلط کی طرح مٹا دیئے۔

تاریخی تناظر میں حج کے پس منظر کا جائزہ لیں تو آج جو ہمیں حج کی صورت نظر آتی ہے وہ اس حج کی ارتقائی شکل نظر آتی ہے جو فتح مکہ کے ایک سال بعد ۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قیادت و سربراہی میں ادا کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ فتح مکہ ۸ھ میں عمل میں آئی تھی اور اس سال حج اسی قدیم طریقے پر ادا ہوا تھا جو زمانہ جاہلیت میں

طویل عرصہ سے رائج چلا آ رہا تھا۔

آئندہ سال نو ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر حج کے وفد کا امیر و سربراہ بنا کر جید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہمراہی میں مکہ مکرمہ بھیجا۔ یہ وفد عازم سفر ہو چکا تھا کہ سورۂ توبہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں تفصیل کے ساتھ حج کے احکام بیان کئے گئے ہیں اور دور جاہلیت کی ان باطل رسموں کو کالعدم قرار دیا گیا ہے جن سے حج کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی تھی چنانچہ حضور رسالت مآب ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کو اپنا نمائندہ خاص بنا کر ان آیات حج کو مجمع عام کے سامنے خطبے کی شکل میں تلاوت کرنے کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ فرمایا۔ پس حضرت علی حیدر کرار رضی اللہ عنہ آقائے دوجہاں ﷺ کا پیغام ہر خاص و عام تک پہنچانے کے اس تاریخی حج کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وفد کے ساتھ شامل ہوگئے اور حج کے اجتماع عام میں خطبۂ حج ارشاد فرمایا جس نے دور جاہلیت کی تمام باطل رسموں کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔ یہ بات تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے کہ ۹ھ کا حج دو طریقوں سے ادا کیا گیا۔ کفار اور مشرکین جو اس موقع پر موجود تھے انہوں نے قدیم آبائی طریقے سے حج کے رسوم ادا کئے جبکہ مسلمانوں نے خدا اور رسول اللہ ﷺ کی متعین کردہ حدود کے اندر رہ کر مناسک حج ادا کئے۔ تاہم اس تاریخی حج کے موقع پر ارشاد نبوی ﷺ کا اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ کسی کافر و مشرک کو حج کے لئے حرم پاک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ چنانچہ آئندہ حج سے قبل ہی سرزمین کعبہ ہمیشہ کے لئے مشرکوں کے وجود سے پاک ہوگئی اور اس طرح تمام قدیم باطل رسموں کا بھی مناسک حج سے کوئی تعلق نہ رہا۔

خطبہ حجۃ الوداع کی اہمیت و انفرادیت

اگلے سال حضور اکرم ﷺ بنفس نفیس اپنے جاں نثاروں کی معیت میں حج کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے ایک اجتماع عظیم کے سامنے وہ تاریخی خطاب فرمایا جسے 'خطبہ حجۃ الوداع' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مہم بالشان یادگار خطبے کو بجا طور پر

انسانی حقوق کی دستاویز (Human Rights Charter) کہا جا سکتا ہے۔ اس خطبے کا ایک ایک لفظ فصاحت و بلاعت اور اعجاز کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں فخر دوعالم رحمت مجسم ﷺ نے قبائلی تفاخر و عصبیت، سماجی اونچ نیچ کے باطل تصورات اور عرب و عجم کے جھوٹے امتیازات اور مادی شان و شوکت اور کروفر پر مبنی طبقاتی عدم مساوات کے غیر حقیقی نظریات کو پامال کر دیا اور حتمی طور پر اعلان فرما دیا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فوقیت و برتری حاصل نہیں اور اگر کسی میں کوئی فضیلت ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اس اعلامیے (Declaration) میں یہ بات کھول کر بڑی وضاحت سے بیان کر دی کہ ہر مسلمان کا خون، جان و مال اور عزت و آبرو اتنی ہی حرمت کے حامل ہیں جتنا کہ یہ شہر اور یہ دن سب کے لئے۔

یوں تو آنحضرت ﷺ کا یہ سارا خطبہ ہی آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے صرف دو ارشادات نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ کل شئی من امر الجاهلية تحت قدمی

(مسلم، الصحیح، ۲:۸۸۹، رقم: ۱۲۱۸)

(ابوداؤد، السنن، ۲:۱۸۵، رقم: ۱۹۰۵)

’’زمانہ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے قدموں کے نیچے روند دی گئیں۔‘‘

۲۔ المسلم علی المسلم

(بخاری، الصحیح، ۱:۴۱۸، رقم: ۱۱۸۳)

(مسلم، الصحیح، ۴:۱۷۰۴، رقم: ۲۱۶۲)

’’مسلمانوں کا مسلمان پر حق ہے۔‘‘

اس خطبے میں آنحضور ﷺ نے سود کے خاتمے کا انقلابی اعلان فرمایا اور اس کا آغاز اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے واجب الادا سود کی منسوخی کے ساتھ فرمایا۔ اس طرح گویا آپ ﷺ نے قیامت تک کے لئے اس بنیادی معاشی اقدام کو گھر سے شروع کر

کے ایک روشن و تابندہ مثال قائم کر دی۔ آپ ﷺ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ جس نے میرے چچا کو قرض لوٹانا ہو تو وہ صرف اصل زر ادا کرے اور اس کا تمام سود میں نے معاف کردیا ہے۔ حق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہمہ گیر انقلابی تعلیمات نے سیاسیات (Politics)، اخلاقیات (Ethics)، معاشیات (Economics) غرضیکہ زندگی کے ہر ہر شعبے اور ہر ہر گوشے پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے ہیں اور آج چودہ صدیوں کے گزر جانے کے بعد بھی آپ ﷺ کے فرامین سے عدل و مساوات کے ایسے ضوابط و قوانین مستنبط ہوتے ہیں جو انسانی حقوق کی مکمل ضمانت فراہم کرتے ہیں اور جن کی بنیاد پر باہمی جنگ و جدل نفرت اور استحصال سے پاک انسانی معاشرہ وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

تعلیمات مصطفوی ﷺ کا ایک بنیادی نکتہ جسے اجاگر کرنے کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے وہ انسان کے خون کی حرمت اور اس کی عزت و آبرو کا تحفظ ہے۔ امام ابن ماجہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ

عن عبداللہ بن عمرو قال رأیت رسول اللہ ﷺ یطوف بالکعبة و یقول ما أطیبک و أطیب ریحک ما أعظمک و أعظم حرمتک والذی نفس محمد بیده لحرمة المؤمن أعظم عنداللہ حرمة منک ما له و دمه و أن نظن به إلا خیراً

(ابن ماجہ، السنن، ۲:۱۲۹۷، رقم: ۳۹۳۲)

’’حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا آپ ﷺ کعبہ سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے تو کتنا پاکیزہ ہے اور تیری خوشبو کتنی پاکیزہ ہے تو کتنا عظیم ہے اور تیری حرمت کتنی عظیم ہے (لیکن) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے ایک مرد مومن کی عزت و حرمت اللہ کی نظر میں تجھ سے کہیں بڑھ کر ہے اور ہم اس کے بارے میں نیک گمان ہی رکھتے ہیں۔‘‘

صوفی شاعر مولانا رومؒ نے اسی نکتے کی وضاحت میں کیا خوب کہا ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

صد افسوس کہ آج ہم تعلیمات محمدی ﷺ کی روح سے یکسر بیگانہ ہو چکے ہیں۔ ہماری زندگی میں کتنا تضاد پایا جاتا ہے کہ ایک طرف ہم کعبہ کی طرف منہ کر کے تعظیم و احترام کے خیال سے تھوکتے بھی نہیں لیکن دوسری طرف ہم مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ آیئے ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر سوچیں کہ ہمارا طرزِ عمل منافقت کا آئینہ دار تو نہیں۔

جزو سوم

حج بیت اللہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مرکزی حیثیت کیوں؟

گزشتہ باب میں حج کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے ظہور اسلام سے قابل مناسک و رسوم حج کے نام پر جو غلط اور باطل رسمیں عرب کے جاہل معاشرے میں جڑ پکڑ چکی تھیں انہیں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ جب اسلام غالب اور باطل مغلوب ہوگیا تو ان رسموں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا اور سرزمین حرم کفر و شرک کی نجاست اور آلودگی سے پاک و صاف کردی گئی اور حج شعائر اللہ کی تعظیم سے عبارت ہو گیا۔

اب ہم حج کے مناسک و ارکان اور فرائض و سنن کی بجا آوری میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے اس کے تمام پہلوؤں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کریں گے۔

مسلمہ طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت تمام ادیان عالم میں بنیادی اور مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ ہم ان اسباب وعوامل کا بنظر غائر مطالعہ کریں گے جو مناسک حج کے باب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی کو مرکزی اور محوری حیثیت عطا کرتے ہیں۔

پہلا سبب

گزشتہ صفحات میں اس بات کا اجمالی تذکرہ ہو چکا ہے کہ موجودہ تاریخ جو کم و

بیش ساڑھے چار ہزار سال پرانی ہے، کا آغاز حضرت ابراہیم کے دور نبوت سے ہوتا ہے۔ اس سے قبل کا دور واقعات کا محفوظ ریکارڈ نہ ہونے کی بناء پر قبل از تاریخ دور کہلاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کے ادوار کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ کتب سماویہ اور صحائف الٰہیہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاہم یہ بات مدنظر رہے کہ قدیم واقعات کی معلومات کا ذریعہ (Source) انجیل اور توریت جو عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک مقدس آسمانی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں اور تحریف و اضافہ کے باعث واقعاتی اعتبار سے انتہائی مشکوک اور متنازعہ فیہ ہوچکی ہیں، ان میں اتنے تضادات ہیں کہ کسی واقعے کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں ان سے استفادہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ بنا بریں اب ہمارے پاس قدیم واقعات کے جانچنے کا ماخذ و ذریعہ قرآن پاک اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مبارکہ ہیں۔ چونکہ مؤرخین اور تاریخ دانوں کی نظر سے بعثتِ ابراہیمی علیہ السلام سے ماقبل ادوار کے واقعات اوجھل ہیں اور ان کی توجہ کا مرکز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کی تاریخ ہے اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موجودہ تاریخ عالم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت مسلمہ طور پر مرکزی و بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور اس سے پہلے کا دور تاریخی اعتبار سے پردۂ اخفاء میں ہے۔

دوسرا سبب

دوسرا اہم سبب جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مرکزی حیثیت بخشنے میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے وہ آپ کا جد انبیاء ہونے کی مسلمہ حقیقت ہے۔ تاریخ ادیان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک فرزند حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے جن سے حضرت یعقوب علیہ السلام متولد ہوئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ان کے بیٹے تھے جن کا قصہ قرآن حکیم میں خاص طور پر مذکور ہے۔ ان سے لے کر حضرت عیسیٰ تک تمام سلسلہ انبیاء کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا جس کے معنی 'اللہ کے بندے' کے آتے ہیں۔ اس بناء پر آپ کی نسل بنی اسرائیل کے نام سے موسوم ہوئی۔ بنی اسرائیل میں سے پے در پے بہت بڑی تعداد میں

انبیاء مبعوث ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند رشید حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے جن کی نسل سے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی اور فرد کو نبوت سے سرفراز نہیں کیا گیا۔

تیسرا سبب

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی منفرد حیثیت کا تیسرا بنیادی سبب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد امجد ہونے کا شرف و اعزاز ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑے فخریہ انداز سے ان کا ذکر ''اَبِی اِبْرَاهِیم'' کہہ کر فرمایا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت کو ابراہیمی دعاؤں اور بشارتوں کا حاصل قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم سے منسوب متعدد ایسی دعائیں مذکور ہیں جو آپ علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی معاونت سے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت مانگی تھیں۔ ان دعاؤں میں ایک دعا جس کے مستجاب ہونے میں کسے کلام ہوسکتا ہے قرآن مجید میں ان الفاظ سے درج ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ ايَاتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ

(القرآن، البقرہ،۲: ۱۲۹)

''اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے (وہ آخری اور برگزیدہ) رسول مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے (کہ دانائے راز بنا دے) اور ان (کے نفوس و قلوب) کو خوب پاک صاف کر دے۔''

جناب ابراہیم علیہ السلام ان دعاؤں میں بارگاہِ ایزدی میں التجا کرتے نظر آتے ہیں کہ بارِالٰہ: میری نسل میں سے ایسے افراد پیدا فرما جو تیری عبادت و اطاعت اور بندگی میں شب و روز محو و منہمک رہیں۔ اپنے ہونہار اور سعادت مند نوجوان بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدد و تعاون سے کعبۃ اللہ کی دیواریں تعمیر کرتے وقت یہ دعا ان کے لبوں

پر مچل پڑی کہ الٰہی میرے اس بیٹے کی پشت سے وہ نبی آخر الزماں مبعوث فرما جس کا وجودِ مسعود باعث تکوین کائنات ہو اور جس کے سر پر رحمۃ للعالمینی کا تاج ابد الاباد تک رکھا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کو درجہ تیقن حاصل تھا کہ وہ دعائیں جو تعمیر کعبہ کے وقت مانگی جارہی ہیں ان کی قبولیت لوح محفوظ پر لکھی جاچکی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ان دعاؤں کے نتیجے میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل میں بنی اسرائیل کے لاتعداد انبیائے کرام یکے بعد دیگرے اپنی اپنی قوم کو رشد و ہدایت کی راہ دکھانے کے لئے آئے حتیٰ کہ اس سلسلے کا اختتام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت پر آکر ہوگیا۔ لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے صرف نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا اور ان پر سلسلہ نبوت تا قیام قیامت منقطع ہوگیا۔ چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ دعائے خلیل کا نتیجہ قرار پائی اس نعمت عظمیٰ پر ہدیہ تشکر بجا لانے کے لئے وہ سب یادیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہیں انہیں ارکان و مناسک حج کی صورت میں متشکل کردیا گیا۔ اس طرح حج سراسر اس احسان عظیم پر اظہار تشکر سے عبارت ہے جو بارگاہِ رب العزت کی طرف سے ابراہیمی دعاؤں کی قبولیت کی صورت میں تمام نوع انسانی پر کیا گیا۔ مناسک حج گویا حضرت ابراہیم کی ذات سے وابستہ وہ یادگاریں ہیں جو خاک حرم میں نقش دوام کی صورت منقش ہیں ان کی تجدید حج کی ادائیگی کی شکل میں تمام عالم اسلام پر فرض قرار دے دی گئی اور تا قیامت یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

چوتھا سبب

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ شخصیت کا چوتھا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ آپ کو منصب نبوت کی تکمیل کی خاطر پے در پے آزمائشوں اور امتحانوں سے گزارا گیا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ منصب جس قدر عظیم ہوگا اتنی ہی بڑی آزمائش و ابتلا کے سلسلے سے اس شخصیت کو دوچار کیا جائے گا۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد امجد ہونے

کا بے عدیل و بے مثال شرف نصیب ہوا انہیں پیغمبرانہ بصیرت اور اہلیت و قیادت کا جوہر بھی بے مثال عطا ہوا۔ ان کی شخصیت کا مابہ الامتیاز پہلو یہ بھی کہ انہوں نے تن تنہا شرک و الحاد کی باطل قوتوں کو للکارا اور وہ اس بناء پر اس دوقومی نظریہ کے پہلے مؤید ونقیب ٹھہرے جو پانچ ہزار سال بعد تخلیق پاکستان کا بنیادی اور اساسی نقطہ قرار پایا۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آج سے چار ہزار سال قبل اپنی فقید المثال عزمیت اور مقصد کے عشق کی لگن سے باطل کے مقابلے میں حکومت الٰہیہ کی تشکیل کا علم اٹھایا اور الحادی طاقتوں کو خاطر میں نہ لاکر وہ نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ میں بلا خوف وخطر کود پڑے۔ بقول اقبالؒ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہی نظریہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی پیغمبرانہ جدوجہد کی اساس بنا جس پر آگے چل کر قصر اسلام کی عظیم الشان تعمیر عمل میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے صحرانشینوں نے عالم استعمار کے عزائم خاک میں ملا دیئے اور دنیا کے شرق و غرب میں پہلی مرتبہ حکومت الٰہیہ قائم ہوئی۔ مملکت خداداد پاکستان کی تشکیل و قیام بھی اسی دوقومی نظریہ کی مرہون منت ہے۔ برصغیر ہند کے مسلمان قائداعظم کی قیادت میں نظریۂ اسلام کا علم لے کر اٹھے اور دو قومی تصور کی بنیاد پر پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک زندۂ جاوید حقیقت کی صورت میں ابھرا۔

قرآن حکیم میں باری تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات کو تمام نوع انسانی کیلئے مکمل نمونہ قرار دیا۔ ارشاد ربانی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(القرآن، الاحزاب، ۳۳ : ۲۱)

''(مومنو!) بے شک تمہارے لئے رسول اللہ (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔''

یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن نے صرف دو شخصیات کا ذکر کیا ہے جو اپنے

سیرت و کردار کی بناء پر تمام بنی نوع انسان کیلئے کامل نمونہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان میں پہلی شخصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور دوسری جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ یہ دونوں عظیم ہستیاں آفتابِ رشد و ہدایت ہیں جن کی اسوۂ حسنہ سے روشنی لینے کیلئے تمام عالم شرق و غرب تا ابد محتاج رہے گا۔ بلا شبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دین حنیفی کے پہلے داعی ہیں اور اسی دین اسلام کی تکمیل کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم المرسلین بن کر بنی نوع انسان کو قیامت تک نور ہدایت سے فیضیاب کرنے کیلئے عالم بشریت میں جلوہ گر ہوئے تھے۔

بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بھی جملہ اہل ایمان کیلئے کامل نمونہ ہے۔ انہوں نے اس وقت توحید کا علم اٹھایا جب دنیائے کفر و شرک لسانی اور علاقائی محدود تصورات سے آگے کسی اور تصور کو قبول کرنے کیلئے آمادہ نہ تھی۔ انہوں نے خود ساختہ خداؤں کی بجائے خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت دی اور نظریۂ توحید کی بنیاد پر سب جھوٹی عصبیتوں کو ترک کرنے کا پیغام دیا۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں انہوں نے اپنی قوم کو یہ صدائے عام دی۔

قَالَ بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِىْ فَطَرَهُنَّ وَاَنَا عَلٰى ذَالِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ

(القرآن، الانبیاء، ۲۱ : ۵۶)

’’(ابراہیم نے) فرمایا بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان (سب) کو پیدا فرمایا اور میں اس (بات) پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔‘‘

نظریۂ توحید ہی اتحاد و اشتراک کی اساس ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل میں عالم کفر سے کسی قسم کی مصالحت کے تصور کو جگہ نہ دی اور سخت نا مساعد حالات کے باوجود وہ نظریۂ توحید کا علم اٹھائے رہے۔ انہوں نے بت پرست قوم سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ببانگ دہل اعلان کیا کہ ان

کیلئے عالم کفر کے ساتھ نظریۂ توحید کے علاوہ کسی اور نقطہ پر اتحاد و اشتراک ممکن نہیں ہے، کفر و ایمان کی راہیں جدا ہیں اور ان دونوں کے نظریہ ہائے حیات میں بعد المشرقین ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے طرزِ عمل سے یہ بات ثابت کر دکھائی کہ نظریۂ توحید پر ایمان سے جو قومیت جنم لیتی ہے اور وطنیت، علاقائیت اور رنگ و نسل کے تصورات سے ماوراء ہے۔ یہی اسلام ہے جس کا تقاضا ایک خدا اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لانا ہے۔

ہجرت مدینہ کا تصور اور دو قومی نظریہ

داعی اسلام نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اول تا آخر جدوجہد کی آئینہ دار تھی۔ اسلام کی راہ میں آپ ﷺ نے زہرہ گداز صعوبتیں اور تکلیفیں اٹھائیں لیکن انتہائی نامساعد حالات میں بھی مشرکین مکہ سے مفاہمت، رواداری اور مصالحت کی راہ اختیار نہ کی اور ان کے پائے استقلال میں کسی مقام پر کوئی لغزش نہ آئی۔ جب قوم کے ظلم وستم حد سے تجاوز کر گئے تو آپ ﷺ نے اپنے آبائی شہر مکہ کو چھوڑ کر اپنے جاں نثاروں کے ہمراہ مدینہ جانا گوارا کر لیا لیکن دعوت و تبلیغ حق میں عالم کفر سے کسی قسم کا سمجھوتا نہ کیا۔ مقصد کی خاطر عمر بھر کے نجی، ذاتی تجارتی اور ہمہ نوع تعلقات اور روابط جو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے نام لیواؤں کو آبائی شہر مکہ سے تھے، منقطع کر کے ہجرت قبول کرنے میں یہ بنیادی تصور کار فرما تھا کہ مکہ کے مشرکوں اور بت پرستوں کے ساتھ رشتہ داریاں، قرابت داریاں، دوستیاں اور دیرینہ باہمی قبائلی تعلقات اسلام کے مقابلے میں پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہجرت اور ترک وطن اس بات کی علامت تھا کہ اعلائے کلمۃ الحق کیلئے کونی، وطنی، نسبی اور نسلی عصبیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسلام ہر قسم کے محدود مفادات سے بالا تر ہو کر خدا و رسول کی حلقہ بگوشی کا نام ہے۔ ہجرت مدینہ گویا دو قومی نظریہ کا بنیادی پتھر تھا جو مسلم قومیت کی بنیاد پر سب کلمہ پڑھنے والوں کا جداگانہ تشخص متحقق کرتا ہے۔ اسلام میں داخل ہو کر ہر فرد رنگ و نسل اور قوم کے امتیازات سے بالا تر ہو کر ایک ہی ملت سے اپنا رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ بقول اقبال

نه افغانیم و نے ترك و تتاریم
چمن زاویم ازیک شاخسارم

سب نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتیں اسلام میں آ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ تمام مسلمان جو چاہے دنیا کے کسی خطہ زمین پر آباد ہوں ایک قوم کا درجہ رکھتے ہیں جس کی نشاندہی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کیا خوب کی ہے

بتانِ رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

مسلمانان عالم کو چاہیے کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو نوشتۂ دیوار پڑھ لیں اور اس حقیقت کا احساس اپنے قلب و باطن میں جاگزیں کر لیں کہ ان کی نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ آقائے نامدار ﷺ کی حلقہ بگوشی اور غیر مشروط اطاعت و محبت کی بنیاد پر اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اپنے مشترکہ دشمن کو پہچانیں اور اپنے سارے اختلافات دہلیز مصطفوی ﷺ پر گردن جھکا کر ختم کر دیں۔ جب تک ذات رسالت مآب ﷺ سے امت مسلمہ اپنا قلبی تعلق استوار نہ کرے گی اس وقت تک بدبختی، حرماں نصیبی اور انحطاط و زوال کے سائے اس کے سرے تک نہیں چھٹ سکتے۔ اس لیے لازم ہے کہ اسلامیان عالم گفتہ اقبال

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست

کو حرزِ جاں بنائیں اور اپنے داخلی انتشار و افتراق کو اتحاد و یکجہتی میں بدل دیں۔

مسلمانانِ پاکستان کیلئے لمحۂ فکریہ

عالمی سیاست کی بساط پر جو حالات تیزی سے رونما ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر پاکستان کے مسلمانوں کو بالعموم اور ارباب سیاست کو بالخصوص اس نازک صورتحال کا احساس ہونا چاہیے جس میں ہمارا وطن عزیز اس وقت گھرا ہوا ہے۔ آج بدقسمتی سے

علاقائیت اور صوبائیت پرستی کے زہر سے ہماری سیاسی فضا مسموم ہے اور اجتماعی قومی مفادات کے مقابلے میں صوبائی اور علاقائی مفادات کو ترجیح دینے کے رجحانات فروغ پذیر ہیں۔ اہم قومی معاملات میں ہماری سوچ ملی مفاد کو مقدم رکھنے کی بجائے پنجابی، سندھی، بلوچی اور سرحدی مفادات کے تابع مہمل ہو کر رہ گئی ہے۔ اہل وطن الاّ ماشاء اللہ اس حقیقت سے صرفِ نظر کیے ہوئے ہیں کہ صوبوں اور علاقوں کی بقاء وسلامتی پاکستان کی بقاء و استحکام کی مرہون منت ہے۔ اگر خدانخواستہ ہمارا دشمن ہمارے وطن عزیز کی مقدس سر زمین میں پنجے گاڑنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی گزند سے کون محفوظ رہ سکے گا؟

اس ضمن میں سقوط بغداد کی تاریخ ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ کس طرح مسلمانوں کے انتشار اور مذہبی تفرقہ بازیوں کے نتیجے میں بغداد جیسی عظیم الشان اسلامی سلطنت تاتاری سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ بدقسمتی سے ہمارے حالات اس وقت کے بغداد کے حالات سے زیادہ مختلف نہیں۔ فرقہ پرستی اور تفرقہ بازی اپنے عروج پر ہے اور معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونا ہمارا شعار بن چکا ہے۔ ہمارا مشترکہ دشمن سرحدوں پر دستک دے رہا ہے اور خدا نکردہ وہ اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے دست بُرد سے نہ کوئی سنی محفوظ رہے گا اور نہ کوئی شیعہ اور اہل حدیث بچ سکے گا۔

ان حالات میں یہ امر انتہائی ناگزیر ہے کہ ہم حالات کی نزاکت کے پیش نظر دشمن کے عزائم کو خاک میں ملانے کیلئے متحد و متفق ہو جائیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے دشمن کو پہچانیں جو کبھی اشتراکیت کے روپ میں ہماری طرف دوستی کا ہاتھ برھاتا ہے اور کبھی مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے لبادہ میں سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی اور اشتراکی طاقتیں اپنے عالمی مفادات و مقاصد کے حصول کیلئے مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی راہ میں رخنہ اندازی کر رہی ہیں۔ وہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا جال پھیلا کر مسلمان ملکوں کو داخلی طور پر کمزور اور اپنا دست نگر بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔ مسلمانان پاکستان کا اولین فریضہ ہے کہ وہ نظریۂ پاکستان

کے تحفظ کو اپنا جز و ایمان بنائیں۔ پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام کے سوا کچھ نہیں اور اسی کے نام پر یہ مملکت خداداد معرض وجود میں آئی تھی۔ ہمارے بداندیش اس بات کے درپے ہیں کہ ہماری نظریاتی بنیادوں کو کمزور کر کے اس کے اسلامی تشخص کو ختم کر دیا جائے۔ اس وقت اسی سیاسی بصیرت اور تدبر کی ضرورت ہے جس کو بروئے کار لا کر قائداعظم نے ہندو اور انگریز کی مشترکہ چالوں اور سازشوں کو ناکام بنا دیا تھا جو وہ قیام پاکستان کو روکنے کیلئے کر رہے تھے۔

نظریۂ جہاد اور اسلام

اسلام کی اشاعت اور پیش رفت میں جہاد کا تصور انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ رب العزت نے جہاد کے ضمن میں فرمایا:

وَجَاهِدُوا فِی اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبٰكُمْ

(القرآن، الحج، ۲۲:۷۸)

''اور اللہ (کی محبت و طاعت اور اس کے دین کی اشاعت و اقامت) میں جہاد کرو جیسا کہ اس کے جہاد کا حق ہے اس نے تمہیں منتخب فرما لیا ہے۔''

تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(القرآن، الصّف، ۶۱:۱۱)

''تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔ (بہت معمولی سی چیز دے کر آخرت کی ابدی راحتیں خرید رہے ہو اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو گی)۔''

مسلمان کی پوری زندگی جہاد سے عبارت ہے۔ جہاد کو ترک کر دینے سے

بزدلی، بے غیرتی اور بے حمیتی اس کا مقدر بن جاتی ہے جس کا نتیجہ سوائے ذلت و رسوائی کے اور کچھ نہیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے جہاد کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا اور یہ جہاد صرف میدان جنگ ہی نہیں بلکہ اس کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ جہاد کی راہ سے انحراف کر کے آج مسلمان دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے کہ مسلمانان عالم آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی پر عمل پیرا ہو کر نسبت ابراہیمی علیہ السلام کو اپنا سرمایہ افتخار جانیں اور چھوٹی چھوٹی سب نسبتوں کو نسبت مصطفوی ﷺ میں مدغم کر دیں اور دین اسلام کے عالمگیر حصار میں داخل ہو جائیں۔ جب تک مسلمان سب باطل نظریات کو رد کر کے آنحضور ﷺ کو اپنا راہبر اعظم اور ہادیٔ برحق نہیں تسلیم کریں گے ان کیلئے عافیت اور سلامتی کی راہیں مسدود رہیں گی۔

سرور دوعالم ﷺ کی دس سالہ مدنی زندگی کی تاریخ کے مطالعے سے ہم پر یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ یہ دور مسلسل جدوجہد اور سعی پیہم سے عبارت تھا۔ مجموعی طور پر یہ دور دس غزوات اور پچاس کے لگ بھگ سرایا پر محیط ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ محض دعوت و تبلیغ ہی نہیں بلکہ شمشیر و سناں کا بھی اس کی توسیع و اشاعت میں خاصا عمل دخل رہا ہے۔ اسی طرح خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور میں ایران اور روم سے جن کی حیثیت اس وقت وہی تھی جو آج امریکہ او رروس کی ہے عساکر اسلام پیہم برسرپیکار رہے اور بالآخر یہ دونوں زبردست سلطنتیں مغلوب ہو کر اسلامی حکومت کے زیرنگیں آ گئیں۔

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام جہاد کے لئے تلوار اٹھانے کی اس وقت اجازت دیتا ہے جب فتنہ و فساد اور ظلم و جبر کو مٹانے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے۔ اسلام میں ہوس ملک گیری اور جوع الارض (Territorial Aggrandisement) کا کوئی تصور نہیں۔ وہ صرف اپنے دفاع اور مظلوموں کو ظالموں کی زیادتیوں سے بچانے کے لئے شمشیر بے نیام کرنے کا قائل ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خير أمتي القرن الذين يلوني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم۔
(مسلم، الصحیح، ۴: ۱۹۶۲، رقم: ۲۵۳۳)

’’میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو اس زمانہ میں ہیں جو میرے قریب ہے، پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے قریب ہیں (یعنی صحابہ کے بعد آنے والے تابعین)، پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے قریب ہیں (یعنی تابعین کے بعد آنے والے تبع تابعین)۔‘‘

آپ ﷺ کے اس ارشاد مبارکہ کو تاریخ اسلام کے تناظر میں دیکھیں تو یہ حقیقت اظہر من الشّمس نظر آتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین و تبع تابعین عظام رضی اللہ عنہم کا دور جو کم و بیش ایک صدی پر محیط اسلامی شان و شوکت کے عروج کا دور تھا۔ اگرچہ من حیث المجموع مسلمانوں کے پاس مادی ساز و سامان اور جنگی اسلحہ کی فراوانی نہ تھی تاہم جذبۂ ایمانی اور شہادت و قربانی کے عدیم المثال جوش اور ولولے سے سرشار ہو کر انہوں نے ہر میدان میں وہ کارہائے نمایاں سر انجام دیئے کہ ان کے نقش آج بھی تاریخ عالم میں جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔

جزو چہارم

مناسک حج کی حقیقت

گزشتہ باب میں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کی مرکزی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی۔ ان میں ایک بنیادی پہلو ان کا انبیاء کرام کے ایک سلسلے کا جد امجد ہونے سے متعلق تھا۔ اب ہماری گفتگو کا موضوع حج کے حوالے سے ان تمام مناسک و ارکان سے ہے جن کی بتمام و کمال ادائیگی سے فریضۂ حج کی تکمیل ہوتی ہے۔

شعائر اللہ کیا ہیں؟

حج کے تمام ارکان و مناسک کا تعلق شعائر اللہ سے ہے۔ لغوی اعتبار سے عربی میں شعائر شعار کی جمع ہے جو نشانی یا علامت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں اس سے ملتی جلتی ہم معنی اصطلاح 'آیت' (جس کی جمع آیات ہے) بھی مستعمل ہے لیکن شریعت مطہرہ میں ایسے تمام ارکان جو خواہ عبادات میں سے ہوں یا اوامر و نواہی سے متعلق ہوں اور جن پر عمل کرنے سے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ تشکیل پائے 'شعار' کے ذیل میں آتے ہیں۔ چونکہ ان سب کا تعلق تلمیحی اور تاریخی اعتبار سے بعض مخصوص شخصیات و واقعات سے ہوتا ہے جن کی نسبت براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اس لیے ایسی سب علامات کو شعائر اللہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان میں وہ تمام نسبتیں شامل ہوجاتی ہیں جو اللہ کے برگزیدہ انبیاء و صلحاء سے منسوب ہیں جن کا ذاتِ خداوندی سے تعلق انتہائی قرب پر مبنی ہوتا ہے۔

شعائر اللہ کے مذکورہ معنی مراد لیے جائیں تو وہ تمام متعلقات جنہیں ذات باری

تعالیٰ اپنے کسی برگزیدہ بندے کے خاص افعال و اسباب کی بنا پر محبوب بنا لیتی ہے اور اس کی ہر ہر ادا محبوبیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ شعائر اللہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ پھر اس مقام پر پہنچ کر ان کی تعظیم و تکریم کو درج ذیل ارشاد قرآنی کے مطابق رہتی دنیا تک عبادت کا جزو بنا دیا جاتا ہے۔

ذَالِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ

(القرآن، الحج، ۲۲:۳۲)

''یہی (حکم) ہے اور جو شخص اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ (تعظیم) دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔''

اس آیۂ مبارکہ کی رو سے اللہ کی نشانیوں کی تعظیم و تقدیس کو ملحوظ رکھنے والے افراد کے دل تقویٰ سے آشنا ہوتے ہیں۔ کتنی بڑی بات ہے کہ عبادت کا یہ ارفع و اعلیٰ مقام جو دلوں کی عفت اور پرہیزگاری کا موجب بنتا ہے بندے کو محض شعائر اللہ کے تعظیم و احترام سے نصیب ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوا کہ اللہ رب العزت کو اپنے محبوب بندوں کی ادائیں بھی کتنی محبوب ہیں۔

شعائر اللہ اور تقاضائے عشق

جیسا کہ اجمالاً ذکر کیا گیا ہے کہ تمام ارکان و مناسک شعائر اللہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان کی تعظیم کے عمومی حکم کی عقلی توجیہہ ممکن نہیں ہے کہ مجرد عقل ان کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ یہ عشق و محبت کے معاملے ہیں جنہیں عقل و خرد کے معیار پر پرکھا نہیں جا سکتا۔ عقل تو ہر چیز کے مادی اور منفعی پہلوؤں پر نظر رکھتی ہے اور چیزوں کے ظاہری احوال و لوازمات کا تجزیہ اور محاکمہ کر کے فیصلہ صادر کرتی ہے کہ فلاں چیز تعظیم کیے جانے کے اہل ہے یا نہیں اور اگر کوئی چیز اس کے معیار پر پوری نہ اترے تو وہ اسے سرے سے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھتی۔ اس کے برعکس مسلک عشق و محبت مادی و نظری توجیہات سے بالاتر ہو کر نسبت و تعلق کو وجہ تعظیم و تکریم گردانتا ہے اور اس میں سود و زیاں

کا کوئی تصور کارفرما نہیں ہوتا اور عقل و منطق پر مبنی کوئی فیصلہ حقیقت نہیں رکھتا لہٰذا یہ کہنا بے محل اور خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ شعائر اللہ کی تعظیم کا فلسفہ تقاضا ہائے عشق کی تکمیل میں بلا چون و چراں احکام الٰہیہ کی تعمیل کا حکم دیتا ہے اور اس میں مادی توجیہات کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ اس کا تصور تمام تر مشیت ایزدی کے تحت عشق و مستی اور وارفتگی و شیفتگی کے گرد گھومتا ہے۔

حج کے بارے میں قرآنی ارشادات

اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں احکام حج کے باب میں ارشاد فرمایا

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ

(القرآن، الحج، ۲۲: ۶۷)

”ہم نے ہر ایک امت کے لئے (احکام شریعت یا عبادت وقربانی کی) ایک راہ مقرر کر دی ہے انہیں اسی پر چلنا ہے سو یہ لوگ آپ سے ہرگز (اللہ کے) حکم میں جھگڑا نہ کریں۔“

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

(القرآن، البقرہ، ۲: ۱۷۹)

”اور تمہارے لئے قصاص (یعنی خون کا بدلہ لینے) میں ہی زندگی (کی ضمانت) ہے اے عقلمند لوگو! تاکہ تم (خونریزی اور بربادی سے) بچو۔“

آیت نمبر ۲ میں قصاص کا لفظ اپنے مخصوص اصلاحی معنوں میں خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں اس کا مفہوم میں پوشیدہ وسعت وعمومیت زندگی کے عوض زندگی کا نذرانہ پیش کرنے پر دلالت کر رہی ہے قرآن بڑے بلیغ اور حکمت آموز انداز میں یہ فلسفہ سمجھا رہا ہے کہ جان سے گزر جانے اور موت سے کھیل جانے میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے اگرچہ زندگی کی بقا کے لئے ناگزیر اس فلسفہ قربانی کی کوئی عقلی توجیہ ممکن

نہیں تاہم مفتی عشق کا فتویٰ اس کے حق میں ہے۔ بقول اقبالؒ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

عشق کے نتائج سے بے پروا ہوکر عالم خود سپردگی میں محبوب کے ایک اشارہ ابرو پر اپنا ارمغانِ جان پیش کرتے ہوئے بے دھڑکن بھڑکتی آگ میں کود جاتا ہے اور وہ عقل کی طرح مادی سودوزیاں کے جھمیلوں میں نہیں پڑتا کہ اسے محبوب کی ذات کی رضا بہرحال مقدم ہوتی ہے اور اس کے نزدیک وہ نسبت جو اسے محبوب کی ذات سے ہے جان سے کہیں عزیز تر ہے جب کہ اس کے برعکس مادی منفعت ومصلحت اور سودوزیاں کی بھول بھلیوں میں کھوئی رہتی ہے اور تجزیہ احوال میں اس کے تمام فیصلے مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ عقل و عشق کے نقطہ نظر اور دونوں کی سوچ کے انداز یکسر جدا اور مختلف ہیں۔ وہ جدا جدا زاویوں سے چیزوں کے حقائق ونتائج کو پرکھتے اور جانچتے ہیں۔

اس بناء پر اسلام میں داخل ہوکر ایمان کا تقاضا عملی ونظری توجیہات وتوضیحات کو بالائے طاق رکھ کر چیزوں کو بن دیکھے مان لینے کا ہے۔ ایمان بالغیب کے اسی مفہوم کو قرآن حکیم میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے:

هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ○ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ○

(القرآن، البقرۃ،۲:۲،۳)

”(یہ) پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔“

اس آیہ کریمہ میں بڑی صراحت سے بیان ہوا ہے کہ ہدایت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو تقویٰ و پرہیز گاری اور بن دیکھے ایمان لانے کے اوصاف کے حامل ہیں گویا ہدایت کی منزل تک رسائی عقل کی راہ سے نہاں بلکہ عشق و وارفتگی کی سمجھائی ہوئی جان سپاری اور خود سپردگی کی راہ سے نصیب ہوتی ہے۔ یہی فلسفہ قربانی کا ماحاصل ہے جو بندہ مومن کو ہمہ وقت رضائے الٰہی کے حصول کے لیے جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کرتا ہے۔

قرآن حکیم کا یہ ارشاد کہ اس نے ہر ملت و قوم کی زندگی و بقا کے لئے قربانی کی شرط رکھی ہے اسی حقیقت کی نشان دہی کر رہا ہے۔ حیات ابدی کی منزل موت کی شاہراہ سے گزر کر حاصل ہوتی ہے عقل اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے اور موت کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے جبکہ عشق کے قدم دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور وہ محبوب کی رضا کے لئے آگ میں کود جانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ ﷺ

آج کے دورِ پرفتن میں جبکہ طاغوتی طاقتیں امتِ مسلمہ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں نجات و عافیت کی راہ صرف یہی ہے کہ افرادِ ملت کے قلوب میں عشقِ مصطفوی ﷺ کی شمع پھر سے فروزاں کی جائے حلقہ بگوشان اسلام کے دل میں یہ احساس سوزِ یقین کے ساتھ جاگزیں کردیا جائے کہ جب بھی خدا و رسول ﷺ کی اطاعت کی بات ہو تو اس کے آگے عقل و خرد کے فیصلے قربان کردیئے جائیں اور بلا چون و چراں گردن دہلیز مصطفوی ﷺ پر خم کردی جائے۔ ضرورت پڑنے پر حرمتِ رسول ﷺ کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ یہ جذبہ اور موت کی آنکھ میں دیوانہ وار آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوگا جب تک اختیار کی باگ مصلحت بیں عقل کے ہاتھ سے چھین کر انجام و عواقب سے بے نیاز عشق و آرزو کے ہاتھ میں دے دی جائے جو یوں سراپا سوال ہوتا نظر آتا ہے۔

خرد کی گھتیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

حج میں فرزندان توحید کا عظیم اجتماع اسی فلسفہ قربانی کی یاد دلاتا ہے جس کی طرح اللہ کے دو برگزیدہ بندوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے آج سے صدیوں پہلے ڈالی تھی۔ مشرق و مغرب میں پھیلی ہوئی امت مسلمہ کو ایک مرکز پر جمع کرکے وہ اس بات کا سبق ازبر کرانا چاہتا ہے کہ دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنانے کے

لئے ملتِ بیضا کو اسی ایثار و قربانی اور وفا کیشی کے جذبے سے سرشار ہوکر یک قالب و یک جان ہوجانا چاہیے۔ اگر کاروانِ انسانیت کو امن و سلامتی کی منزل سے ہمکنار کرنا ہے تو امت مسلمہ کو اپنے داخلی اختلافات و امتیازات سے بالا تر ہوکر میدانِ عمل میں صدائے ابراہیمی علیہ السلام پر لبیک کہتے ہوئے نکلنا ہوگا تا کہ اس ہمہ گیر تباہی و بربادی کو ٹالا جاسکے جو امنِ عالم سے کھیلنے والی تخریبی قوتوں کے ہاتھوں سرزد ہونے والی ہے۔ حرم کعبہ بلا شبہ امن وآشتی کا پیامبر و نقیب ہے۔

مناسک حج اور ان کی حقیقت

ہمارے ذہنوں میں عبادت کا جو تصور ہے حج اس سے یکسر مختلف ہے دوسری عبادات مخصوص تسبیحات، نوافل اور وظائف و اوراد پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن جب ہم حج کے لئے حرم کعبہ میں داخل ہوتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ یہ تو عبادت کے مروجہ روائتی تصور اور ضابطہ عمل سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا داخلِ حرم ہونے سے قبل حاجی اپنا روز مرہ کا لباس اتار کر دو کھلی ان سلی چادریں اوڑھ لیتا ہے اور دیوانہ وار ایک عمارت کے گرد چکر لگانے لگتا ہے اس کے بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں لیکن انہیں ترشوانے کی اجازت نہیں۔ وہ اپنے گرد وپیش سے بے نیاز اور دوسروں کے مال سے بیگانہ ربِ کعبہ کی یاد میں مگن رہتا ہے۔

۹ ذی الحج آتا ہے تو وہ بے اختیار بعجلت تمام میدان عرفات کی طرف افتاں و خیزاں دوڑنے لگتا ہے مٹھی میں کنکریاں پکڑے ہوئے وہ ایک گوشے میں پتھر کے ایک ایستادہ ستونوں کو شیطان سمجھ کر مارتا ہے۔ عرفات میں پہنچتا ہے تو ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرتا ہے۔ مزدلفہ میں نمازِ مغرب کا ہنگام آپہنچتا ہے تو نماز نہیں پڑھتا بلکہ عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے صفا اور مروہ دو پہاڑیوں کے درمیان تیز تیز دوڑتا ہے۔

ننگے سر کعبہ میں داخل ہونا اس حال میں کہ بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں اور بحالت طواف دیوانہ وار چکر لگاتے جانا یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ جن کی کوئی توجیہ عقل

کے بس میں نہیں یہ سارے معاملات تو عشق وجنون اور وارفتگی و شفتگی کے آئینہ دار ہیں عقل پوچھتی ہے کہ ان سب معمولات کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟

لیکن اس کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ملتا لیکن جب یہی سوال عشق سے پوچھے جاتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ حج کے ہر عمل کے پیچھے محبت کی کوئی نہ کوئی ادا چھپی ہوئی ہے جو مرورِ ایام میں زمان ومکاں کے کسی نقطہ پر بارگاہِ ایزدی کو اتنی پسند آ گئی کہ اب اس کا مداومت کے ساتھ جاری وساری رکھنا عبادت کا درجہ اختیار کر گیا۔ باری تعالیٰ کو اپنے محبوب بندوں کی نسبتیں اتنی عزیز ہیں کہ انہی کے رنگ ڈھنگ اور انداز و اطوار کو اپنا لینا عین عبادت قرار پایا۔ حج انہی افعال و اعمال سے عبارت ہے جو مقبولانِ الٰہی کی کسی نہ کسی یاد سے وابستہ ہیں۔

مناسک حج کا یہ فلسفہ وحقیقت قرآن حکیم کی اس آیہ کریمہ کےبطن سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِاللّٰهِ فَمَنْ حَجَ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَوَّفَ بِهِمَا

(القرآن، البقرة،۲: ۱۵۸)

’’بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں چنانچہ جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے (درمیان) چکر لگائے۔‘‘

شہر مکہ کی عظمت کا سبب

بادی النظر میں روئے زمین پر آبد خشت وسنگ سے بنے ہوئے دوسرے شہروں کی طرح مکہ کی حیثیت بھی ایک شہر کی ہے اسے سرکارِ دوجہاں ﷺ کی جائے ولادت اور مولد ہونے کی وجہ سے دنیا کے دوسرے شہروں پر فضیلت حاصل ہوگئی۔ اسی بے مثال نسبت کی بناء پر رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا:

لَا أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ○ وَ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ

(القرآن، البلد، ۹۰: ۱،۲)

''میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں (اے حبیب مکرم) اس لئے کہ آپ اس شہر میں تشریف فرما ہیں۔''

ارشاد ربانی کا مفہوم یہ ہے کہ اس شہر بے مثال کی قسم اس لئے نہیں کھاتا کہ اس میں میرا گھر بیت اللہ موجود ہے۔ بلکہ یہ اس لئے لائقِ قسم ہو گیا کہ اس کے گلی کوچوں اور خاک کے ذروں کو تیرے مقدس قدموں نے چھوا ہے جس کی وجہ سے یہ شہر رشکِ مہ وانجم بن گیا ہے۔

لَا اُقْسِمُ کے الفاظ ذو معنی ہیں اگر لَا کا کلمہ نافیہ مان لیا جائے تو عربی لغت کے قاعدے سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس شہر کی قسم نہ کھاؤں جب کہ اسے محبوب تو اس میں مقیم ہے اور اس کے گلی کوچوں کو تیرے پاک قدموں کی نسبت ہے۔ اس کی عظمت و برکت تو ہے ہی قسم کھانے کے قابل۔

لَااُقْسِمُ کا دوسرا مفہوم یوں ہوگا کہ میں اس شہر کی قسم نہیں کھاتا اور مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس کی قسم کھاؤں کہ یہ شہر اپنی عظمت و بزرگی کے اعتبار سے فی نفسہ کوئی جائے قسم نہیں؟ مگر صرف اس لئے قسم کھائی جارہی ہے کہ اسے تیرے جائے ولادت کا شرف حاصل ہوگیا اور تنہا یہ نسبت میری نظر میں اتنی بڑی ہے کہ باقی سب نسبتیں اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

آنحضور ﷺ نے اپنے زمانے کے سب زمانوں سے بہترین قرار دیا اور پھر اس کے بعد اس زمانے کو جو اس سے متصل ہے جس طرح مکان کو فضیلت اس کے مکین سے ملتی ہے اس طرح زمانی اعتبار سے سے وہ ساعتیں جنہیں حضور ﷺ کا قرب نصیب ہوگیا سب زمانوں پر شرف وفضیلت کی حقدار وسزا وار ٹھہریں اسی نسبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہ شرف صحابیت عطا ہوگیا کہ بعد کے زمانوں میں آنے والے اس کے گرد کو بھی نہیں پہنچ

سکتے۔

خوش تر آں شہرے کہ آنجا دلبر است

وہ مقدس خطہ زمین جس کو مکانی اعتبار سے رحمتِ مجسم فخرِ دوعالم ﷺ کی ذات گرامی سے مادی اور حسی نسبت ہوگئی اس کی قدر ومنزلت اور شرف وفضیلت کا کون ہمسر ہوسکتا ہے؟ وہ شہر جو حضور ﷺ کے ورِدِ مسعود سے پہلے یثرب کے نام سے موسوم تھا آپ کی تشریف آوری کے بعد مدینۃ النبی کے نام سے شہرتِ دوام پا گیا۔ اس شہر جان نواز کی فضیلت میں کسے کلام ہوسکتا ہے کہ خود آقائے دوجہاں ﷺ نے اس کے شرف و افضلیت کے باب میں ارشاد فرمایا کہ جس بدبخت اور شقی نے میرے مدینے کو لوگوں کو تکلیف اور آزار پہنچایا خدا کی ذات اپنی شان قہاری سے اسے اس طرح ختم کردے گی جیسے پانی میں نمک حل ہوکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں حدیثِ مبارکہ کے الفاظ اس طرح ہیں:

عن سعد قال قال سمعت النبی ﷺ یقول: لا یکید أهل المدینة أحد الا انماع كما ینماع الملح فی الماء

(بخاری، الصحیح، ۲:۶۶۴، کتاب ابواب فضائل المدینۃ، باب إثم من کاد اهل المدینۃ، رقم: ۱۷۷۸)
(منذری، الترغیب والترهیب، ۲:۱۵۱، رقم: ۱۸۸۷)

”حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور نبی اکرم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا مدینہ طیبہ کے لوگوں کے ساتھ دھوکہ وفریب کرنے والا یوں ختم ہوجائے گا جیسے نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے۔“

شہر مدینہ کو آنحضور ﷺ نے حرم قرار دے دیا۔ اس کی عزت وحرمت کا سبب بلاشبہ وہ نسبت عظمیٰ ہے جو اسے آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات سے ہے۔ اس میں اس کی ذاتی فضیلت اور کسی کمال کا کوئی دخل نہیں۔ آنحضور ﷺ نے اہل مدینہ سے محبت کو جزو ایمان قرار دیا ہے جس کا سبب نسبت مصطفوی ﷺ ہے جس پر باقی سب نسبتیں قربان

کی جا سکتی ہیں۔

قرآن حکیم میں بیت المقدس کا ذکر مبارک

بیت المقدس کی سرزمین بھی حرم مرتبت ہے اس کی عظمت و حرمت اور تقدس کا سبب وہ انبیاء کرام اور نفوسِ قدسیہ ہیں جو اس کی خاک میں آسودہ خواب ہیں ان کے دم قدم سے اسے وہ نسبت عطا ہوگئی کہ ابدالاباد تک اس کا نقش لوحِ مکاں پر ثبتِ دوام کا درجہ حاصل کر گیا۔

قرآن حکیم میں بیت المقدس کے تقدس اور عظمت و برکت کے ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔

بَارَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا

(القرآن، بنی اسرائیل، ۱:۱۷)

''جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے تا کہ ہم اس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔''

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ

(القرآن، المائدہ، ۲۱:۵)

''اے میری قوم! (ملک شام یا بیت المقدس کی) اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔''

نسبت خواہ زمانی ہو یا مکانی عشق و محبت کا تقاضا ہے کہ اس کے ذکر کا چرچا انجمن در انجمن ہوتا رہے۔

گاهے گاهے بازخواں ایں قصه پارینه را

فرائض نمازِ پنجگانہ سے انبیاء کی نسبت

خدائے بزرگ وبرتر کی یہ عادت مبارکہ رہی ہے کہ اپنے برگزیدہ اور مقبول بندوں کے وہ اعمال اور واردات و کیفیات جو اس کی بارگاہ میں سندِ قبولیت سے شرفیاب ہوئیں انہیں اس لئے شاملِ عبادت کر لیا کہ اس کی یاد ابدلاباد تک دہرائی جاتی رہے، چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ فجر

حضرت آدم علیہ السلام نے قبول توبہ پر جب شکرانے کے طور پر دوگانہ نفل ادا کئے اس وقت فجر کا ہنگامہ تھا۔ باری تعالیٰ کو ان کی ادا اتنی پسند آئی کہ دوگانہ فرض نمازِ فجر کی بنیاد بنا دیئے گئے۔

۲۔ ظہر

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب فدیہ عظیم کے قبولیت پانے پر شکرانے کے چار نفل ادا کئے اس وقت ظہر کا وقت تھا۔ باری تعالیٰ نے ان کے اس شکرانے پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور انہیں امتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نماز ظہر کے چار فرض قرار دے دیا۔

۳۔ عصر

حضرت عزیر علیہ السلام پر سو سال تک موت طاری رہی جب انہیں دوبارہ حیاتِ نو نصیب ہوئی تو انہوں نے چار نفل بطور شکریہ ادا کئے چونکہ اس وقت عصر کا وقت تھا رب العزت نے ان چار رکعتوں کو نمازِ عصر کے فرض قرار دیا۔

۴۔ مغرب

حضرت ایوب علیہ السلام کو طویل علالت کے بعد صحت یابی نصیب ہوئی تو وہ چار نوافل ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ تین رکعت ادا کر چکے اور چوتھی رکعت کے لئے

اٹھنا چاہا لیکن نقاہت کی وجہ سے کھڑے نہ ہو سکے لہٰذا انہوں نے تین رکعت پر اکتفا کر لیا چونکہ یہ وقت مغرب کا تھا باری تعالیٰ نے ان کی تین رکعتوں کو شرف پذیرائی بخشتے ہوئے انہیں نمازِ مغرب کے فرض بنا دیا۔

۵۔ عشاء

عشاء کے چار فرائض کی نسبت آنحضور ﷺ سے ہے جب آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ نماز ادا کی تو عشاء کا وقت تھا چنانچہ وہ نمازِ عشاء کی بنیاد ٹھہری۔

مقبولانِ الٰہی کے اضطراری افعال مناسک حج کی بنیاد بنے

بعض اوقات اللہ کے کسی برگزیدہ اور مقبول بندے سے اضطراری طور پر ایسے افعال کا صدور ہوجاتا ہے جن کا بظاہر عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن ان کا وہ عمل بارگاہِ ایزدی میں اس قدر پسندیدہ ہوتا ہے کہ اگرچہ بظاہر اس سے عبادت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تاہم اسے اجتماعی عبادت کا جزو بنا دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا پانی کی تلاش میں دیوانہ وار صفا اورمروہ دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑنا تھا جسے وقوع پذیر ہوئے صدیاں بیت گئیں لیکن باری تعالیٰ کو اپنی اس پیاری بندی کی وہ ادا اتنی پسند آئی کہ اسے عالمگیر اجتماعی سطح پر مناسک حج کا حصہ بنا دیا۔

جہاں تک حج کے بنیادی مناسک وارکان کا تعلق ہے میدانِ عرفات میں حاضر ہوجانے کا نام ہی حج ہے یعنی بغیر کسی نفلی عبادت اور خطبہ حج کے محض میدانِ عرفات میں حاضری ہی فرضیت کی ادائیگی کے اعتبار سے حج کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب اعمال واجبات، سنن اور مستحبات کے درجے میں آتے ہیں۔

عرفات کا لغوی معنی پہچاننے کا ہے اور یہ اس یادگار ملاقات کی علامت ہے جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کے درمیان جنت کے نکالے جانے اور طویل عرصہ کی جدائی کے بعد اس میدان میں ہوئی جس میں انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان

لیا۔ باری تعالیٰ نے اپنے ان دو مقبول بندوں کے اس ملاپ کی اس یاد کو تاابد زندہ جاوید رکھنے کے لئے ہر سال نو ذی الحج کے لئے آنے والے نفوس کی اس میدان میں حاضری کو مناسک حج کی بنیاد قرار دے دیا۔

ذبح عظیم کی یاد

مقامِ منیٰ پر فرزندانِ توحید کے عظیم اجتماع کی قربانی اس منظر کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہے کہ جب منشائے ایزدی کی تعمیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کی رضا کے لئے قربان کردینے کیلئے اس میدان میں لے آئے تھے اور باپ بیٹے کے درمیان مکمل مفاہمت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حلقومِ پسر پر چھری چلا دی تھی۔ یہ عظیم قربانی جسے ذبح عظیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بارگاہ خداوندی میں شرفِ قبولیت سے نوازی گئی اور فدیے کے طور پر دنبے کو قربان کردیا گیا۔ اس یادگار واقعے کو دوام بخشنے کے لئے حجاج کو حکم دیا گیا کہ وہ دس ذی الحجہ کو اپنے ہاتھوں سے قربانی کے جانور اس تاریخی میدان میں لاکر ذبح کریں۔

مناسک حج خلیل علیہ السلام و فرزند خلیل علیہ السلام کی یادیں ہیں

اگر ہم بنظر غائر مناسک حج کا جائزہ لیں تو ہم پر حقیقت آشکار ہو گی کہ مناسک و ارکان حج کا کوئی نہ کوئی تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات سے ضرور نکل آئے گا مثلاً رمی یعنی کنکریاں مارنے کی رسم اس واقعہ کی یادگار ہے جب باپ بیٹا فریضہ قربانی ادا کرنے کی خاطر جا رہے تھے۔ راستے میں شیطان حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بہکانے کے لئے آ گیا اور ان سے کہنے لگا کہ تیرا باپ تجھے قتل کرنے کی نیت سے لے جا رہا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس شیطانی بہکاوے کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تو انہوں نے کہا کہ اسے کنکریوں سے مارو تاکہ اسے پتہ چل جائے کہ اس کا کوئی وار ہمارے ارادے متزلزل نہیں کرسکتا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا کنکریاں مارنے کا فعل خدائے بزرگ و برتر عزوجل کی نظر میں اتنا محبوب اور پسندیدہ ٹھہرا کہ

اسے تا قیامت امتِ مصطفوی ﷺ کے لئے مناسک حج کے ضمن میں جزوِ عبادت بنا دیا گیا، جب تک حاجی علامتی شیطانوں کو کنکریاں نہ ماریں فریضہ حج کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اس فعل کی عقلی توجیہ کرنا چاہیں تو عقل و منطق اس کا کوئی جواز نہ ڈھونڈ پائے گی۔

اس طرح لباس کا معاملہ ہے، تعمیر کعبہ کے وقت دونوں باپ بیٹا دو سادہ چادریں زیب تن کئے ہوئے تھے۔ یہ لباس جو انتہائی سادگی کا مرقع ہے خدا کی ذات کو اتنا پسند آیا کہ حجاج کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا مخصوص و علاقائی فیشن کے مطابق سلا ہوا لباس اتار پھینکیں اور فقط دو چادریں اوڑھ لیں جنہیں احرام کا نام دیا گیا۔ اب دنیا کے مختلف کونوں سے آئے ہوئے لوگ احرام کی چادروں سے جسم ڈھانپ کر سنت ابراہیمی و اسماعیلی علیہ السلام کی اتباع کرتے ہوئے ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔

ایسے ہی حرمت بیت اللہ میں سب ننگے سر حاضر ہوتے ہیں باوجود اس بات کے کہ عام حالات میں مساجد میں ننگے سر عبادت کرنا معیوب اور خلافِ سنت متصور ہوتا ہے تاہم خانہ کعبہ میں جہاں خدائے بزرگ و برتر کا جلال و کبریائی اپنے عروج پر کارفرما نظر آتی ہے۔ ننگا سر عجز و انکساری اور فروتنی کی علامت ہے جو رب العزت کی نگاہ رحمت میں بغایت درجہ پسندیدہ ہے۔

اسی طرح یہاں سر کے بالوں اور ناخنوں کا بڑھانا بھی سنت ابراہیمی کی پیروی ہے اگرچہ ان باتوں کی توجیہ عقل و منطق کی رو سے ممکن نہیں تاہم مقبولانِ الٰہی سے منسوب ہونے کی وجہ سے وہ اللہ کی نظر میں اتنی پسندیدہ ہیں کہ انہیں مناسکِ حج کا درجہ عطا کر دیا گیا اب انہیں اپنائے بغیر حج مکمل نہیں ہوسکتا۔

طواف میں اکڑ کر چلنے کا انداز

کعبۃ اللہ کے گرد سات چکر لگانا جنہیں عرفِ عام میں طواف سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مناسک حج کا اہم حصہ ہے۔ حاجیوں کو حکم ہے کہ وہ پہلے تین چکروں میں دورانِ طواف اکڑ اکڑ کر چلیں۔ کیا بوالعجبی ہے! کہ معمول کے حالات میں اکڑ کر چلنا اور

اترانا غرور وتکبر اور سرکشی وتمرد کا غماز ہے جو اللہ کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ اور قبیح افعال ہیں لیکن حج میں معاملہ برعکس ہے۔ روایات کے ذریعے ہم تک اس کی جو حکمت پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ جب مسلمان ہادی برحق ﷺ کے حکم کے مطابق مکہ سے مدینہ ہجرت کر چکے تو مسلسل جہاد اور ریاضت و مشقت کی بناء پر ان کے جسم دبلے اور کمزور پڑ گئے تھے۔ جب صلح حدیبیہ کے بعد مدینے سے عمرہ کرنے کے لئے مکہ پہنچے تو ان کی چال ڈھال سے نقاہت کا اظہار ہوتا تھا۔ طوافِ کعبہ کے دوران انہیں آہستہ آہستہ چلتے دیکھ کر کفارِ مکہ طعنہ زنی کرنے لگے کہ مسلمان مکہ میں تو کھاتے پیتے خوشحال تھے مدینے میں جاکر ان کی حالت ابتر ہوگئی ہے کہ ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کو کافروں کی اس طعنہ زنی اور خندہ و استہزاء کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ کافروں کی بات غلط ثابت کرنے کے لئے طواف کے دوران اکڑ اکڑ کر اور کندھے مٹکا مٹکا کر چلیں اس وقت سے یہ انداز مناسکِ حج میں شامل ہو گیا اگرچہ اس کے بعد معاملے کی بساط یکسر پلٹ گئی اور سرزمین حرم کفار ومشرکین کے وجود سے خالی ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔

مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو جائے نماز بنانے کا حکم

حرمِ کعبہ میں وہ مقام جہاں اللہ کے خلیل جناب ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک لگے تھے اسے نماز کے لئے مختص کرنے اور جائے نماز بنانے کا حکم ہوا جیسا کہ اہل ایمان سے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى

(القرآن، البقرۃ،۲: ۱۲۵)

''اور (حکم دیا کہ) ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو مقام نماز بنا لو۔''

اب جب تک حکم ایزدی کے تحت اس مخصوص مقام پر دو رکعت نماز نہ ادا کی جائے تو طواف کعبہ کی تکمیل نہیں ہوتی اور حج نامکمل رہتا ہے۔ یوں تو حرم کی ساری زمین مقدس ومحترم ہے لیکن اللہ کو اس جگہ سے جہاں اس کے خلیل کے قدموں نے مس کیا تھا

اتنی محبت ہوگئی کہ وہاں ساری خدائی کو سربسجود ہونے کا حکم دیا۔

سعی صفا و مروہ

صفا و مروہ حوالی مکہ میں دو پہاڑیا ں ہیں جنہیں ازروئے ارشاد ربانی شعائر اللہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں فرمودہ خداوندی ہے:

اِنّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ

(القرآن، البقرة، ۲: ۱۵۸)

’’بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔‘‘

دنیا کے لاکھوں پہاڑوں میں سے صرف صفا و مروہ کو خدا کی نشانیاں (شعائر اللہ) قرار دینے کی کیا حکمت ہے؟ اس کے پیچھے وہ داستان ہے جس کا مرکزی کردار حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چہیتی بیوی حضرت ہاجرہ علیہا السلام ہیں جنہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام حکم ایزدی کے مطابق اس لق و دق وادی میں چھوڑ کر چلے گئے۔ جناب اسماعیل علیہ السلام ابھی شیر خوار ننھے سے بچے تھے۔ انہیں شدت کی پیاس محسوس ہوئی تو ماں کی مامتا بے قرار ہوگئی اور حضرتِ ہاجرہ علیہا السلام اپنے لختِ جگر کو زمین پر لٹا کر دونوں پہاڑوں کے درمیان پانی کی تلاش میں دیوانہ وار دوڑنے لگیں کہ شاید کہیں پانی کا چشمہ مل جائے اس اضطراب والتہاب کی کیفیت میں انہوں نے کئی چکر لگائے۔ وہ اس خیال سے بچے کو اپنی نگاہ سے اوجھل بھی نہیں رکھنا چاہتی تھیں کہ کہیں کوئی بھیڑیا وغیرہ اٹھا کر نہ لے جائے خدائے ذوالجلال کو اپنی اس پیاری بندی کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کو مناسک حج میں شامل کر کے رہتی دنیا تک ہر عازم حج کے لئے لازم قرار دے دیا۔

اس داستان خوش انجام کا اختتام اس طرح ہوا کہ کمسن اور نونہال اسماعیل علیہ السلام نے شدت تشنگی سے زمین پر ایڑیاں رگڑنا شروع کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے سنگلاخ زمین کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری کر دیا جو ہزاروں سال گزر جانے کے بعد آج بھی جاری ہے

اور ایک جہاں اس سے سیراب ہو رہا ہے۔ یہ چشمہ زم زم کے نام سے زبان زدِ خاص و عام ہے۔ آبِ زم زم بہت سی بیماریوں کے لئے شفا ہے اور اس کے پینے کے بین السطور سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ شریعت مطہرہ نے ازنوعِ عبادات دوقسم کے اعمال بیان کئے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ اعمال آتے ہیں جو فی نفسہٖ عبادات قرار دیئے گئے جیسے نماز روزہ وغیرہ دوسری قسم میں وہ اعمال شامل ہیں جو ہر چند اپنی ظاہری نوعیت کے اعتبار سے عبادت کے درجے میں نہ تھے لیکن انہیں اللہ کے مقبول اور برگزیدہ بندوں سے منسوب ہونے کی وجہ سے خدا کی نظر میں محبوبیت کا وہ مقام مل گیا کہ انہیں منشائے ایزدی کے تحت دہرائے جاتے رہنا عین عبادت قرار پایا۔ تمام مناسک حج کا یہی فلسفہ اور یہی حقیقت ہے عقل اور منطق ان کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے کہ مقبولانِ الٰہی کے انداز و اطواراور محبوبانہ ادائیں عشق ومستی اور وارفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ مناسک حج کے ضمن میں شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کے تقویٰ کا موجب ہوتی ہے لہٰذا عقل ومنطق کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ان کے آگے فرطِ ادب سے سرِتسلیم خم کر دینا ہی مناسک حج کا تقاضائے اولین ہے۔

جزو پنجم

مسائل حج وعمرہ

حج کے متعلق یہ امر محتاج بیان نہیں رہا کہ جس طرح نماز روزہ زکوٰۃ فرض اور ارکانِ دین ہیں اس طرح حج بھی ایک رکن اور صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔ دوسرے ارکانِ اسلام کے مقابلے میں حج ہی ایک ایسا رکن ہے جس کا ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ ادا کرلینا شریعت نے فرض کیا ہے۔ ورنہ دیگر ارکان مثلاً نماز پنجگانہ ہر دن مختلف اوقات میں فرض ہے۔ روزہ زکوٰۃ سال کے بعد فرض ہے اس لئے بطور خاص حج کے جملہ مسائل کا بغور مطالعہ کرنا انہیں ذہن نشین کرکے رختِ سفر حج باندھنا بہت ضروری ہے۔ حج کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اس کا ایک مرتبہ ادا کرلینا عمر بھر کے لئے کافی ہوتا ہے لہٰذا علماء وصلحا نے تاکید فرمائی ہے کہ حج کرنے والوں کو حتی الامکان مستحبات اور سنن وغیرہ کی ادائیگی کا بھی فرائض و واجبات کی طرح اہتمام کرنا چاہیے۔ نیز بعض مخصوص مقامات پر مخصوص ادعیہ اور ماثورہ و مسنونہ اذکار و اوراد کی کثرت اور عجزو نیاز خشوع وخضوع کا اہتمام بھی بطور خاص اہمیت کا حامل ہے اسی مناسبت سے یہاں مسائل حج مختصراً بیان کئے جاتے ہیں۔

سفرحج وعمرہ کے آداب

ویسے تو مسلمان کی پوری زندگی شریعت مطہرہ کی تعلیمات کا عملی نمونہ ومظہر ہونی چاہیے لیکن حج کے سفر پر جانے سے قبل یا دوران سفر بعض چیزوں کا لحاظ رکھنا اور اہتمام کرانا انتہائی ضروری ہے مثلاً

(۱) حقوق اللہ کی ادائیگی: نماز، روزہ، زکوٰۃ جیسے اہم ترین فرائض کی ادائیگی میں اگر کوتاہی

ہوتی رہی تو سچے دل سے توبہ و استغفار کرے۔

(۲) حقوق العباد کی ادائیگی: کسی کا قرض دینا ہو یا امانت واپس کرنی ہو یا کسی کا مال ناحق لیا تو اسے واپس کرے یا معاف کرائے۔ بصورت دیگر اگر وارثوں کا پتہ نہ چلے تو اتنا مال فقیروں کو دے۔

(۳) قصور کی معافی: اگر کسی کے دل کو دکھایا ہو یا اسے بے جا تکلیف پہنچائی ہو، کسی کی غیبت اور چغلی کا ارتکاب کیا ہو تو اس سے معذرت کرے اور معافی مانگے۔ اگر وہ زندہ نہ ہو تو اللہ سے اپنے گناہوں کی صدقِ دل سے معافی مانگے۔

(۴) لڑائی جھگڑے سے اجتناب: آدابِ سفر میں سب سے ضروری ہے کہ مسافر ہر حالت میں صبر و تحمل اور ضبط و برداشت کی حکمت کو پیش نظر رکھے کیونکہ یہ سفر دو طرح سے آزمائش کا باعث بنتا ہے۔

۱۔ اگر کسی ہمراہی سے خلافِ طبیعت کوئی فعل یا قول سرزد ہو گیا ہو تو نفسِ امارہ انتقام کے لئے نہ ابھرے بلکہ قوتِ برداشت سے رفع دفع کر دے۔

۲۔ یہ سفر چونکہ ہے ہی تکالیف اور مشکلات سے بھرپور اس لئے اس میں بڑے دل گردے سے کام لینا چاہیے مبادا کوئی ایسی حرکت یا ذہنی و فکری لغزش ہو جائے کہ سب برکات سے ہی ہاتھ دھونا پڑیں۔ اس لئے کہ سفرِ حج اخلاق و کردار پارسائی اور دینداری اور حسنِ اخلاق کو جانچنے اور پرکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لہٰذا جہاں ہمسفروں کے ساتھ حسن سلوک اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے وہاں اللہ رب العزت کی ناراضگی سے بچنے اور اس کی رضا کے حصول کے لئے اخلاص و تقویٰ بھی ضروری ہے۔

(۵) طلب اجازت: والدین اگر زندہ ہوں تو ان سے اجازت طلب کرے اور عورت کے لئے اپنے خاوند کی اجازت ضروری ہے ورنہ اس کا سفر مکروہ ہوگا۔ ہاں اگر کوئی شخص عام حالت میں استطاعت کے باوجود اپنی بیوی کو حج کی اجازت نہیں دیتا تو بیوی بغیر اجازت

کے بھی فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے جاسکتی ہے۔

(۶) عورت کے لئے محرم کا ساتھ ضروری ہے: عورت کے ساتھ شوہر یا ایسا محرم بالغ قابل اعتماد شخص ہو جس کے ساتھ اس کا نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے ورنہ ہر قدم پر گناہ کی مرتکب ہو گی۔

(۷) اہل حجاز کا احترام: ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اہل حجاز بالخصوص حرمین شریفین کے متعلقین اور ملازمین کا ادب و احترام کیا جائے۔ ان کے رویے اور برتاؤ میں اگر درشتی بھی ہوتو اس سے درگزر بہرحال بہتر ہے۔

متفرقات

علاوہ ازیں روانگی کے وقت اپنے خویش و اقارب سے مل کر ان سے اپنے قصور معاف کرائے، ان سے دعا کرائے سفر کا لباس پہن کر چار رکعت نفل اداء کرے۔ گھر سے رخصت ہوتے ہوئے اگر یہ دعا پڑھے تو باعث خیر و برکت ہوگا۔

بِسۡمِ اللهِ وَتَوَکَلۡتُ عَلَی اللهِ وَلَا حَولَ وَلاَ قُوَةَ الَّا بِااللهِ اَاللّٰھُمَّ اِنَّانَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ نَذِلَ اَوۡنُذَلَّ اَوۡنَضِلّ اَوۡ نُضَلَّ اونَظۡلِمَ اَوۡ نُظۡلَمَ، اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوۡذُبِکَ مِنۡ عثاءِ السَّفرِ وَ کَابَةِ المنَقَلَبِ وَسُوۡءِ الۡمَنۡظَرِفِی الۡمَالِ وَالۡاَ ھۡلِ وَالۡوَلَدِ

’’اللہ کے نام سے اور اس کی مدد سے (میں اس سفر کا آغاز کرتا ہوں) میں نے اللہ پر بھروسہ کیا گناہوں سے اجتناب اور اطاعت کی طاقت اللہ کی توفیق سے ہی ہے الٰہی اس سے ہم تیری پناہ مانگتے ہیں کہ ہم دلغزش کریں یا دوسرا ہمیں لغزش دے، خود بہکیں یا دوسرا بہکائے یا ہم خود ظلم کریں یا کوئی ہم پر ظلم کرے الٰہی ہم سفر کی مشقت واپسی کی بدحالی اور مال یا اولاد کی بری حالت کے امکان (کے منظر) سے بھی تیری پناہ چاہتے ہیں۔‘‘

خاص وظائف

دورانِ سفر اگر دشمن یا رہزن کا خوف ہوتو سورہ ’’القریش‘‘ پڑھے۔ بھوک پیاس کی صورت میں ہر روز کسی وقت بھی ایک سو چونتیس مرتبہ یَاصَمَدُ پڑھ لے اور اگر کوئی مشکل درپیش ہوتو تین مرتبہ ’’یَا عِبَادَاللہِ اَعِیۡنُوۡنِی‘‘ پڑھ لے ان شاء اللہ ہر پریشانی سے حفاظت ملے گی۔ علاوہ ازیں ماثورہ دعاؤں کا وِرد بھی باعثِ سعادت و برکت ہے۔

واپسی

واپسی کے لئے بھی وہی طریقے ملحوظ رکھے جو یہاں تک بیان ہوئے ہیں نیز اپنے آنے کی اطلاع گھروالوں کو آنے سے قبل دے اور ہوسکے تو دن کے وقت گھر پہنچے کہ شریعت میں ہمیں یہی سبق سکھایا ہے۔ گھر میں آ کر دو رکعت نوافل پڑھے پھر اعزہ و اقارب، خدام اور دیگر متعلقین سے ملے۔ ان کے لئے کچھ تحائف بھی لائے کہ یہ حضور نبی اکرم ﷺ کی محبوب سنت ہے۔

وجوب حج کی شرائط

حج کے وجوب کے لئے مختلف کتبِ فقہ میں جوشرائط بیان کی گئی ہیں ان میں اجمالی طور پر دس شرائط ہیں۔ بصورت دیگر حج فرض نہیں ہوگا۔

(۱) مسلمان ہونا

حج کے وجوب کے لئے فرد کا مسلمان ہونا شرطِ اولین ہے اگر کوئی شخص اسلام کے کسی بنیادی رکن کا منکر ہو یا شعائر اللہ کے ساتھ استہزاء کرتا ہو۔ فقہا کے نزدیک اس کا اسلام پر ہونا مشتبہ اور محل نظر ہے۔

(۲) عقل مند ہونا

دیوانہ یا مجنون یا جس کے ہوش وحواس قائم نہ ہوں اس پر حج واجب نہیں۔

(۳) نابالغ

نابالغ بچوں پر حج واجب نہیں۔ حج کے وجوب کے لئے فرد کا بالغ ہونا شرط ہے

(۴) صاحب استطاعت ہونا

حج کے وجوب کے لئے فرد کا صاحب استطاعت ہونا ضروری ہے کہ وہ راستے کے اخراجات اور دوسرے لوازمات کا متحمل ہو۔

(۵) تندرست ہونا

کسی ایسی بیماری میں مبتلا نہ ہو جس کی وجہ سے اس کے لئے یہ سفر کرنا ممکن ہی نہ ہو۔ البتہ ایسا آدمی جو نابینا یا لنگڑا وغیرہ ہو اور اس میں وجوب حج کی دیگر شرائط اہتمام پائی جائیں تو وہ دوسرے کی مدد سے حج کر سکتا ہے۔

(۶) آزاد ہونا

فرد کا آزاد ہونا وجوب حج کے لئے شرط ہے۔

(۷) راستے میں امن وامان ہونا

وجوب حج کے لئے یہ شرط ہے کہ راستہ تمام خطرات مثلاً دشمنی و رہزنی وغیرہ سے محفوظ و مامون ہو۔

(۸) جان کا خوف نہ ہونا

کسی جابر حکمران یا دشمن کی طرف سے جان کا خوف بھی وجوبِ حج کو ساقط کر دیتا ہے۔

(۹) عورت کیلئے شوہر یا محرم کا ساتھ ہونا

عورت کے لئے وجوبِ حج کی شرط تب ثابت ہوتی ہے جب اس کا شوہر یا محرم ساتھ ہو۔ اگر ساری عمر ایسا محرم نہ مل سکا تو فرض کی ادائیگی کے لئے کسی کو وصیت کر سکتی ہے۔

(۱۰) عورت کا حالت عدت میں نہ ہونا

عدتِ وفات یا طلاق دونوں صورتوں میں دورانِ عدت حج واجب نہیں ہوگا۔

اقسامِ حج

ادائیگی کے طریقہ کے لحاظ سے حج کی تین اقسام ہیں:

(۱) **افراد:** اس طریقے کو کہتے ہیں جس میں حج کا احرام باندھا جاتا ہے عازم حج اس میں عمرہ نہیں کرتا بلکہ وہ صرف حج ہی کرسکتا ہے۔ احرام باندھنے سے حج کے اختتام تک عازم کو مسلسل احرام کی شرائط کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔

(۲) **قِران:** حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھ کر دونوں کے ارکان کو ادا کرنے کا نام ''قِران'' ہے۔ عازم حج مکہ پہنچ کر پہلے عمرہ کرتا ہے پھر اسی احرام میں اسے حج ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس دوران احرام میلا یا ناپاک ہونے کی صورت میں تبدیل تو ہوسکتا ہے مگر جملہ پابندیاں برقرار رہیں گی۔

(۳) **تمتع:** وہ طریقہ حج ہے جس میں حج اور عمرہ کو ساتھ ساتھ اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں عمرہ ادا کرنے کے بعد عازمِ حج احرام کی حالت سے باہر آ سکتا ہے۔ اس طرح اس پر ۸ ذی الحجہ یعنی حج کے ارادے سے احرام باندھے تک احرام کی پابندیاں ختم ہوجاتی ہیں۔

مندرجہ بالا تینوں طریقوں مین تمتع نسبتاً آسان حج ہے تاہم اہمیت اور فضیلت کے اعتبار سے حج قِران افضل ترین ہے۔

عمرہ کے فرائض و واجبات

عمرہ کے فرائض دو ہیں:

۱۔ حدودِ حرم کے باہر سے احرام باندھنا

۲۔ خانہ کعبہ کا طواف کرنا۔

عمرہ کے واجبات دو ہیں:

۱۔ صفاہ ومروہ کے درمیان سات چکر لگانا یعنی سعی کرنا۔

۲۔ سعی کے بعد سر کے بال ترشوانا، منڈوانا یا قصر یعنی بال کم کرانا (خواتین کے لئے صرف قصر ضروری ہے)

عمرہ کی نیت:

عمرہ کا احرام باندھنے سے پہلے عمرہ کی نیت سے غسل کر لینا افضل ہے ورنہ وضو بھی ٹھیک ہے۔ اس کے بعد احرام یعنی ایک سفید چادر تہ بند کے طور پر باندھ لیں اور دوسری اوڑھ لیں۔ پھر دو رکعت نماز نفل برائے عمرہ ادا کریں اور سلام پھیرتے ہی سر ننگا کرلیں اور عمرہ کی نیت کرلیں۔ نیت کے مسنون الفاظ اس طرح ہیں:

اَللّٰهُمَّ انِی اُرِیْدُ الْعُمْرَةَ فَیَسِّرْهَا لِی وَ تَقَبَّلْهَا مِنِّی وَاَعِنِی عَلَیْهَا وَبَارِکْ لِیْ فَیْهَا نَوَیْتُ الْعُمْرَةَ وَ اَحْرَمْتُ بِهَاللهِ تَعَالٰی

''اے اللہ! میں نے ارادہ کیا عمرے کا پس تو اس کو میرے لئے آسان کر دے اور قبول کرلے مجھ سے اور اس کے ادا کرنے میں میری مدد فرما اور اس کو میرے لئے بابرکت فرما۔ میں نے عمرے کی نیت کی اور احرام باندھا اس کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے۔

اس کے بعد ان الفاظ میں تلبیہ کہیں:

لَبَیْکَ اَللّٰهُم لَبَیْکَ ط لَبَیْکَ لاَ شَرِیْکَ لَکَ لَبَیْکَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْک لَا شَرِیْکَ لَکَ.

حج کے فرائض و واجبات

حج کے فرائض

۱۔ احرام باندھنا

۲۔ مقامِ عرفات میں ٹھہرنا

۳۔ طواف زیارت کرنا

۴۔ ان تینوں فرائض کو مقررہ مقامات اور مقررہ اوقات میں ترتیب سے ادا کرنا۔

حج کے واجبات

مذکورہ بالا فرائض کے علاوہ سات چیزیں حج کے واجبات میں شامل ہیں۔

۱۔ مزدلفہ میں ٹھہرنا ۲۔ جمرات کو کنکریاں مارنا

۳۔ اگر حج قِران یا حج تمتع کی نیت کی ہے تو قربانی کرنا

۴۔ سر کے بال منڈانا یا کترانا

۵۔ صفا اور مروہ کے درمیان طوافِ زیارت کے بعد دوڑنا (سعی کرنا)

۶۔ باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے طوافِ وداع کرنا۔

۷۔ طوافِ زیارت کے سات چکر پورے کرنا۔

ان واجبات میں سے کوئی واجب بھی ترک ہوجائے تو ایک قربانی دینا ضروری ہے۔

حالت احرام میں جو چیزیں منع ہیں

حالت احرام میں عازمین حج وعمرہ پر بعض ایسی چیزیں ممنوع ہوجاتی ہیں جو عام حالات میں جائز ہوتی ہیں مثلاً:

۱۔ شکار کرنا، شکاری کی مدد کرنا، شکار کی طرف اشارہ کرنا

۲۔ حدود حرم میں درخت، گھاس پودے وغیرہ کاٹنا یا مکھی، مچھر، جوں وغیرہ مارنا۔

۳۔ جسم سے کوئی بال توڑنا یا کاٹنا یا ناخن وغیرہ ترشوانا۔

۴۔ سلے ہوئے کپڑے پہننا مثلاً قمیض، شلوار، انڈرویر یا ٹوپی وغیرہ

۵۔ خوشبو دار سرمہ لگانا یا کھانے پینے کی اشیاء میں خوشبو کا استعمال مثلاً کسٹرڈ، اچار چٹنی اور شربت وغیرہ اسی طرح خوشبودار تمبا کو اور پانی بھی اسی حکم میں آتے ہیں۔

۶۔ مرد کے لئے سر اور چہرے کا چھپانا اور عورت کے لئے صرف چہرے کا ڈھانپنا۔ (خواتین کے لئے سر ڈھانپنا ضروری ہے)

۷۔ میاں بیوی کا ازدواجی تعلقات قائم کرنا۔ جنسی گفتگو کرنا چاہیے وہ گفتگو اپنی بیوی سے کیوں نہ ہو۔ علاوہ ازیں ایسے اقوال و افعال جس سے طبیعت میں ھیجان پیدا ہو اور حیوانی جذبات مشتعل ہوکر بیدار ہوجائیں۔

ایام حج میں وقوفِ عرفات سے قبل نویں تاریخ تک عورت سے مجامعت کرنا حج کو فاسد کردیتا ہے۔ دوسرے سال دونوں کے لئے اس کی قضا لازم ہوگی۔ نیز عدمِ احتیاط کے جرم میں دونوں کے لئے قربانی لازم ہوگی۔ (قدوری، عالمگیری)

علاوہ ازیں محرم کے لئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا، صغیرہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنا اور گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا کرنا عام حالات کی نسبت زیادہ قابل گرفت اور باعثِ نفرت ہے۔ ان سے بچنا بہرحال لازمی ہے۔

مذکورہ بالا ممنوعات ہیں کسی ایک کے ارتکاب کرنے یا غلطی سے سرزد ہوجانے پر خیایت کے احکام لازم آتے ہیں جو تین قسم کے ہیں۔

۱۔ دم ۲۔ بدنہ ۳۔ صدقہ

۱۔ دم: دم سے مراد پوری بکری، بھیڑ یا اونٹ، گائے وغیرہ کے ساتویں حصے) کی قربانی ہے۔

۲۔ بدنہ: بدنہ سے مراد پوری گائے یا اونٹ ذبح کر کے صدقہ کر دینا ہے اس کے وجوب کا باعث یہ صورتیں ہیں۔

ا۔حیض و نفاس یا جنابت کی حالت میں طواف زیارت کرنا

۲۔ وقوفِ عرفہ کے بعد حلق سے پہلے جماع کر لینا (مگر اس سے قضا ساقط نہیں ہوگی)

۳۔صدقہ: صدقہ سے مراد کچھ گندم یا اناج وغیرہ کسی فقیر کو دینا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے مستند کتب فقہ ملاحظہ فرمائیں۔

طواف کے واجبات

طواف کے واجبات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ حدثِ اصغر، بے وضو اور حدثِ اکبر یعنی ناپاکی کی حالت سے پاک ہونا۔

۲۔ طواف کی ابتداء اپنی داہنی جانب سے کرنا۔

۳۔ جسم کے ان حصوں کو چھپانا جو ستر میں شامل ہیں۔

۴۔ حجر اسود کے استلام یعنی بوسہ سے طواف شروع کرنا ہجوم کی صورت میں اشارۃً استلام ہی کافی ہے۔

۵۔ پیدل طواف کرنا معذور افراد اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۶۔ طواف مکمل ہونے کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا۔

۷۔ ان چیزوں سے بچنا جو حالتِ احرام میں منع ہیں۔

۸۔ حطیم کے باہر سے طواف کرنا۔

علاوہ ازیں طواف کے دیگر ضروری مسائل سے آگاہی ضروری ہے۔طواف کے چند ضروری مسائل درج ذیل ہیں:

- دورانِ طواف کھانا پینا مکروہ ہے۔

- جس طواف کے بعد سعی کرنا ہو اس میں رمل اور اضطباع ضروری ہے۔ رمل سے مراد پہلے تین چکروں میں پہلوانوں کی طرح خوب اکڑ اکڑ کر تیزی سے چلنا ہے جس سے طواف کرنے والا طاقت ور معلوم ہو۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو رمل کا حکم دیا تھا۔ اور اضطباع سے مراد چادر کا داہنا حصہ اپنی داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں مونڈھے پر ڈالنا ہے۔ خواتین رمل اور اضطباع دونوں سے مستثنیٰ ہیں۔
- طواف کرتے وقت جماعت کھڑی ہو جائے تو طواف چھوڑ کر فرض نماز میں شریک ہو جائیں۔ نماز پڑھنے کے بعد بقیہ طواف مکمل کر لیں۔
- بیت اللہ کے جتنا قریب ہو سکے طواف کرنا افضل ہے۔
- جن اوقات میں نماز مکروہ ہے ان میں طواف کرنا مکروہ نہیں ہے۔
- اگر کسی نے سات چکر پورے کرنے کے بعد آٹھواں چکر بھی لگا لیا تو اب اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ چھ مزید چکر لگائے کیونکہ نفلی عبادت کا شروع کرنے کے بعد پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔
- طواف کے بعد سعی کرنا مسنون ہے۔ سعی میں صفا و مروہ کے درمیان سات پھیرے واجب ہیں۔

ایام حج اور ارکان حج کی ادائیگی کا مختصر بیان

۸ ذی الحجہ سے ۱۲ ذی الحجہ کے پانچ دن ایام حج کہلاتے ہیں۔ یہی دن سفر حج کا حاصل ہیں کیونکہ انہی ایام میں حج کے جملہ مناسک ادا کرنا ہوتے ہیں۔

۸ ذی الحجہ

بہتر یہ ہے کہ سات ذی الحجہ کی رات کو ہی منیٰ کے لئے روانگی کی تیاری کر لی جائے۔ عمرہ کی تیاری اور نیت کی طرح ہو سکے تو پہلے غسل کر لے ورنہ وضو کر کے احرام کی نیت کریں۔ احرام باندھ کر دو رکعت نفل پڑھیں۔ اس کے بعد اسی جائے نماز پر حج کی نیت کریں، نیت حج کے الفاظ بالکل نیت عمرہ کی طرح ہیں صرف یہاں ''**العمرہ**'' کی جگہ

لفظ ''الحج'' کی تبدیلی کرلیں۔

منیٰ کو روانگی

۸ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں نماز فجر ادا کرکے سورج نکلتے ہی منیٰ کی جانب روانہ ہوجائیں۔ سفر میں تلبیہ کثرت سے پڑھیں۔ منیٰ میں پہنچ کر ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں۔ رات یہیں قیام کریں ۹ ذی الحجہ کی نمازِ فجر بھی منیٰ میں ادا کریں۔

۹ ذی الحجہ کو عرفات روانگی

نمازِ فجر منیٰ میں ادا کرنے کے بعد سورج نکلنے پر عرفات کو روانہ ہوجائیں اور زوال سے قبل خورد و نوش سے فراغت حاصل کر کے نماز ظہر اور عصر مسجد میں جا کر ادا کریں ورنہ اپنی اپنی جگہ ہی دونوں نمازیں با جماعت پڑھنی بھی جائز ہیں۔ یہ دونوں نمازیں ظہر کے وقت ملا کر پڑھنا ضروری ہیں۔

وقوفِ عرفات

میدانِ عرفات میں اسی قیام کو وقوفِ عرفات کہتے ہیں جو حج کا سب سے اہم رکن ہے۔ وقوف عرفات کی اہمیت اس سے واضح ہوجاتی ہے کہ اگر کسی وجہ سے ۹ ذی الحجہ کے دن یا اس رات بھی کوئی عازمِ حج یہاں پہنچنے سے رہ جائے تو اس کا حج نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی تلافی کی کوئی گنجائش ہے یہاں خصوصی دعائیں، استغفار اور کثرت سے حضور نبی اکرم ﷺ پر درود شریف پڑھیں کیونکہ حضور ﷺ نے بھی اسی میدان میں اپنی امت کے لئے خوب دعائیں فرمائی تھیں۔

عرفات سے مزدلفہ روانگی

اس دن غروبِ آفتاب کے وقت مغرب کی نماز پڑھے بغیر مزدلفہ روانہ ہوجائیں۔ مزدلفہ میں نماز مغرب اور عشاء با جماعت پڑھیں۔ رات مزدلفہ میں ہی قیام کریں اور اسی رات جی بھر کر اللہ کو یاد کریں کہ یہ بڑی افضل رات ہے۔

۱۰ ذی الحجہ کو مزدلفہ سے منیٰ روانگی

فجر کی نماز کے بعد مزدلفہ میں وقوف کریں کیونکہ یہ توقف واجب ہے پھر منیٰ کو روانہ ہوجائیں۔ منیٰ پہنچ کر حجاج کرام کو تین واجبات بالترتیب ادا کرنے ہوں گے (یاد رہے کہ عید الاضحیٰ کا دن ہوتا ہے مگر حجاج کرام کو مصروفیات حج کی بناء پر اس نماز سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔):

۱۔ بڑے شیطان کو رمی یعنی جمرہ کو کنکریاں مارنا۔ پہلی کنکری مارنے کے ساتھ ہی تلبیہ پڑھنا بند کردیں۔

۲۔ رمی سے فارغ ہونے کے بعد قربانی کریں۔

۳۔ قربانی کے بعد سر منڈائیں یا کترائیں لیکن عورتیں قصر ہی کروائیں یعنی ایک پور کے برابر بال کٹوادیں۔

اب احرام کھول کر غسل کرلیں اور اپنے اپنے کپڑے پہن لیں۔ اب سے احرام کی سب پابندیاں سوائے مباشرت کے، ختم ہوگئیں۔

طوافِ زیارت کے لئے مکہ روانگی

احرام کھولنے کے بعد مکہ مکرمہ روانہ ہوجائیں اور چوتھا رکن طوافِ زیارت بھی ادا کریں یہ حج کے فرائض میں شامل ہے اور ۱۲ ذی الحجہ کا آفتاب غروب ہونے تک جائز ہے اس کے بعد دم (قربانی) واجب ہوگا اور فرض بھی ذمہ رہے گا۔ یہ طواف کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتا اور نہ اس کا کوئی بدل ہے۔

خواتین

اپنی ان فطری اور قدرتی مجبوریوں کے پیش نظر ایام حج میں باقی تمام امور اسی طرح انجام دے سکتی ہیں۔ یہ طواف زیارت اس وقت تک کرنا جائز نہیں جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں ورنہ ''دم'' واجب ہوگا جبکہ اس تاخیر سے ان پر دم واجب نہیں ہوگا اور نہ ہی گناہ۔

صفاہ ومروہ کے درمیان سعی

اگر عازم حج نے حجِ تمتع کی نیت سے احرام باندھا تھا تو اس پر اس طواف کے بعد سعی کرنا واجب ہے لٰہذا یہ سعی بغیر احرام کے روزمرہ کے لباس میں ہی کرلیں۔

مکہ سے منیٰ واپسی

جب حج کی ادائیگی ہوچکی تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے پھر منیٰ روانہ ہوجائیں۔ طواف زیارت کے بعد دو رات اور دو دن منیٰ میں قیام کرنا سنتِ موکدہ ہے مکہ میں یا کسی اور جگہ رات گزارنا ممنوع ہے۔ گیارہ بارہ اور تیرہ ذی الحجہ کو مناسک کی اصطلاح میں ’ایام رمی‘ کہتے ہیں ان تینوں تاریخوں میں تینوں جمروں کی رمی کی جاتی ہے۔

رمی کا وقت ۱۱ ویں اور ۱۲ ویں ذی الحجہ کو زوال کے بعد سے غروب آفتاب تک ہوتا ہے۔ پہلے جمرہ اولیٰ پر سات کنکریاں ماریں۔ پھر جمرہ وسطیٰ پر آئیں اور بعد ازاں جمرہ عقبہ پر آکر حسب سابق سات سات کنکریاں ماریں اور آگے نکل جائیں۔ پہلے اور دوسرے جمرے پر رمی کے بعد دعا و استغفار اور وقوف مسنون ہے لیکن تیرہ کے بعد ٹھہرنا یا دعا مانگنا ثابت نہیں۔ یاد رہے کہ ہر بار یہی ترتیب ضروری ہے۔ اسی طرح بارہ ذی الحجہ اور اگر چاہیں تو تیرہ ذی الحجہ کو بھی رمی کریں۔ پھر واپس مکہ آجائیں راستے میں حج کی اس نعمتِ عظمیٰ کے حصول پر اللہ کا شکر ادا کریں اور دعا مانگیں۔

طوافِ وداع

یہ حج کا آخری واجب ہے جو صرف میقات سے باہر رہنے والوں پر واجب ہے کہ جب وہ مکہ سے رخصت ہونے لگیں تو آخری طواف کرلیں۔ طوافِ وداع کا وقت طوافِ زیارت کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے اختتام کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اس میں رمل نہ کریں البتہ طواف کے بعد دو رکعت نوافل ضرور پڑھیں پھر آب زم زم کے جام نوش کریں۔ ممکن ہو تو چوکھٹ کعبہ کو بوسہ دیں اور مقامِ ملتزم پر خانہ کعبہ کا پردہ پکڑ کر بارگاہِ الٰہی میں دل کھول کر روتے ہوئے ہر جائز دعا مانگیں اپنے لئے، احباب کے لئے،

دوستوں کے لئے اور امت مسلمہ کے ہر فرد کے لئے کیونکہ یہ وقت اور مقام شاید ہی دوبارہ میسر آئیں اور پھر کعبہ سے آبدیدہ رخصت ہوجائیں۔

دربارِ رسالت کی حاضری

اب عشاق اپنے اگلے سفر یعنی مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے روانہ ہو جائیں اور اس دربار کی حاضری کے لئے مچلتے جذبات، دھڑکتے دلوں اور برستی آنکھوں کے ساتھ کشاں کشاں اپنے آقا مولا کے حضور بصد ادب و احترام حاضر ہوں جہاں عشاق کے دِلوں کا حج ہوتا ہے۔

حاجیو! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے اب کعبے کا کعبہ دیکھو

دربارِ رسالت مآب ﷺ کی حاضری کی فضیلت و برکت اپنی جگہ مسلم ہے یہاں اس کے ذکر کی قطعاً گنجائش نہیں البتہ حضور نبی اکرم ﷺ کے چند مشہور ارشادات ملاحظہ ہوں:

مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِيْ

(عجلونی، کشف الخفاء، ۲: ۳۲۰، رقم: ۲۴۶۰)
(ذہبی، میزان الاعتدال فی نقد الرجال، ۷: ۳۹، رقم: ۹۱۰۲)
(عسقلانی، تلخیص الحبیر، ۲: ۲۶۷)

’’جس نے حج کیا (اور حج کے بعد مدینہ تک پہنچنے کی طاقت ہوتے ہوئے حج کر کے ہی واپس چلا گیا) اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے مجھ پر ظلم کیا۔

مَنْ زَارَ قَبرِی وَجَبتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ

(دار قطنی، السنن، ۲: ۲۷۸، رقم: ۱۹۴)
(بیہقی، شعب الایمان، ۳: ۴۹۰، رقم: ۴۱۵۹)

’’جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔‘‘

مَنْ زَارَنِی بَعْدَ مَوتِیْ فَکَانَّمَا زَارِنیْ فِی حَیٰوتِیْ

(طبرانی، المعجم الاوسط، ۱: ۹۴، رقم: ۲۸۷)

''جس نے میرے وصال کے بعدمیری زیارت کی گویا کہ اس نے مجھے میری زندگی میں ہی دیکھا۔''

مَنْ زَارَ قَبرِیِ بَعْدَ مَوتِیْ کَانَ کمن زَارنِی فِی حَیَاتِی

(دارقطنی، السنن،۲: ۲۷۸، رقم ۱۹۳)

(بیہقی، شعب الإیمان،۳: ۴۸۸، رقم: ۴۱۵۱)

''جس نے میرے وصال کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویااس نے میری حیات میں میری زیارت کی۔''

اور بقول پروفیسر علامہ سید محمد سلیمان اشرفؒ ''ان دونوں آخری حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ رسالت میں جس طرح دیکھنے والوں کو نہ دیکھنے والوں پر فضیلت حاصل تھی اس طرح آپ ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد جو مزارِ مقدس کی زیارت سے فائز ہوا وہ اس پر فضیلت رکھتا ہے جو مزارِ مطہّر کی زیارت نہ کرسکا۔ یعنی زائر کو غیر زائر پر فضیلت حاصل ہے۔''

جانم فدائے دیدہ کہ روئے تو دیدہ است
قربانِ پاشوم کہ بکویت رسیدہ است
خوشا چشم کہ دید آں مصطفیٰ را
خوشا دل کہ وارد خیالِ محمدؐ

باب چہارم

فلسفہ صوم

جزو اوّل

روزے کی فرضیت

یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ ارکان اسلام میں روزہ تیسرا بنیادی رکن ہے جس کی پابندی شہادت توحید و رسالت اور نماز کے بعد فرض کا درجہ رکھتی ہے۔ زیرنظر موضوع ان حکمتوں سے متعلق ہے، جو فرضیت روزہ کے عمومی حکم میں کارفرما ہیں، جس کے تحت ہم روزے کے افادی پہلوؤں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں گے تا کہ ان اثرات کو جو روزہ انسان کی مادی اور روحانی زندگی پر مرتب کرتا ہے، اجاگر کیا جا سکے۔

روزے کی فرضیت

قرآن حکیم میں اللہ رب العزت روزے کی فرضیت کے باب میں بلا استثنائے مرد و زن تمام اہل ایمان سے ارشاد فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ○

(القرآن، البقرۃ، ۲:۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر اسی طرح روزے فرض کئے گئے ہیں، جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

اس آیہ کریمہ میں دو باتیں بصراحت بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ روزے صرف امت محمدیہ ﷺ پر ہی نہیں بلکہ اممِ سابقہ پر بھی فرض کئے گئے، دوسرا روزے کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

۱- ثقہ روایت کے مطابق روزے کی فرضیت کا حکم دوسری صدی ہجری میں تحویلِ کعبہ کے واقعہ سے دس روز بعد ماہِ شعبان میں نازل ہوا۔ آیت روزہ شعبان کے مہینے میں نازل ہوئی، جس میں رمضان المبارک کو ماہ صیام قرار دیتے ہوئے باری تعالی نے اہل ایمان سے ارشاد فرمایا:

فَمَنۡ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ

(القرآن، البقرة،۲:۱۸۵)

پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پالے تو وہ اسکے روزے ضرور رکھے۔

اس آیہ مبارکہ میں روزہ رکھنے کا حکم ہر اس صاحبِ ایمان کو دیا گیا ہے، جو اپنی زندگی میں اس ماہ مقدس کو پالے۔

امت مصطفوی ﷺ سے پہلے یہود و نصاریٰ دس محرم الحرام (عاشورہ) کا روزہ باہتمام رکھتے تھے۔ اسی طرح ہر قمری مہینے کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کے تین دن جنہیں ایام بیض سے موسوم کیا جاتا ہے، کے روزے پہلی امتیں بڑے اہتمام کے ساتھ رکھا کرتی تھیں۔ رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کے بعد ان روزوں کی حیثیت بریں بنا سنت کا درجہ اختیار کر گئی کہ آنحضور ﷺ کا عاشورہ اور ایام بیض کے روزے رکھنے کا معمول مدت العمر قائم رہا۔ روزے کی فرضیت کا منکر کافر اور اسکا تارک گنہگار ہے۔

۲- آیت مبارکہ میں دوسری چیز جو بیان کی گئی ہے وہ روزے کا مقصد ہے جو کہ تقویٰ ہے یعنی روزہ انسان میں تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ اگر انسان روزہ رکھ کر بھی تقویٰ حاصل نہیں کرتا تو پھر انسان نے روزے کے حقیقی مقصد کو نہیں پایا۔

روزہ کے واجبات وشرائط

روزے کو عربی میں ''صوم'' کہتے ہیں جس کا لغوی معنی کسی ارادی فعل سے باز

رہنے اور رک جانے کا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں روزے کی درج ذیل تعریف بیان کی گئی ہے۔

الامساک عن المفطرات مع اقتران النية به من طلوع الفجر الی غروب الشمس

(تفسیر القرطبی،۲:۲۷۳)

''روزے کی نیت کے ساتھ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہر قسم کے مفطرات سے رک جانا۔''

بعض علمائے فقہ نے **الامساک عن المفطرات** کا معنی **الامساک عن الاکل والشرب والجماع** کھانے پینے اور عمل زوجیت سے باز رہنا بیان کیا ہے۔ فقہی اعتبار سے پو پھٹنے سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے، پینے اور ازدواجی تعلق (مباشرت) سے باز رہنے کے عمل کو صوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر روزہ مندرجہ ذیل پانچ چیزوں کو ملحوظ رکھنے سے عبارت ہے۔

۱۔کھانے سے اجتناب ۲۔ پینے سے اجتناب

۳۔ ازدواجی تعلق سے اجتناب ۴۔ روزے کی مدت (Duration)

۵۔ اجتناب کی نیت

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ متذکرہ بالا افعال کا صدور اس وقت روزے کی ہیئت اختیار کرتا ہے، جب یہ بہ نیت روزہ ہو، بغیر نیت کے محض بھوک اور پیاس کو اپنے اوپر طاری کر لینا روزہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

رمضان کی وجہ تسمیہ

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ رمضان رمضاء سے مشتق ہے۔ اس کا معنی سخت گرم زمین ہے لہٰذا رمض کا معنی سخت گرم ہوا۔ رمضان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ جب

عربوں نے پرانی لغت سے مہینوں کے نام منتقل کئے تو انہیں اوقات اور زمانوں کے ساتھ موسوم کر دیا، جن میں وہ اس وقت واقع تھے۔ اتفاقاً رمضان ان دنوں سخت گرمی کے موسم میں آیا تھا، اس لئے اس کا نام رمضان رکھ دیا گیا۔

(مرقاۃ المفاتیح، ۴: ۲۲۹)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رمضان کا لفظ رمض الصائم سے لیا گیا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ روزہ دار کے پیٹ کی گرمی شدید ہوگئی۔ رمضان کو رمضان کا نام اس لئے دیا گیا کہ وہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔

(لسان العرب ۷: ۱۶۲)

جزو دوم

رمضان المبارک
احادیث نبوی کی روشنی میں

۱۔ روزہ گزشتہ گناہوں کا کفارہ ہے

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن أبی هریرةؓ، قال قال رسول الله ﷺ: من صام رمضان ایماناً و إحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه

(بخاری، الصحیح، ۱:۲۲، کتاب الصوم، اب صوم رمضان اِیماناً و اِحتساباً من الاِیمان، رقم:۳۸)

''حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھا اس کے پچھلے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔''

اس حدیث مبارکہ میں روزہ رکھنے اور رمضان المبارک میں قیام کرنے کے ساتھ ایمان اور احتساب کی شرط لگا دی، یعنی اس حالت میں رمضان المبارک کے روزے رکھے اور راتوں کو قیام کرے کہ حضور سے ثابت شدہ سب چیزوں کی تصدیق کرے اور فرضیتِ صوم کا اعتقاد بھی رکھے تو اس کو ایمان کا روزہ کہا جائے گا۔

احتساب کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طلبِ ثواب کے لئے یا اس کے اخلاص کی وجہ سے روزہ رکھا اور روزے کی حالت میں صبر کا مظاہرہ اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہا۔

جو آدمی ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھتا ہے اور رمضان المبارک کی راتوں میں قیام کرتا ہے تو اس کے تمام صغائر معاف کردیے جاتے ہیں۔ اور کبائر کی معافی کی امید رکھی جاسکتی ہے یا کبائر کا بوجھ ہلکا بھی ہوسکتا ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

حدثنی عبدالرحمن بن عوف، عن رسول الله ﷺ قال: من قام رمضان ایماناً و احتساباً خرج من ذنوبه کیوم ولدته امه

(نسائی، السنن، ۴: ۱۵۸، کتاب الصیام، باب ذکر اختلاف یحیی بن أبی کثیر والنضر بن شیبان فیه، رقم: ۲۲۰۸)

''حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے، جس طرح ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے ہو۔''

۲۔ روزہ دار کے حصے میں دو خوشیاں ہیں

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

للصائم فرحتان، یفر حهما: اذا افطر فرح، و اذا لقی ربه فرح بصومه

(بخاری، الصحیح، ۲: ۶۷۳، کتاب الصوم، باب هل یقول انی صائم اذا شتم، رقم: ۱۸۰۵)

''روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت اور دوسری خوشی اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔''

ایک خوشی ہر روزے دار کو اس وقت میسر ہوتی ہے، جب وہ کڑے دن کی بھوک اور پیاس کے بعد لذتِ طعام سے آسودہ ہوتا ہے۔ دوسری خوشی حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق اس وقت نصیب ہوگی جب عالمِ اخروی میں اسے دیدارِ الٰہی کی نعمتِ عظمیٰ

سے نوازا جائے گا۔

متعدد احادیث مبارکہ اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں کہ شہید کی روح جب قفس عنصری سے پرواز کر رہی ہوتی ہے تو اس لمحہ اسے خدا کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔ روایات میں ہے کہ اہلِ جنت سے جب اللہ رب العزت پوچھیں گے کہ میری جنت میں کس چیز کی کمی ہے؟ تو وہ بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ باری تعالیٰ تیری جنت میں ہر نعمت موجود ہے۔ ایک گوشے میں شہید سکوت برلب اس حال میں بیٹھے ہوں گے کہ ان کے چہروں سے قدرے اضطراب اور آشفتگی کے آثار مترشح ہوں گے۔ ان کی اداسی اور پژمردگی کا سبب پوچھا جائے گا تو وہ جواب دیں گے کہ اے باری تعالیٰ یوں تو تیری جنت میں کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن اس میں ایک چیز کی کمی ہے جو بہت شاق گزر رہی ہے'' یہ پوچھنے پر کہ وہ کیا ہے ان کا جواب ہوگا کہ مولا ہمیں تیری جنت میں وہ لذت و حلاوت میسر نہیں، جو تیری راہ میں جان دیتے ہوئے نصیب ہوئی تھی۔ کاش ہمیں دنیا میں پھر واپس بھیج دیا جائے کہ بارِ دیگر تیری راہ میں جہاد کریں اور جان کا نذرانہ پیش کر کے وہ لذتِ دیدارِ خداوندی دوبارہ حاصل کرسکیں۔

روزے دار کو آخرت میں اس نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازا جائے گا، جس کے حصول کے لئے شہید بار بار اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی آرزو کرے گا۔

۳۔ روزے کا اجر وثواب

عن أبی هريرةؓ، قال قال رسول اللہ ﷺ: كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة بعشر أمثالها إلیٰ سبعمائة ضعف الی ماشاء اللہ يقول اللہ تعالیٰ: إلا الصوم، فانه لی و أنا أجزی به

(ابن ماجہ، السنن، ۱: ۵۲۵، کتاب الصیام، باب ما جاء فی فضل الصیام، رقم: ۱۶۳۸)

''حضرت ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدم کے بیٹے کا نیک عمل دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ روزہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔''

اس حدیث مبارکہ سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ بعض اعمال کا ثواب صدق نیت اور اخلاص کی وجہ سے دس گنا سے بڑھ کر سات سو گنا تک بلکہ بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ ثواب ہوتا ہے، لیکن روزہ کا ثواب بے حد اور بے اندازہ ہے۔ یہ کسی ناپ تول اور حساب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی مقدار اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔

روزے کی فضیلت کے اسباب

روزے کی اس قدر فضیلت کے درج ذیل اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ روزہ لوگوں سے پوشیدہ ہوتا ہے، اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ جبکہ دوسری عبادتوں کا یہ حال نہیں ہے، کیونکہ ان کا حال لوگوں کو معلوم ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے روزہ خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔ فانہ لی سے اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ روزے میں نفس کشی، مشقت اور جسم کا نقصان ہوتا ہے۔ اس میں بھوک، پیاس اور دیگر خواہشاتِ نفسانی پر صبر کرنا پڑتا ہے، جبکہ دوسری عبادتوں میں اس قدر تِ مشقت اور نفس کشی نہیں ہے۔

۳۔ نواب صدیق الحسن بھوپالی **فانه لی** اور **و انا اجزی به** کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: روزے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی ایک علت یہ بھی ہے کہ ویسے تو ساری عبادات و طاعات اللہ ہی کے لئے ہوتی ہیں، لیکن روزے کے ساتھ کبھی غیر اللہ کی عبادت نہیں کی گئی۔ کیونکہ کفار و مشرکین نے کسی دور میں بھی اپنے کسی معبود کی تعظیم روزے کے ساتھ نہیں کی۔ اگرچہ وہ نماز، سجدے اور ذکر و نیاز کی بعض صورتوں کے ساتھ وہ اپنے معبود یعنی باطل کی تعظیم و عبادت کیا کرتے تھے۔ پس اس وجہ سے روزہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

۴۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روزہ میں ریاکاری کا عمل دخل نہیں ہوتا، جبکہ دوسری ظاہری عبادات میں روزہ، حج، زکوۃ، صدقہ میں ریاکاری کا شائبہ ہوسکتا ہے۔

۵۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ روزے کی اس خصوصیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روزے دار کو روزہ میں حظِ نفسانی حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا روزہ اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔

۶۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کھانے پینے سے استغناء اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ روزہ دار اگرچہ اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے متشابہ تو نہیں ہوسکتا، لیکن وہ ایک لحاظ سے اپنے اندر یہ خلق پیدا کرکے مقرب الٰہی بن جاتا ہے۔

۷۔ اس کے ثواب کی مقدار کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے، جبکہ باقی عبادات کے ثواب کو رب تعالیٰ نے مخلوق پر ظاہر کردیا ہے۔ اس لئے یہ عبادت اللہ کے لئے مخصوص ہے۔

۸۔ باقی تمام عبادات سے تو حقوق العباد کی کوتاہیوں کی تلافی ہوگی، لیکن روزہ اس مقصد کے لئے میدانِ حشر میں خرچ نہیں کیا جائے گا۔

۹۔ روزہ ایسی عبادت ہے، جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، حتیٰ کہ فرشتے بھی معلوم نہیں کرسکتے۔

۱۰۔ روزہ کی اضافت اللہ کی طرف تشریف اور عظمت کیلئے ہے جیسا کہ بیت اللہ کی اضافت محض تعظیم وتشریف کے لئے ہے، ورنہ سارے گھر اللہ ہی کے ہیں۔

۱۱۔ روزہ دار اپنے اندر ملائکہ کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے وہ اللہ کو محبوب ہے۔

۱۲۔ صبر کی جزا کی حد نہیں ہے، اس لئے رمضان کے روزوں کی جزا کو بے حد قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا کہ اس کی جزا میں ہوں۔

۴۔ روزہ ڈھال ہے

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

الصوم جنة من النار کجنة احدکم من القتال

(نسائی، السنن، ۴: ۱۶۷، کتاب الصیام، باب ذکر اِختلاف علی محمد بن ابی یعقوب فی حدیث أبی أمامة فی فضل الصائم، رقم: ۲۲۳۱)

''روزہ جہنم کی آگ سے ڈھال ہے جیسے تم میں سے کسی شخص کے پاس لڑائی کی ڈھال ہو۔''

امام احمدؒ کی ایک روایت میں **جنة و حصن حصين من النار** کے الفاظ ہیں جبکہ دوسری روایت میں ''**الصيام جنة مالم يخرقها**'' کے الفاظ ہیں۔ امام دارمیؒ نے اس میں بالغیبۃ کے لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ دارمیؒ اور ابوداؤدؒ نے اس لفظ کو ترجمہ الباب میں بھی رکھا ہے۔ جنۃ کے لفظ کا معنی و قایۃ اور ستر ہے۔ اور ان روایت سے ستر کا متعلق واضح ہوگیا کہ وہ النار ہے۔ امام بن عبدالبرؒ نے اس حدیث کی شرح میں اس کو بالجزم لکھا ہے۔ لیکن صاحبِ نہایہ لکھتے ہیں کہ روزہ کے ڈھال ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ روزہ دار کو موذی شہوات سے باز رکھتا ہے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ روزہ کے ڈھال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مشروعیت کے لحاظ سے سترہ اور حفاظت کا سامان ہے۔ پس روزہ دار کا فرض ہے کہ اسے ایسی چیزوں سے بچائے جو اسے فاسد کردیتی ہیں اور اس کے ثواب کو کم کردیتی ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ روزہ کو اس کے فائدہ کے لحاظ سے ڈھال قرار دیا جائے کہ وہ شہواتِ نفس کو ضعف کردیتا ہے۔

قاضی عیاض نے اکمال میں فرمایا ہے کہ ''**جنة**'' کا معنی ہے کہ روزہ گناہوں اور آگ سے حفاظت کا سبب ہے۔ امام ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ روزہ ڈھال اس لئے بنایا گیا ہے کہ جہنم کو شہوات کے ساتھ گھیرا گیا ہے، پس جو آدمی شہوات سے بچے گا وہ جہنم

سے محفوظ رہے گا اور روزہ شہوات سے چونکہ بچاتا ہے، اس لئے وہ جہنم کی آگ ڈھال بن جاتا ہے۔ الصیام جنۃ کی مراد ابن حبانؒ اور مسند احمدؒ کی صحیح حدیث سے واضح ہوجاتی ہے کہ جس میں آتا ہے کہ میت کو جب اس کی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو نماز اس کے دائیں طرف سے آجاتی ہیں روزہ بائیں طرف سے، قرآن سر کی جانب سے، اور صدقہ پاؤں کی طرف سے آجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزہ کی محافظت روزہ دار کے لئے فقط روزے سے ہی نہیں بلکہ دوسری عبادات سے بھی ہوگی۔ روزہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عذاب سے روزہ دار کو بچائے گا اور اس کے دائیں طرف آجائے گا۔

۵۔ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے ہاں کستوری سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن أبی هريرة، قال قال رسول الله: وألذی نفس محمد بيده لخلوف فم الصائم أطيب عند الله يوم القيامة من ريح المسک.

(مسلم، الصحیح، ۲: ۸۰۷، کتاب الصوم، باب فضل الصیام، رقم: ۱۱۵۱)

''حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے۔ روزہ دار کے منہ کی ہوا اللہ کے نزدیک یوم قیامت مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ بہتر ہے۔''

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس کلام میں مجاز اور استعارہ ہے کیونکہ بعض قسم کی خوشبوؤں کی طرف میلانِ طبع اور بعض سے نفرت، مخلوق کا خاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے اور چونکہ انسان اپنے محاورات میں خوشبو کی تعریف کرنا اور اس کی اچھائی کو بیان کرنے کا عادی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی محاوراتی کلام کے رنگ میں اس کی رضا و خوشنودی کے بارے میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روزہ دار کو اس بو کے عوض جو خلوِ معدہ کی وجہ سے منہ میں پیدا ہوجاتی ہے قیامت میں بہترین خوشبو بطور جزا دیں گے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ شہید کے خون کی خوشبو مشک جیسی ہوگی۔

امام نوویؒ نے اس جملہ کی شرح میں فرمایا ہے کہ صحیح ترین اس کا معنی یہ ہے کہ خلوفِ صائم کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک سے بھی زیادہ ہے۔

۶۔ جنت کے دروازہ کا کھلنا اور جہنم کے دروازہ کا بند ہونا

عن أبی هريرةؓ، قال قال رسول اللہ ﷺ: إذا دخل شهر رمضان حسنة أبواب السماء وغلقت أبواب جهنم و سلسلت الشياطين

(بخاری، الصحیح، کتاب الصوم، باب ھل یقال رمضان أو شھر رمضان، ۲:۶۷۲، رقم: ۱۸۰۰)

’’حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب رمضان داخل ہوجاتا ہے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور شیاطین کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔‘‘

آسمان کے دروازے کھلنا کنایہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رحمت خداوندی پے در پے نازل ہوتی ہے اور نیک اعمال کسی رکاوٹ کے بغیر اوپر بلند ہیں اور دعا قبول ہوتی ہے اور جنت کے دروازوں کا کھولا جانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ رمضان میں نیک اعمال کی توفیق ہوتی ہے جو حصولِ جنت کا باعث ہیں۔ اور دوزخ کے دروازوں کے بند کیے جانے سے مراد یہ ہے کہ روزہ دار کو ایسے اعمال کی توفیق دی جاتی ہے جو جنت میں داخل ہونے کا باعث ہیں، کیونکہ وہ کبائر سے بچتا ہے اور روزے کی برکت سے اس کے صغیرہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

شیطانوں کا جکڑ دیا جانا اس امر سے کنایہ ہے کہ شیطان لوگوں کو بہکانے سے باز رہتے ہیں اور اہل ایمان ان کے وسوسے قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزے کی وجہ سے حیوانی قوت جو غضب اور شہوت کی جڑ ہے، جاتی رہتی ہے اور غضب اور شہوت ہی بڑے بڑے گناہوں کا باعث ہوتے ہیں۔ اور قوتِ عقلیہ جو طاعت اور نیکیوں کا

باعث ہے، روزے کی وجہ سے قوی ہوتی ہے، جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ رمضان میں اور دنوں کی نسبت گناہ کم ہوتے ہیں اور عبادت زیادہ ہوتی ہے۔

شیطانوں کے جکڑے جانے کا مفہوم

اگر اس کو ظاہری معنی پر محمول کیا جائے پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ بعض نافرمان لوگ گناہ کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ اگر وہ ایک قسم کا گناہ ترک کریں گے تو دوسری قسم کو اختیار کرلیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شیطانوں کے جکڑے جانے کی علامت یہ ہے کہ گناہوں میں منہمک ہونے والے اکثر لوگ رمضان میں باز آجاتے ہیں اور توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پہلے وہ نماز قائم نہیں کرتے تھے، اب پڑھنے لگتے ہیں اس طرح وہ قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر کی محافل میں شریک ہونے لگتے ہیں، حالانکہ وہ پہلے ایسا نہیں کیا کرتے تھے، پہلے جن گناہوں میں علی الاعلان مشغول رہتے تھے اب ان سے باز آجاتے ہیں۔ اور بعض جن کا عمل اس کے خلاف نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطانی وساوس ان کے شریر نفوس کی جڑوں میں سرایت کر چکے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جیسا کہ دوسری حدیث کے الفاظ سے واضح ہے۔ سلسلت مردۃ الشیاطین۔ شیطانوں کے سردار کو جکڑ دیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ سب شیاطین کو جکڑ دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطانوں کے سردار (ابلیس) کو جکڑ دیا جاتا ہے، لیکن اس کے چھوٹے چیلے چانٹے نہیں جکڑے جاتے، بلکہ وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ گناہوں کا وقوع شیطانوں پر ہی منحصر نہیں، کیونکہ آدمی کا نفس اس کا سب سے بڑا دشمن ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ زمانے میں شر تو موجود ہے اور گناہ بھی مسلسل ہو رہے ہیں تو پھر اس کے جکڑنے کا کیا فائدہ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے اس کی سرکشی اور طغیانی کی شوکت ٹوٹتی ہے اور اس کے ہتھیار کند ہوجاتے ہیں اور اس کی بھڑکائی ہوئی آگ کچھ مدت کے لئے ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا بھی جانتا ہے کہ وہ کیا گل کھلاتا؟ کیونکہ وہ اپنے لاؤ

لشکر اور چیلے چانٹوں کی مدد اور تعداد پر مغرور ہے۔

اس کا یہ معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ رمضان المبارک کے روحانی ماحول میں چونکہ روزہ دار نیکیوں میں مشغول اور برائیوں سے دور ہوجاتے ہیں۔ لہذا وہ شیطانی اغوا اور وساوس کے شر سے محفوظ رہتے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جنت کے دروازوں کا کھولا جانا اہل ایمان کے لئے فضل ہے، ورنہ کفار ومشرکین تو ان دنوں میں گمراہی وضلالت میں پہلے سے بھی زیادہ مصروف ہوجاتے ہیں، کیونکہ شعائر اللہ کی ہتک کرتے ہیں لیکن اہلِ ایمان چونکہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں اور عبادت و ریاضت کرتے ہیں۔ اس مبارک مہینے میں نیکیوں کی کثرت کرتے ہیں اور برائیوں سے بچے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں ان کے لئے جنت کے دروازے کھول دیے گئے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیے گئے ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ: ۳۷۴)

علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ رحمت کے دروازوں کا کھولا جانا اپنے حقیقی معنی پر اس شخص کے حق میں محمول ہے 'جو رمضان میں وفات پائے اور اس کے اعمال فاسد نہ ہوں۔

محدث ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جنت کے دروازوں کے کھولے جانے کا فائدہ یہ ہے کہ ملائکہ روزہ داروں کے عمل کو اچھا جان کر ان کے لئے جنت کو تیار کرتے ہیں۔اور یہ خدا کی طرف سے روزہ داروں کی بڑی عزت افزائی ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ شیاطین کے جکڑے جانے کا مطلب عیسیٰؒ نے یہ لکھا ہے کہ شیاطین سے مراد اس حدیث میں ملاء اعلی کی باتیں اڑا کر لے بھاگنے والے اور چوری چھپے ملائکہ کی گفتگو سن کر اپنے سرداروں کو بتاتے ہیں اور رمضان میں انہیں اس لئے جکڑا جاتا ہے کہ انہیں نزول قرآن کے زمانے میں استراقِ سمع (چوری چھپے سننے) سے روکا گیا اور رمضان میں مزید حفاظت کیلئے جکڑ دیا گیا۔

چونکہ رمضان میں شیاطین کو دوسرے دنوں کی مانند اہل ایمان کے اغوا کرنے

اور فتنہ میں ڈالنے کے مواقع کم سے کم رہ جاتے ہیں۔

شیاطین کو اس لئے بھی جکڑ دیا جاتا ہے تا کہ مکلّف انسانوں کے عذر کو رفع کر دیا جائے دوسروں لفظوں میں انسان کو اس بات کی تنبیہ کی جاتی ہے کہ اب شیاطین کو اغوا سے روک دیا گیا ہے۔ اب ترکِ اطاعت اور گناہ کے کرنے کے لئے تیرے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اگر تو اب بھی باز نہ آئے تو یہ تیری کم بختی اور بدنصیبی ہوگی۔

۷۔ باب الریان صرف روزہ دار کیلئے مخصوص ہے

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن سهل بن سعيد، قال: قال رسول الله ﷺ إن فی الجنة بابا يقال له الريان، يدخل منه الصائمون يوم القيامة، لا يدخل منه احد غيرهم

(بخاری، الصحیح، ۲:۶۷۲، کتاب الصوم، باب الریان للصائمین، رقم: ۱۷۹۷)

''حضرت سہل بن سعدیؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک دروازہ ہے، جس کا نام ریان ہے۔ روز قیامت اس میں روزہ دار داخل ہوں گے، ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس میں سے داخل نہیں ہوگا۔''

جنت میں انسانوں کے اعمال کے اعتبار سے کئی دروازے ہیں۔ پس جو شخص دنیا میں کوئی عمل کرے گا وہ جنت میں اس عمل کے دروازے سے داخل ہوگا۔

ریان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں محدث ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یا تو وہ بنفسہ ریان ہے، کیونکہ اس کی طرف کثیر نہریں جاری ہیں۔ اس کے قریب تازہ اور سرسبز و شاداب پھل پھول بکثرت ہیں۔ قیامت کے دن اس کے ذریعے سے لوگوں کی پیاس زائل ہوگی اور تر و تازگی و نظامت ہمیشہ رہے گی۔ اس لئے صرف رمضان کے روزے رکھنے والا ہی نہیں بلکہ کثرت سے نفلی روزے رکھنے والا بھی اس کا مستحق ہوگا۔

جزوسوم

روزے کی حکمتیں

پہلی حکمت (تقویٰ کا حصول)

پہلی حکمت کا ذکر شروع میں درج کردہ آیہ کریمہ میں کیا گیا ہے کہ اہل ایمان پر امِم سابقہ کی طرح روزے اس لئے فرض کئے گئے کہ وہ متقی اور پرہیزگار بن جائیں۔ گویا روزے کا مقصدِ عظمٰی انسانی سیرت کے اندر تقویٰ کا جوہر پیدا کر کے اس کے قلب و باطن کو روحانیت و نورانیت سے جلا دینا ہے۔ روزے سے حاصل کردہ تقویٰ کو بطریق احسن بروئے کار لایا جائے تو انسان کی باطنی کائنات میں ایسا ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے، جس سے اس کی زندگی کے شب و روز یکسر بدل کر رہ جائیں۔

تقویٰ بادی النظر میں انسان کو حرام چیزوں سے اجتناب کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اگر بنظر غائر قرآن و سنت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ روزے کی بدولت حاصل شدہ تقویٰ حرام چیزوں سے تو درکنار ان حلال و طیب چیزوں کے قریب بھی بحالتِ روزہ پھٹکنے نہیں دیتا، جن سے متمتع ہونا عام زندگی میں بالکل جائز ہے۔ ہر سال ایک ماہ کے اس ضبطِ نفس کی لازمی تربیتی مشق (Refresher Course) کا اہتمام، اس مقصد کے حصول کے لئے ہے کہ انسان کے قلب و باطن میں سال کے باقی گیارہ مہینوں میں حرام و حلال کا فرق و امتیاز روا رکھنے کا جذبہ اس درجہ فروغ پا جائے کہ اس کی باقی زندگی ان خطوط پر استوار ہو جائے کہ ہر معاملے میں حکمِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے وہ حرام چیزوں کے شائبے سے بھی بچ جائے۔

اگر تقویٰ کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آ جائے تو انسان کی زندگی سراسر خوف و

خشیت الٰہی سے عبارت ہو جائے گی، لیکن مقام افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر روزے کے ثمرات سے محض اس لئے محروم رہتے ہیں کہ ہمارا شعار روزے کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دینا بن گیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہمارے ہاتھ سوائے بھوک و پیاس کی مشقت کے کچھ نہیں آتا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

کم من صائم لیس له من صیامه الا الظماء و کم من قائم لیس له من قیامه الا السهر

(دارمی، السنن، ۲: ۳۹۰، رقم: ۲۷۲۰)

''کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں کہ جن کو روزوں سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور کتنے ہی قیام کرنے والے ایسے ہیں جن کو اپنے قیام سے سوائے جاگنے کے کچھ نہیں ملتا۔''

دوسری حکمت (تربیت صبر و شکر)

تقویٰ کی ایک کیفیت صبر کی آئینہ دار ہے، جس کا تقاضا ہے کہ انسان کسی نعمت سے محرومی پر اپنی زبان کو شکوہ اور آہ و بکا سے آلودہ کئے بغیر خاموشی سے برداشت کرے۔ روزہ انسان کو تقویٰ کے اس مقامِ صبر سے بھی بلند تر مقامِ شکر پر فائز دیکھنے کا متمنی ہے۔ وہ اس کے اندر یہ جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ نعمت کے چھن جانے پر اور ہر قسم کی مصیبت، ابتلا اور آزمائش کا سامنا کرتے وقت اس کی طبیعت میں ملال اور پیشانی پر شکن کے آثار پیدا نہ ہونے پائیں، بلکہ وہ ہر تنگی و ترشی کا بہرحال خندہ پیشانی سے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتا رہے۔

اس ضمن میں دو صاحب حال بزرگوں کے واقعہ کا تذکرہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ طویل جدائی کے بعد جب وہ ملے اور ایک دوسرے کا حال پوچھا تو ایک نے کہا کہ اپنا حال تو یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی نعمت سے نوازتا ہے تو اس کا شکر ادا کرتے ہیں، وگرنہ صبر سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے بزرگ نے کہا، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ہمارے شہر کے

کتوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ مالک کے در پر پڑے رہتے ہیں، اگر کچھ مل جائے تو دُم ہلا کر اس کے آگے پیچھے جاتے ہیں اور اگر کچھ نہ بھی ملے تو اسے چھوڑ کر کسی اور در پر نہیں جاتے۔ پھر فرمایا کہ اپنا حال یہ ہے کہ جب مولا سے کچھ ملتا ہے تو اس کے بندوں میں بانٹ دیتے ہیں اور کچھ نہ ملے تو ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں۔

روزہ چونکہ کھانے پینے اور نفسانی شہوات سے اپنے آپ کو روکنے کا نام ہے۔ روزہ کی حالت میں انسان اللہ تعالی کی نعمتوں کو اپنے اوپر روک لیتا ہے۔ جب آدمی ایک خاص مدت تک نعمتوں سے دور رہے تو پھر اس کی قدر کا پتا چلتا ہے۔ بالعموم نعمت کی اہمیت اور قدر کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی قدر تب ہوتی ہے، جب وہ مفقود ہو جائے۔ پس یہ نعمت کی پہچان اور اس کی قدر کا جاننا اس کے حق کی ادائیگی کو واجب کر دیتا ہے۔ اور حق کی ادائیگی شکر سے ہوتی ہے۔ جو عقلاً اور شرعاً فرض ہے۔ اسی لئے اللہ تعالی نے آیاتِ صوم میں ''لعلکم تشکرون'' کے ذریعے تشکر کی ضرورت و اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تیسری حکمت (جذبہ ایثار)

بحالتِ روزہ انسان بھوک اور پیاس کے کرب سے گزرتا ہے تو لامحالہ اس کے دل میں ایثار، بے نفسی اور قربانی کا جذبہ تقویت پکڑتا ہے اور وہ عملاً اس کیفیت سے گزر کر جس کا سامنا انسانی معاشرہ کے مفلوک الحال اور نانِ شبینہ سے محروم لوگ کرتے ہیں، کرب و تکلیف کے احساس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت روزے کے ذریعے اللہ رب العزت اپنے آسودہ حال بندوں کو ان شکستہ اور بے سروسامان لوگوں کی زبوں حالی سے کماحقہ آگاہ کرنا چاہتے ہیں، جو اپنے تن و جان کا رشتہ بمشکل برقرار رکھے ہوئے ہیں، تاکہ ان کے دل میں دکھی اور مضطرب انسانیت کی خدمت کا جذبہ فروغ پائے اور ایک ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آ سکے، جس کی اساس باہمی محبت و مروت، انسان دوستی اور دردمندی و غمخواری کی لافانی قدروں پر ہو۔ اس احساس کا بیدار ہو جانا روزے کی روح کا لازمی تقاضا ہے اور اس کا فقدان اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ روزے میں روح نام کی کوئی

چیز باقی نہیں بقول علامہ اقبالؒ

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام
فرد ناہموار، ملت بے امام

چوتھی حکمت (تزکیہ نفس)

روزہ انسان کے نفس اور قلب و باطن کو ہر قسم کی آلودگی اور کثافت سے پاک و صاف کر دیتا ہے۔ انسانی جسم مادے سے مرکب ہے، جسے اپنی بقا کے لئے غذا اور دیگر مادی لوازمات فراہم کرنا پڑتے ہیں، جبکہ روح ایک لطیف چیز ہے، جس کی بالیدگی اور نشوونما مادی ضروریات اور دنیاوی لذات ترک کر دینے میں مضمر ہے۔ جسم اور روح کے تقاضے ایک دوسرے کے متضاد اور نقیض ہیں۔ روزہ جسم کو اپنا پابند اور منقاد بنا کر مادی قوتوں کو لگام دیتا ہے، جس سے روح لطیف تر اور قوی تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جوں جوں روزے کی بدولت بندہ خواہشاتِ نفسانی کے چنگل سے رستگاری حاصل کرتا ہے، اس کی روح غالب وتوانا اور جسم مغلوب ونحیف ہو جاتا ہے۔ روح اور جسم کا تعلق پرندے اور قفس کا سا ہے، جیسے ہی قفسِ جسم کا کوئی گوشہ وا ہوتا ہے، روح کا پرندہ مائل بہ پرواز ہو کر، موقع پاتے ہی جسم کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

مسلسل روزے کے عمل اور مجاہدے سے تزکیہء نفس کا عمل تیز تر ہونے لگتا ہے، جس کی وجہ سے روح کثافتوں سے پاک ہو کر پہلے سے کہیں لطیف تر اور قوی تر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض کاملین وعرفاء کی روحانی طاقت کائنات کی بیکرانیوں اور پہنائیوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔

حضرت غوث اعظمؒ کی روحانی طاقت

روح کی جولانیوں کے ذیل میں حضرت غوث الاعظمؒ کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ انہیں فرداً فرداً چالیس کے لگ بھگ مریدوں نے اپنے ہاں افطاری کی

دعوت دی جو حضرت نے ازراہِ بندہ نوازی قبول فرما لی۔ اگلے دن ہر مرید نے حضرتؒ کی تشریف آوری کا ماجرا کمالِ اشتیاق سے بیان کیا تو ان کے درمیان باہمی تکرار ہونے لگا۔ ہر ایک یہ کہتا تھا کہ کل شیخؒ نے ہمارے ہاں افطاری کی ہے۔ ان میں یہ جھگڑا ہو رہا تھا کہ حضرت کے صاحب زادے کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ انہیں دیکھ کر کہنے لگے کہ کس لئے تکرار کرتے ہو۔ حضرت نے تو کل اپنے گھر میں روزہ افطار کیا تھا۔

یہ سب کچھ روحانی تصرفات کا اعجاز تھا، جو اللہ کے بندوں کو تزکیہ نفس کے ذریعے نصیب ہوتے ہیں۔

آنحضور ﷺ کے روحانی تربیت یافتگان میں زہد و ورع اور تقویٰ کی بنا پر اصحابِ صفہ کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کی زندگیوں پر فقرِ مصطفویٰ ﷺ کی نمایاں چھاپ تھی، جو فقر اضطراری نہیں بلکہ فقر اختیاری تھا۔ روزے سے فقر و فاقہ کی جو شان استغناء جنم لیتی ہے، وہ تونگری سے کہیں اعلیٰ مقام و رفعت کی حامل ہے۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

اندروں از طعام خالی دار

تا درآں نور معرفت بینی

(اپنے آپ کو خالی رکھ تاکہ تیرے اندر معرفت کا نور آئے)

الغرض نفس امارہ انسان کو برائی پر اکساتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوۡٓءِ

(القرآن، یوسف،۱۲: ۵۳)

''بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے''۔

نفس امارہ کو قابو میں رکھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بعض اوقات اپنے نفس کو جائز

اور حلال خواہشوں سے بھی روکیں، تاکہ ناجائز اور حرام کی طرف میلان کی جرأت و ہمت ہی نہ کرسکے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ اس تربیت سے اس کی عادت بھی بدل جائے گی اور بری باتوں کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔

پس جب اس تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان المبارک کا مہینہ عطا کیا ہے، جس میں انسان دن کے وقت حلال چیزیں کھاتے، پیتے اور جماع سے باز رہتا ہے۔ تو پھر وہ حرام جو کہ ہر حالت میں حرام ہے تو اس دوران پھر اسکی طرف رغبت اور میلان کس طرح ممکن ہے۔

اگر انسان ایک طرف زہر کے اثر کو مٹانے کے لئے دعا بھی کرے تو دوسری طرف زہر کا استعمال بھی کرے تو ایسی صورت میں دوا کا اثر کس طرح ممکن ہے؟ اس لئے روزہ کا مقصود تبھی حاصل ہوتا ہے، جب انسان اپنے نفس کو پاک اور منزہ کرے۔

پانچویں حکمت (رضائے خداوندی کا حصول)

روزے کا منتہائے مقصود یہی ہے کہ وہ بندے کو وہ تمام روحانی مدارج طے کرانے کے بعد مقام رضا پر فائز دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ مقام رضا کیا ہے؟ جو روزے کے توسط سے انسان کو نصیب ہو جاتا ہے اس پر غور کریں تو اس کی اہمیت کا احساس اجاگر ہوتا ہے رب کا اپنے بندے سے راضی ہو جانا اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے مقابلے میں باقی سب نعمتیں ہیچ دکھائی دیتی ہیں۔ روزہ وہ منفرد عمل ہے جس کے اجر و جزا کا معاملہ رب اور بندے کے درمیان چھوڑ دیا گیا کہ اس کی رضا حد و حساب کے تعین سے ماوراء ہے۔

رضائے خداوندی کی پہچان اور علامت

رب تعالیٰ اپنے بندے سے کب اور کیسے راضی ہوتا ہے اور اس بات کی کیا علامت ہے کہ رب اپنے بندے سے فی الواقعہ راضی ہو گیا ہے۔ اس بارے میں ایک بزرگ نے اپنے مرید سے پوچھا تمہیں کس طرح پتا چلے گا کہ رب تم سے راضی ہو گیا

ہے۔ اس نے نہایت ادب سے جواب دیا:

اذا وجدتُ قلبی راضیاً عن اللہ تعالیٰ علمتُ أنه راضٍ عنی

(الرسالۃ القشیریۃ: ۱۹۴)

’’جب میں نے اپنے دل کو اپنے رب کے ساتھ راضی پاؤں تو میں سمجھ جاؤں گا کہ اللہ مجھ سے راضی ہے۔‘‘

گویا خدا کی رضا کی کسوٹی اور پہچان یہ ہوئی کہ بندہ اپنے معاملات کی طرف نگاہ ڈالے اور اپنے دل سے سوال کرے کہ کیا وہ اپنے رب سے راضی ہے۔ اس طرح خدا اور بندے کی رضا باہم مربوط اور لازم و ملزوم ہے۔ اس دوگونہ تعلق میں تاہم یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ رب کی رضا اپنے بندے کے معاملے میں بہرحال مقدم ہے اور جب تک وہ راضی نہ ہوگا، بندے کا رب کی رضا کے بارے میں مطمئن ہونا ممکن نہیں ہے اور بندے کی رضا اپنے رب سے لامحالہ موخر ہوگی۔ قرآن حکیم نے اس تصور کو راضیة مرضیة کے بلیغ الفاظ سے اجاگر کیا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ جب تک خدا کی ذات بندے کی تلاش و جستجو اور طلب کا محور تھی، اس بندے کی حیثیت محبّ اور طالب کی تھی، لیکن جب وہ خود ذاتِ خداوندی کا محبوب و مطلوب بن گیا تو اسے خدا کے مرتضٰی (پسندیدہ) ہونے کا مقام نصیب ہوگیا، جس کی بنا پر وہ نہ صرف خدا بلکہ کائنات کا مدعا اور مقصود بن گیا۔ اس مقام پر خدا کی رضا قدم بہ قدم بندے کے شاملِ حال ہوگئی اور اسے زبان سے کچھ کہنے کی حاجت نہ رہی۔

جزو چہارم

جسم اور روح کی حقیقت

جسم اور روح کے بارے میں سائنس کا نقطہ نظر

جسم اور روح کے باہمی ارتباط کی توجیہہ جدید سائنسی نقطہ نظر سے کی جائے تو ہم سائنس کی اصطلاح میں جسم کو مادہ (Matter) اور روح کو توانائی (Energy) کا نام دے سکتے ہیں۔ مادہ اپنی تین حالتوں یعنی ٹھوس، مائع اور گیس پر مشتمل ہوتا ہے اور کثیف ہونے کے باوجود جب وہ ٹھوس سے مائع اور مائع سے گیس میں بدلتا ہے تو اس کی کثافت (Density) بتدریج گھٹنے لگتی ہے اور اس کی ماہیت میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ مادے کی ایک بنیادی خاصیت یہ ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے' اس کی مثال یوں ہے کہ برتن میں پانی مادے کی مائع حالت میں موجود ہے۔ برتن میں موجود پانی کو گرم کریں تو وہ حرارت سے بھاپ میں تبدیل ہو کر گیس کی شکل اختیار کرے گا اور پورے کمرے کی فضا میں پھیل جائے گا، جبکہ برتن میں وہ ایک محدود جگہ میں مقید تھا۔ پانی جب گرم ہو کر بھاپ یا گیس کی ہیت اختیار کر گیا تو وہ اپنی کثیف حالت سے لطیف حالت میں منتقل ہو گیا اور وہ اپنی اس حالت میں خالی جگہ میں پھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس عام اصول کے مطابق جب کوئی شے مائع سے ٹھوس حالت میں منتقل ہوتی ہے۔ تو اس کی کثافت میں نسبتاً اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ گھیرنے کی استعداد نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ یہ عام سائنسی مشاہدہ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ مادہ جس قدر کثیف ہو گا، وہ اتنا ہی محدود جگہ میں محصور ہو گا اور وہ جوں جوں لطیف ہوتا جائے گا، توں توں اس کا پھیلاؤ اور حصار بڑھتا چلا جائے گا۔ مادے کی ان تینوں مختلف حالتوں کے فرق سے اس کی کثافت و

لطافت کے فرق کا اندازہ ہو گیا۔ مادے اور توانائی کے فرق کو ایک مثال کے ذریعے سے سمجھ سکتے ہیں۔

فرض کریں کہ آپ کے منہ میں پانی موجود ہے، جسے آپ کلی کی صورت میں باہر نکالیں گے تو اس کا فاصلہ اور پھیلاؤ محدود ہو گا، کیونکہ پانی مادہ ہونے کی بنا پر نسبتاً محدود جگہ میں محصور رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس آپ کے منہ سے نکلنے والی آواز جو کہ توانائی کی ایک شکل ہے، دور تک جا رہی ہے اور اگر آپ لاؤڈ سپیکر استعمال کر رہے ہوں تو اس آلے کی مدد سے اس کے دائرہ اثر (Range) میں اور بھی اضافہ ہو گا۔ جسم اور روح کا تعلق اس سے گہری مماثلت رکھتا ہے، جسم مادی اور کثیف ہے، جبکہ روح غیر مادی لطیف وجود سے متشکل ہے اور وہ توانائی کی ناقابلِ بیان لطیف صورت ہے۔ اس پر مستزاد توانائی کی مختلف صورتیں، مثال کے طور پر آواز کے مقابلے میں روشنی بہت زیادہ طاقتور اور تیز رفتار ہے۔ وہ ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کر لیتی ہے، جبکہ آواز کی رفتار مختلف اور محدود ہے، وہ صرف گیارہ سو پچاس فٹ فی سیکنڈ کی رفتار رکھتی ہے۔ رات کی تاریکی میں بجلی کا ایک قمقمہ روشن ہوتے ہی آن واحد میں پورے کمرے کو روشن کر دیتا ہے۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی لامتناہی مسافتیں طے کر کے مختصر وقت میں کرۂ ارض کے وسیع و بسیط خطے کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ اس کے تقابل میں آواز باوجود محیر العقول سائنسی ایجادات و اکتشافات کے ایک حد سے آگے نہیں جا سکتی۔ ان مظاہر سے بدرجہا بڑھ کر روح توانائی کی وہ مافوق الادراک ما بعد الطبیعاتی صورت ہے، جس کے لئے قُرب و بُعد اور زمان و مکان کی حدود و قیود کی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

جسم اور روح کی بحث کا ماحاصل

اس ساری گفتگو کا ماحاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مادی جسم اپنی خلقت کے اعتبار سے پابند اور محدود ہے، جبکہ روح ایک فوق الادراک ما بعد الطبیعاتی حقیقت ہے، جس تک

عقل رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ انسانی شخصیت کی تعمیر میں روح کا کردار فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے، جب تک جسم پر بشریت کے اوصاف غالب رہیں، روح کمزور، مضمحل اور دبی دبی رہتی ہے اور نتیجتاً انسانی شخصیت میں بہیمیت اور حیوانیت کا عنصر غالب رہتا ہے، جس کے باعث وہ اعلیٰ اقدار کے جوہر سے محروم رہتی ہے، لیکن جیسے ہی جسم پر بشریت کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے، روح تقویت پا کر غالب اور مستحکم ہونے لگتی ہے اور انجام کار اس کی ملکوتی صفات جسمِ انسانی پر حاوی ہو جاتی ہیں، جس کے زیر اثر ایسے اوصاف کی حامل شخصیت سے وہ افعال صادر ہونے لگتے ہیں، جو روح کے تصرفات و کمالات کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔

روح کیا ہے؟

صحابہ کرامؓ جب روح کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں حضور نبی اکرم ﷺ سے سوال پوچھنے لگے تو قرآن نے ان کے استفسار کا جواب بڑے جامع اور مانع انداز سے دیا، ارشاد ربانی ہے:

وَ يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ

(القرآن، بنی اسرائیل، ۱۷:۸۵)

”اور یہ (کفار) آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے روح میرے رب کے امر سے ہے۔“

خدا تعالیٰ نے روح کو امر ربی کہہ کر انسان کو متنبہ کر دیا کہ وہ اس معاملے کو زیادہ نہ کریدے کہ اس سے زیادہ اس کے حیطہء اِدراک وفہم میں نہیں آ سکتا۔ لہٰذا اس کی شایانِ شان یہی ہے کہ روح کی ماورائی حقیقت کو فقط اپنے رب کا امر (حکم) سمجھنے پر اکتفا کرے، ورنہ وہ اپنی ناقص اور محدود عقل کے بل بوتے پر ایسی بھول بھلیوں میں پڑ جائے گا، جس سے نکلنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا

تزکیہ نفس کے توسط سے انسان اپنی بشریت کی گرفت اور تسلط سے آزاد ہو کر مولائی صفات کا حامل ہو جاتا ہے اور اس کی روحانی طاقت اِرتقاء کے مراحل طے کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچ جاتی ہے کہ فرشتے کو بھی اس کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں رہتی۔ اللہ کا بندہ جب روحانی مدارج کی بلندیوں کو پہنچتا ہے تو عالمِ ناسوت سے آگے عالمِ ملکوت بھی اس کے زیرِ نگیں آ جاتا ہے۔

بندۂ مولا کی صفات کے روحانی کمالات

اشرف المخلوقات ہونے کا تاج انسان کے زیبِ سر اس لئے کیا گیا کہ اس کے اندر اللہ رب العزت نے یہ صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں کہ وہ تزکیہ نفس اور تصفیہء باطن کے ذریعے وہ روحانی کمالات کی رفعتوں سے ہم کنار ہو جاتا ہے اور پھر اسے وہ قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ جس مثالی شکل میں چاہے مختلف مقامات پر ظاہر ہو سکتا ہے اور اس کے لئے مشرقین و مغربین کا بُعد کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی ذات خواہ وہ فرشتہ ہو یا انسان، اس کی اصل شکل و ہیئت تو ایک ہی رہتی ہے، لیکن اسے بیک وقت مختلف مقامات پر مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی جو قدرت حاصل ہو جاتی ہے، اسے تمثیلِ ارواح سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی یہ صفت جس سے انبیاء اولیاء اور اللہ کے محبوب و مقبول بندے متصف ہوتے ہیں، روح کے تصرفات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

مقبولانِ حق تزکیہ اور پیہم مجاہدے کی بدولت روحانیت کے اس درجے پر فائز ہو جاتے ہیں کہ وہ نفسانی خواہشات اور دنیاوی حاجات سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب سے متعدد اولیاءِ حق اور عرفائے کاملین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس برس تک عشاء کی نماز کے وضو سے نمازِ فجر ادا کی اور اپنے پہلوؤں کو بستر سے آشنا

نہ کیا۔ بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عمر بھر صائم الدہر رہے اور کھانے پینے سے بیگانہ، اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں ایک قول نقل کیا جاتا ہے:

اخبرنا الشيخ ابو عبدالله محمد بن احمد بن منظور الكنانى، قال: سمعت الشيخ العارف أبا عبدالله محمد بن أبى الفتح الهروى، يقول: خدمت سيدى الشيخ محى الدين عبدالقادر الجيلانیؓ أربعين سنة، فكان فى مدتها يصلى الصبح بوضؤ العشاء، و كان اذا أحدث جدد فى وقته وضوء وصلى ركعتين، و كان يصلى العشاء، و يدخل خلوته ولا يدخلها احد معه، ولا يخرج منها الاعند طلوع الفجر.

(ابوالحسن شطنوفی، بہجۃ الاسرار: ۸۵)

''ہمیں الشیخ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن منظور الکنانی نے بتایا، فرماتے ہیں کہ میں نے الشیخ العارف ابوعبداللہ محمد بن ابو الفتح الہروی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے اپنے شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی چالیس سال خدمت کی۔ آپؒ اس مدت میں عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے۔ جب وضوٹوٹتا تو اسی وقت وضو کی تجدید کرتے اور دو رکعتیں ادا کرتے اور عشاء کی نماز ادا کر کے خلوت کدہ میں تشریف لے جاتے۔ آپ کے ہمراہ کوئی بھی داخل نہ ہوتا اور آپ طلوع فجر کے وقت باہر تشریف لاتے۔''

ان سب خارق العادت افعال کی توجیہہ صرف اسی طرح کی جا سکتی ہے کہ ہر چند انسان کے زندہ رہنے کے لئے حوائج بشریہ لازم ٹھہرائے گئے۔ تاہم زندگی کی بقا کا انحصار روح پر ہے اور جسم کو اپنی حیات پر کلیتاً اختیار حاصل نہیں۔ اگر ایک فربہ اور طاقتور جسم کے اندر نحیف و کمزور روح برقرار رہ سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کمزور و لاغر جسم کے اندر توانا اور قوی روح زندہ نہ رہ سکے۔

جوں جوں کوئی بندۂ تقرب الی اللہ کا مقام حاصل کرتا ہے اور خدا کی محبت اس کے ریشے ریشے میں سما جاتی ہے، اس کی روح کی توانائیاں رفتہ رفتہ سارے جسم پر غالب ہو جاتی ہیں، جس کے پرتو سے شبستان روشن ہو جاتے ہیں اور سب تیرگیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ روح کی لطافت جب درجہ کمال کو پہنچتی ہے تو اس کے جسم کی کثافت بھی لطافت میں بدل جاتی ہے۔ اس کی مثال بجلی کے قمقمے کی سی ہے، جس پر شیشے کا شفاف (Transparent) خول ہوتا ہے جب اس کے اندر (Philment) میں برقی رو جاری ہوتی ہے تو اس کی روشنی صرف اندر ہی محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ خول سے باہر کمرے کی فضا کو بھی چاروں طرف روشن کر دیتی ہے۔

یہی حال روح کا ہے، جب وہ خدا کی نورانیت سے بہرہ ور ہو کر منور ہوتی ہے تو اس کی تابنا کی اسی طرح سب کو فیضیاب کرتی ہے، جس طرح آفتاب کا نور خاکدانِ تیرہ کے ذرے ذرے کو چمکا دیتا ہے۔ روح کی فیض رسانی کا سلسلہ عالم دنیوی تک ہی محدود نہیں، بلکہ جسم پر موت وارد ہو جانے کے بعد عالم برزخ اور عالم آخرت میں بھی اس کی تجلیاں جاری و ساری رہتی ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جسم کی قید سے آزاد ہونے کے بعد ایک بندۂ مومن کی روح اپنے اصل مرجع کی طرف لوٹ جاتی ہے، اور اس کی تابانیاں اور توانائیاں بدرجہا اتم بڑھ جاتی ہیں، اس طرح موت سے جو مذاق زندگی کی تجدید کا نام ہے، روح اپنے اصلی مکان اور گھر کی طرف مراجعت کر جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

کون کہتا ہے کہ مومن مر گئے؟
قید سے چھوٹے وہ اپنے گھر گئے

جسم کی قید سے رہائی کے بعد روح کا مقام

عالمِ ارواح کو خیر باد کہنے کے بعد روح انسانی جسم میں مقید ہو جاتی ہے اور اس زنداں میں زبانِ حال سے نالہ و فریاد کرتی رہتی ہے کہ جان چھوٹے اور وہ اپنے اصل

مقام کی طرف لوٹ جائے۔ اس کی حالت اس اسیر پرندے کی طرح ہوتی ہے، جو پنجرے میں رہائی کے انتظار میں اسیری کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہا ہوتا ہے، پھر جب مہلت ختم ہوتی ہے اور ''کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ'' کا اٹل قانون لاگو ہو جاتا ہے تو بندۂ مومن کی روح جسم کی قید سے آزاد ہونے کے بعد عالمِ بالا کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے، جبکہ اس کا جسم امانت کے طور پر سپردِ خاک کر دیا جاتا ہے اور وہ تا قیامت اسی حالت میں عالم برزخ میں رہتا ہے۔ روح پرواز کر کے عالمِ علیین کی طرف لوٹ جاتی ہے، مگر اس کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں جسم کے ساتھ بھی برقرار رہتا ہے۔ اس کی مثال آفتاب جہاں تاب کی طرح ہے جو کروڑوں میل کی مسافت سے پردۂ خاک میں پنہاں پودے کے بیج کو اپنی حرارت سے نمو بخشتا ہے اور اس کی قوتِ نامیہ کو جلا بخش کر پودے کو تناور شجر بننے میں مدد دیتا ہے۔ جس طرح سورج کی شعاعیں روئیدگانِ خاک کو نشوونما عطا کرتی ہیں، بعینہ روح اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ قبر میں پڑے ہوئے مومن کے جسم کو تروتازہ رکھتی ہے۔ یہ روح کا کرشمہ ہی ہے کہ انبیاء اور شہداء کے اجسام ان کی قبور میں زندہ ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام کا جسم زمین پر حرام کر دیا گیا ہے اور وہ اپنے مزارات میں اپنے جسموں کے ساتھ زندہ اور مشغولِ عبادت رہتے ہیں، جیسا کہ حدیث مبارکہ سے واضح ہے:

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن اللّٰہ حرم علی الارض أن تاکل أجساد الأنبیاء۔

(ابن ماجہ، السنن، ۱: ۳۴۵، کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیھا، باب فی فضل الجمعۃ، رقم: ۱۰۸۵)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے اجسام کو کھائیں۔''

تزکیہ روح کے لئے روزہ بہترین عمل

روح اور باطن کو ہر قسم کی آلائشوں سے مزکی اور مصفا کرنے کے لئے روزے سے بہتر اور کوئی عمل نہیں۔ یہی سبب تھا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کو اس عبادت سے اتنا

شغف تھا کہ آپ ﷺ اکثر روزے سے رہتے اور صیامِ وصال یعنی پے در پے بغیر افطار کئے روزے رکھتے۔ روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کی اتباع میں بعض صحابہ کرامؓ نے بھی صیام وصال رکھنے شروع کئے تو کمزوری سے ان کے چہرے پیلے پڑنے لگے اور ان کی حالت یہ ہوگئی کہ چلتے چلتے گر پڑتے۔ حضور ﷺ کو معاملہ کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ان سے ایسا کرنے کا سبب دریافت فرمایا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم آپ کی اتباع میں ایسا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کون میری مثل ہے؟ میرا حال تو یہ ہے کہ مجھے میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے، جیسا کہ احادیث نبوی کے الفاظ سے ظاہر ہے:

ان ابا هريرةؓ، قال: نهى رسول الله ﷺ عن الوصال فى الصوم، فقال: له رجل من المسلمين إنک تواصل يا رسول الله قال و أيكم مثلى إنى أبيت ربى يطعمنى و يسقينى

(بخاری، الصحیح، ۲:۶۹۴، کتاب الصوم، باب التنکیل لمن أکثر الوصال، رقم:۱۸۶۴)
(مسلم، الصحیح، ۲:۷۷۴، کتاب الصوم، باب النهی عن الوصال فی الصوم، رقم:۱۱۰۳)

''حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلسل اور پے در پے روزے رکھنے سے منع فرمایا تو ایک مسلمان نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ تو مسلسل روزے رکھتے ہیں۔ آقائے دوجہاں نے ارشاد فرمایا تم میں سے میری مثل کون ہے؟ میں تو رات اس حالت میں گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔''

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بعض اعمال خصوصی پیغمبرانہ امتیاز کے حامل ہیں اور وہ امت کے لئے قابل تقلید نہیں ہیں۔ بحیثیت شارع اسلام آپ ﷺ نے امت کو میانہ روی اور اعتدال کی راہ پر چلنے کی تلقین فرمائی۔

اس ساری بحث سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ تزکیہ روح اور تصفیہ باطن کا موثر ترین ذریعہ روزہ ہی ہے، جس سے محبوب حقیقی کا قرب و وصال نصیب ہوتا ہے اور

بندہ ان کیفیات و لذات سے آشنا ہوتا ہے، جن کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی کوئی شے پرکاہ کے برابر نہیں۔

فقر و فاقہ کی بنا پر اصحاب صفہؓ کا مقام

آنحضور ﷺ کے روحانی تربیت یافتگان میں ان اصحاب کو امتیازی مقام حاصل ہے، جنہیں ان کے زہد و ورع، تقویٰ وعبادت اور امور دینیہ میں خصوصی شغف کی بنا پر اصحاب صفہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یوں تو آقائے نامدار ﷺ کی حیات طیبہ سے اختیاری فقر کا رنگ جھلکتا تھا اور خانہ نبوت میں کئی کئی دن چولہا روشن نہیں ہوتا تھا اور محض کھجوروں اور سادہ پانی پر بسر اوقات ہوتی تھی، لیکن فقر مصطفوی ﷺ کی نمایاں چھاپ خصوصیات کے ساتھ اصحاب صفہؓ کی زندگیوں پر نظر آتی تھی۔ روایت میں ہے کہ مسلسل فاقوں کی وجہ سے بعض اوقات وہ اتنے لاغر اور کمزور ہو جاتے کہ باہر سے آنے والے اعرابی ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر لاعلمی کی بنا پر ان کا تمسخر اڑانے لگتے اور انہیں دیوانہ و فاتر العقل سمجھتے۔ حضور ﷺ نے ان بے خبروں سے مخاطب ہو کر خندۂ استہزا کا نشانہ بننے والے فاقہ مست اصحابؓ کی شان میں یوں ارشاد فرمایا:

لو تعلمون ما لکم عنداللہ لأحببتم ان تزدادوا فاقۃ و حاجۃ

(ترمذی، السنن، ۴:۵۸۳، کتاب الزہد، باب ما جاء فی معیشۃ أصحاب النبی، رقم:۲۳۶۸)

''اگر تمہیں علم ہو جائے کہ اللہ کے ہاں تمہارا کیا مقام ہے تو تم فاقہ و حاجت میں زیادتی پسند کرو۔''

روزے سے فقر و فاقہ کی جو شان استغناء پیدا ہوتی ہے، وہ تونگری سے کہیں اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

اِضطراری و اِختیاری فقر میں فرق

مردانِ باصفا اور اہل طریقت کو خالی شکم رہنا بڑا اچھا لگتا ہے، لیکن یہاں یہ

بات ذہن میں رہے کہ ان کا یہ فقر اِضطراری نہیں بلکہ اِختیاری یعنی خود اختیار کردہ ہوتا ہے۔ شانِ فقر یہ ہے کہ دنیاوی مال و اسباب پر رسائی ہوتے ہوئے اس سے ہاتھ کھینچ لیا جائے اس ضمن میں ابن عساکرؒ نے حضرت امام حسنؓ کے بارے میں ایک روایت بیان کی ہے آپ لکھتے ہیں کہ:

ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ کے گھر میں کئی دن سے فقر و فاقہ کی کیفیت تھی۔ آپ کی ایک خادمہ سے یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اس کے پاس سونے کی ایک ڈلی تھی۔ وہ لے کر حضرت امام حسنؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی کہ اسے قبول فرمایئے اور اس سے اہل بیت کی خورد و نوش کی ضرورت کو پورا کیجئے۔ یہ سن کر حضرت امام حسنؓ نے زور سے پاؤں زمین پر مارا تو گھر میں موجود ہر چیز سونے کی دکھائی دینے لگی۔ آپ نے خادمہ سے کہا کہ اگر تو سمجھتی ہے کہ ہمارا فقر و فاقہ اضطراری ہے تو یہ تیری نادانی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو دنیا کا مال و متاع ہمارے قدموں میں ڈھیر ہو جائے، لیکن اے بے خبر! دنیا کی ہر چیز ہمارے نزدیک پرکاہ کی اہمیت نہیں رکھتی کہ ہمیں اپنے نانا جان ﷺ کی سنت بہرحال عزیز ہے۔

اب تک کی بحث میں تزکیہ نفس کے حوالے سے روزے کی حکمت و فلسفہ کا مختصر بیان ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کا حصول فقر اختیاری کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اس کے اثرات بندۂ مومن کی شخصیت پر انتہائی دوررس ہوتے ہیں۔ روزے سے فقر و فاقہ کی جو شان استغنا جنم لیتی ہے وہ تونگری سے کہیں اعلیٰ مقام رفعت کی حامل ہے۔

جزو پنجم

روزہ کی اقسام

(طبقات انسانی کے حوالے سے)

معاشی حیثیت اور سماجی مقام کے اعتبار سے معاشرے میں انسان چار طبقوں میں منقسم ہیں، جن کی ترتیب درج ذیل ہے:

پہلا طبقہ: عام انسانوں کا ہے جسے عرف عام میں عوام الناس کہا جاتا ہے۔

دوسرا طبقہ: عام لوگوں میں ان کا ہے جو خاص مرتبہ اور حیثیت کے مالک ہیں انہیں خواص العام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ: ان لوگوں کا ہے جو خاص لوگوں میں امتیازی اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں انہیں خواص الخواص سے موسوم کیا جاتا ہے۔

چوتھا طبقہ: یہ طبقہ ان اشخاص پر مشتمل ہے جو خواص میں بھی منتخب اور برگزیدہ ہوتے ہیں انہیں اخص الخواص کا نام دیا جاتا ہے۔

جس طرح معاشرتی سطح پر عام انسانی زندگی میں متذکرہ بالا چار گروہ اور طبقات پائے جاتے ہیں اسی طرح دینی اور روحانی مدارج اور مقامات کے لحاظ سے روزہ بھی اپنی نوعیت میں چار قسموں پر مشتمل ہے، ان کا ذکر فرداً فرداً ذیل میں آ رہا ہے۔

ا۔ عوام کا روزہ

وہ لوگ جو محض رسماً روزہ رکھتے ہیں اور ان کا روزہ سحری و افطاری تک محدود

ہوتا ہے، جبکہ روزے کے آداب و شرائط کا مطلقاً لحاظ نہیں رکھتے چنانچہ اکثر و بیشتر حسب فرمان حضور نبی اکرم ﷺ سوائے بھوکے پیاسے رہنے کے ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ وہ لوگ جو روزہ رکھ کر احکام خداوندی کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہیں۔ جھوٹ، غیبت، دھوکہ، فریب دہی اور دیگر افعال قبیحہ کے ارتکاب کو اپنا معمول بنائے رکھتے ہیں، وہ روزے کے فیوض و برکات سے محروم رہتے ہیں اور نتیجہ خیزی کے اعتبار سے ان کا عمل صلوۃ و صیام بے روح ہوتا ہے۔ ایسا روزہ افراد ملت پر مثبت اور نفع بخش اثرات مرتب نہیں کر سکتا۔

۲- خواص العام کا روزہ

یہ ان لوگوں کا روزہ ہے، جو احکام خداوندی کی پاسداری کرتے ہیں اور حتی الوسع کبیرہ اور صغیرہ گناہوں سے اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ روزے سے ان کی سیرت و کردار میں تقویٰ کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی زندگیاں ''**لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ**'' کے فرمانِ ایزدی کی عملی تفسیر بن جاتی ہیں۔ تقویٰ کی بدولت ان کے شب و روز انقلاب آشنا ہو جاتے ہیں اور وہ ہر معاملے میں حرام و حلال کی تمیز کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ ایسا روزہ سرکارِ دوجہاں ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان کے اور عذاب دوزخ کے درمیان ڈھال بن جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے اس شخص کو بدبخت قرار دیا، جس نے ماہ صیام کو پایا لیکن اپنے لئے عذاب دوزخ سے رہائی کا سامان نہ کیا۔ یوں تو پورے کا پورا رمضان المبارک فضائل و برکات اور انعامات و نوازشات کا مہینہ ہے، لیکن بالتخصیص اس کے پہلے عشرے کو عشرۂ رحمت، دوسرے عشرے کو عشرۂ مغفرت اور تیسرے عشرے کو نار دوزخ سے رہائی کا عشرہ قرار دیا گیا ہے۔

اس ماہِ مبارک میں رحمتِ خداوندی اپنے بندوں کو بار بار پکارتی ہے اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ وہ اپنے گناہوں، سیاہ کاریوں اور فسق و فجور سے توبہ

کر کے اس کی بارگاہِ بے کس پناہ میں جھک جائیں۔ اس کی شانِ کریمی اپنے گناہ گار بندوں کو اپنے دامنِ عفو و رحمت میں ڈھانپنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔

رمضان المبارک کی یہ ساعتیں اپنے دامن میں برکتوں اور سعادتوں کا اتنا بڑا خزانہ لئے ہوئے ہیں کہ وہ شخص جو ان سے بہرہ یاب نہیں ہوتا، اسے سوائے بدبخت اور حرمانِ نصیب کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

۳۔ خواص الخاص کا روزہ

خواص الخاص کا شمار ان لوگوں میں ہے، جن کی زندگیاں نہ صرف تقویٰ کے رنگ میں یکسر رنگی ہوتی ہیں، بلکہ وہ اس پر مستزاد نفس کی ساری خواہشوں کو پامال کر دیتے ہیں۔ یہ عرفائے کاملین اور اولیائے عظام کا روزہ ہے۔

حضرت خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ سے کسی نے ان کے روزے کے مقام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا ''روزہ مجاہدہ ہے۔'' پوچھا گیا کہ مجاہدہ کیا ہے؟ تو فرمانے لگے:

''مجاهده ایں است که هر چه نفس آرزو کند تا بیست سال آں آرزو بدو نرساند

(تذکرہ حضرت بہاؤالدین زکریا: ۳۷۔۳۸)

''مجاہدہ یہ ہے کہ نفس جس چیز کی خواہش کرے اسے بیس سال تک پورا نہ کیا جائے۔''

اور پھر اس کی مزید توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ

جس مجاہدے کا میں نے ذکر کیا ہے وہ میرے نزدیک سوائے ابتدائی مرحلے کے اور کچھ اہمیت نہیں رکھتا ورنہ مردانِ خدا تو ستر سال تک نفس کو خواب اور آب و طعام کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتے۔

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے اس مقام کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

وَ نَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰیO فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰیO

(القرآن، النازعات، ۷۹:۴۱-۴۰)

''اور (اپنے) نفس کو (بری) خواہشات وشہوات سے باز رکھا تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانہ ہوگا۔''

سیدنا عمرؓ کے زمانے میں ایک صالح نوجوان کا واقعہ امام بیہقیؒ نے یوں نقل فرمایا ہے:

كان شاب على عهد عمر بن الخطابؓ يلازم المسجد والعبادة، فعشقته جارية، فاتته في خلوة، فكلمته، فحدث نفسه بذلك فشهق فغشي عليه، فجاء عم له، فحمله إلى بيته، فلما أفاق قال: يا عم إنطلق إلى عمر فأقرِئه مني السلام، و قل له ما جزأ من خاف مقام ربه؟ فانطلق عمه فأخبر عمر، وقد شهق الفتى شهقة أخرى، فمات منها فوقف عليه عمر فقال: لك جنتان، لك جنتان

(بیہقی، شعب الایمان، ۱:۴۶۸، رقم: ۷۳۶)

''سیدنا عمرؓ کے زمانے میں ایک صالح نوجوان تھا جو ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ اسے ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ وہ تنہائی میں اسے ملا اور اس سے گفتگو کی اچانک خوف خدا کی وجہ سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی اور وہ بیہوش ہو گیا۔ اس کا چچا اسے اٹھا کر گھر لے گیا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے حضرت عمرؓ کے پاس لیجانے کا تقاضا کیا اور کہا کہ انہیں میرا سلام کہیں اور ان سے پوچھیں کہ جو آدمی رب سے ڈر جاتا ہے اس کی کیا جزا ہے۔ اس کا چچا اسے حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا اور انہیں ساری بات بتائی۔ نوجوان کو دوبارہ

کپکپی طاری ہوئی اور اس نے چیخ ماری اور وہ فوت ہوگیا۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس کھڑے ہوئے اور دو مرتبہ یہ کہا کہ تیرے لئے دو جنتیں ہیں۔‘‘

تفاسیر میں بیان کیا جاتا ہے کہ آیت مبارکہ **ولمن خاف مقام ربہ جنتان** کا نزول بھی یہی واقعہ ہے۔

۴۔ اخص الخواص کا روزہ

یہ روزے کی آخری منزل ہے، جو ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جنہیں مقام مشاہدہ پر متمکن کیا گیا ہو۔ مقام مشاہدہ پر اللہ کا خاص بندہ سوائے ذاتِ خداوندی کے ہر شے کو بھول جاتا ہے اور اس کی طلب و آرزو کا محور اللہ کی رضا کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتا۔

شیخ ابو نجیب سہروردیؒ کے احوال میں منقول ہے کہ وہ حرمِ کعبہ کے اندر ایک دفعہ حالت مراقبہ میں تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام انہیں ملنے تشریف لائے، لیکن شیخ پر اس قدر یک گونہ و استغراق کا غلبہ تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام کی طرف ذرا توجہ نہ کی اور بدستور مشاہدۂ حق میں محو رہے چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد چلے گئے۔ حضرت کے بھتیجے نے جو خود بھی عارف باللہ تھے، شیخ سے مراقبہ کے بعد عرض کیا: چچا جان خواجہ خضر علیہ السلام کافی دیر تک آپ کے لئے کھڑے رہے، لیکن آپ نے نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور وہ واپس چلے گئے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

> ’’بداں کہ اگر خضر باز رفت باز خواهد آمد۔ اما آں وقت کہ باحق مشغول بودم اگر فوت شدے از کجا یافتم و ندامت آں تا قیامت بماندے‘‘

(تذکرہ حضرت بہاؤالدین زکریا: ۳۷۔۳۸)

بیٹا جان لے کہ اگر خواجہ خضر علیہ السلام واپس چلے گئے تو وہ دوبارہ آ جائیں گے، لیکن وقت کا وہ لمحہ جس میں، میں مشاہدۂ حق میں مشغول تھا، اگر فوت ہو جاتا تو

میں وہ کہاں پاتا اور اس کی ندامت قیامت تک مجھے رہتی۔

حضرت شیخ جنید بغدادی قدس سرہ سے منقول ہے:

"چہل سال است که بہشت بآں آراستگی وے برمن عرضه مے کنند ومن بچشم رغبت بوے نگاھے نمے کنم وسی سال است که دل خود راگم کرده ام و نخواسته ام که بمن باز و هند"

(تذکرہ حضرت بہاؤالدین زکریا: ۳۷۔۳۸)

چالیس سال سے بہشت کو میرے سامنے پوری آرائش کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، لیکن میں رغبت سے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالتا اور تیس سال سے میں اپنا دل کھو چکا ہوں اور نہیں چاہتا کہ دوبارہ مجھے واپس مل جائے۔

یہ مقامات ان لوگوں کے نفوس کے ہیں، جنہیں مجاہدے کی بناء پر مشاہدۂ ذات حق اور دیدار مصطفوی ﷺ کی نعمتوں سے بہرہ ور کیا گیا اور ان کے حصول میں روزے کا کافی عمل دخل ہے۔

جزوِ ششم

رمضان المبارک میں معمولاتِ نبوی ﷺ

رمضان المبارک کے ماہِ سعید میں حضور نبی اکرم ﷺ کے معمولاتِ عبادت و ریاضت میں عام دنوں کی نسبت کافی اضافہ ہو جاتا۔ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کی خشیت اور محبت اپنے عروج پر ہوتی۔ اسی شوق اور محبت میں آپ ﷺ راتوں کے قیام کو بھی بڑھا دیتے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے انہیں معمولات کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ہم بھی حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ پر عمل کر کے اس مہینے کی برکتوں اور سعادتوں کو لوٹ سکیں۔

معمولاتِ مصطفوی ﷺ کا اجمالی جائزہ

اجمالی طور پر حضور اکرم ﷺ کے معمولات رمضان المبارک کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

استقبالِ رمضان

۱۔صیامِ رمضان: اس سے مراد ماہ رمضان کے دوران اپنے اوپر روزوں کی پابندی کو لازم ٹھہرا لینا ہے۔

۲۔قیامِ رمضان: رمضان المبارک کی راتوں میں نماز تراویح، تسبیح و تہلیل اور کثرت سے ذکر و فکر میں مشغول رہنا۔

۳۔ختمِ قرآن: دورانِ ماہ رمضان المبارک مکمل قرآن پاک کی تلاوت کا معمول۔

۴۔اعتکاف: رمضان المبارک کے آخری عشرہ کے ایام بہ نیت اعتکاف مسجد میں

بیٹھنا۔

۵۔نمازِ تہجد: سال کے بقیہ مہینوں کی نسبت رمضان المبارک میں نماز تہجد کی ادائیگی میں زیادہ انہماک اور ذوق وشوق کا مظاہرہ۔

۶۔صدقہ و خیرات: حضور نبی اکرم ﷺ اس مہینے میں عام مہینوں کی نسبت صدقہ و خیرات بھی کثرت سے کیا کرتے تھے۔

ا۔صیامِ رمضان اور معمولاتِ نبوی ﷺ

حضور نبی اکرم ﷺ رمضان المبارک سے اتنی زیادہ محبت فرمایا کرتے تھے کہ اس کے پانے کی دعا اکثر کیا کرتے تھے۔ اور رمضان المبارک کا اہتمام ماہ شعبان میں ہی روزوں کی کثرت کے ساتھ ہو جاتا تھا۔

i۔حضور ﷺ کا دعا فرمانا

حضور نبی اکرم ﷺ ماہ رجب کے آغاز کے ساتھ ہی یہ دعا اکثر فرمایا کرتے تھے:

عن أنس بن مالک قال: کان رسول اللہ ﷺ إذا دخل رجب قال: اللھم بارک لنافی رجب و شعبان و بلغنا رمضان.

(احمد بن حنبل، المسند، ۱:۲۵۹، رقم: ۲۳۴۶)
(طبرانی، المعجم الاوسط، ۴:۱۸۹، رقم: ۳۹۳۹)
(ہیثمی، مجمع الزوائد، ۳:۱۴۰)
(سیوطی، الجامع الصغیر، ۱:۱۴۲، رقم: ۲۰۹)
(بیہقی، شعب الایمان، ۳:۳۷۵، رقم: ۳۸۱۵)

''حضرت انس بن مالک ؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا جب رجب المرجب کا مہینہ شروع ہوتا تو حضور نبی اکرم ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے

اللہ! ہمارے لئے رجب اور شعبان بابرکت بنا دے اور ہمیں رمضان نصیب فرما۔‘‘

ii- رمضان المبارک کا چاند دیکھنے پر خصوصی دعا

حضور نبی اکرم ﷺ رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر خصوصی دعا فرمایا کرتے تھے:

کان اذا رأى هلال رمضان قال: هلال رشد و خير، هلال رشد و خير أمنت بالذى خلقك.

(ابن ابی شیبہ، المصنف، ۱۰:۴۰۰، رقم: ۹۷۹۸)
(طبرانی، المعجم الاوسط، ۱:۲۱۲، رقم: ۳۱۳)

’’جب حضور نبی اکرم ﷺ رمضان المبارک کا چاند دیکھتے تو فرماتے: یہ چاند خیر و برکت کا ہے، یہ چاند خیر و برکت کا ہے۔ میں اس ذات پر ایمان رکھتا ہوں جس نے تجھے پیدا فرمایا۔‘‘

iii۔ رمضان المبارک کو خوش آمدید کہنا

حضور نبی اکرم ﷺ اس مبارک مہینے کا خوش آمدید کہہ کر استقبال کرتے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے سوالیہ انداز کے ذریعے صحابہ کرام سے رمضان المبارک کے استقبال کے بارے میں پوچھ کر اس مہینے کی برکت کو مزید واضح کیا۔ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو حضور ﷺ صحابہ کرام سے دریافت فرماتے:

ما ذا يستقبلكم و تستقبلون ثلاث مرات

(منذری، الترغیب والترھیب، ۲:۶۴، رقم: ۱۵۰۲)
(مقدسی، الاحادیث المختارہ، ۶:۱۱۹، رقم: ۲۱۱۳)

’’تم کس کا استقبال کر رہے ہو اور تمہارا کون استقبال کر رہا ہے۔(یہ الفاظ آپ

نے تین دفعہ فرمائے)۔‘‘

اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا کوئی وحی اترنے والی ہے یا کسی دشمن سے جنگ ہونے والی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

إن الله يغفر في أول ليلة من شهر رمضان لكل أهل هذه القبلة.

(منذری، الترغیب والترھیب، ۲:۶۴، رقم:۱۵۰۲)
(مقدسی، الاحادیث المختارہ، ۶:۱۱۹، رقم: ۲۱۱۳)

’’تم رمضان کا استقبال کر رہے ہو جس کی پہلی رات تمام اہل قبلہ کو معاف کر دیا جاتا ہے۔‘‘

iv- رمضان اور شعبان میں روزوں کا اتصال

حضور نبی اکرم ﷺ ماہ شعبان میں کثرت کے ساتھ روزے رکھ کر ماہ رمضان کی تیاری اور استقبال کیا کرتے تھے۔

عن عائشة قالت: كان أكثر صيامه سوى رمضان في شعبان.

(نسائی، السنن، ۱:۳۰۶، رقم:۲۱۷۹)
(طبرانی، المعجم الاوسط، ۲:۴۶۰، رقم:۱۷۹۴)
(طبرانی، المعجم الاوسط، ۹:۱۱۰، رقم: ۸۲۲۸)
(ہیثمی، مجمع الزوائد، ۳:۱۹۲)

’’حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ رمضان کے علاوہ صرف ماہ شعبان میں ہی کثرت کے ساتھ روزے رکھا کرتے تھے۔‘‘

اکثر اوقات حضور نبی اکرم ﷺ شعبان کے روزوں کو رمضان المبارک کے ساتھ ملا دیتے تھے۔

عن عائشة وأم سلمة قالتا: ما كان النبي ﷺ يصوم شهرا سوى

رمضان إلاشعبان فانه كان يصله برمضان

(طبرانی، المعجم الکبیر، ۲۳:۲۵۶، رقم: ۵۲۸)

''حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ رمضان کے علاوہ صرف شعبان میں ہی پورے ماہ کے روزے رکھا کرتے تھا، اس لئے کہ یہ رمضان کے ساتھ متصل ہے۔''

امام احمد بن حنبلؒ نے حضور نبی اکرم ﷺ کے اس عمل کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے:

عن أم سلمة قالت: ما رأيت رسول الله ﷺ يصوم شهرين متتابعين إلا أنه كان يصل شعبان برمضان

(نسائی، السنن، ۴:۱۵۰، کتاب الصوم، باب ذکر حدیث أبي سلمة فی ذلک، رقم: ۲۱۷۵)
(احمد بن حنبل، المسند، ۶:۳۰۰، ۲۶۶۰۴)

''حضرت عائشہ اور ام سلمہ فرماتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ رمضان کے علاوہ صرف شعبان میں ہی پورے ماہ کے روزے رکھا کرتے تھے اس لئے کہ یہ رمضان کے ساتھ متصل ہے۔''

۷۔ روزے میں سحری و افطاری کا معمول

رمضان المبارک میں پابندی کے ساتھ سحری و افطاری بے شمار فوائد اور فیوض و برکات کی حامل ہے۔ حضور ﷺ بالالتزام روزے کا آغاز سحری کے کھانے سے فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن أنس، قال قال: رسول الله ﷺ تسحروا فان فی السحور بركة

(بخاری، الصحیح، ۲:۶۷۸، کتاب الصوم، باب برکة السحور، رقم: ۱۸۲۳)

''حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سحری کھایا

کرو، کیونکہ سحری میں برکت ہے۔‘‘

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے اہل کتاب اور مسلمانوں کے روزے کے درمیان فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فصل ما بين صيامنا و صيام أهل الكتٰب أكلة السحر.

(مسلم، الصحیح، ۲:۷۷۰، کتاب الصیام، باب فضل السحور، رقم: ۱۰۹۶)

’’حضرت ابوقیس نے حضرت عمرو بن العاص سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں سحری کھانے کا فرق ہے۔‘‘

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن أبی سعيد الخدری قال قال: رسول الله ﷺ السحور كله بركة فلا تدعوه

(احمد بن حنبل، المسند، ۳:۱۲)

(منذری، الترغیب والترھیب، ۲:۹۰، رقم: ۱۶۲۳)

’’سحری سراپا برکت ہے اسے ترک نہ کیا کرو۔‘‘

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ سحری کرنے والے پر اللہ کی رحمتیں ہوتی ہیں۔

فإن الله و ملائكته يصلون على المستحرين

(احمد بن حنبل، المسند، ۳:۱۲)

(منذری، الترغیب والترھیب، ۲:۹۰، رقم: ۱۶۲۳)

’’اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سحری کرنے والوں پر اپنی رحمتیں نازل کرتے ہیں۔‘‘

روزے میں سحری کو بلاشبہ بہت اہم مقام حاصل ہے۔ روحانی فیوض و برکات سے قطع نظر سحری دن میں روزے کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔ حضور ﷺ نے امت کو

تلقین فرمائی ہے کہ سحری ضرور کھایا کرو، خواہ وہ پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ سحری آخری وقت میں تناول فرمایا کرتے تھے۔ گویا سحری کا آخری لمحات میں کھانا حضور ﷺ کی سنت ہے۔

برکت سے کیا مراد ہے؟

برکت سے مراد اجرِ عظیم ہے کیونکہ اس سے ایک تو سنت ادا ہوتی ہے اور دوسرا روزہ کے لئے قوت و طاقت مہیا ہوتی ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں برکت سے مراد دوسرے دن کے روزے کی قوت حاصل کرنا ہے۔

حدیث مبارکہ میں بھی اس فائدے کا ذکر ملتا ہے:

عن إبن عباس قال قال رسول الله ﷺ: إستعينوا بطعام السحر على صيام النهار و بالقيلولة النهار على قيام الليل

(ابن ماجہ، السنن، کتاب الصیام، باب ما جاء فی السحور، ۱:۵۴۰، رقم: ۱۶۹۳)

’’دن کو قیلولہ کرکے رات کی نماز کے لئے مدد حاصل کرو اور سحری کھا کر دن کے روزے کی قوت حاصل کرو۔‘‘

برکت سے مراد ثواب و اجر کی زیادتی ہے، کیونکہ سحری کھانا حضور ﷺ کی سنت ہے۔ امام نوویؒ سحری میں برکت کے فوائد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

و أما البركة التى فيه فظاهرة لأنه يقوى على الصيام و ينشط له و تحصل بسببه الرغبة فى الازدياء من الصيام و قيل لانه يتضمن الاسقيقاظ، والذكر و الدعاء فى ذالک الوقت الشريف و قت تنزل الرحمة و قبول الدعاء و الاستغفار

(نووی، شرح النووی علی صحیح مسلم، ۷:۲۰۶)

’’سحری میں برکت کی وجوہات ظاہر ہیں جیسا کہ یہ روزے کو تقویت دیتی ہے

اور اسے مضبوط کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے روزے میں زیادہ کام کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق رات کو جاگنے کے ساتھ ہے اور یہ وقت ذکر اور دعا کا ہوتا ہے جس میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور دعا اور استغفار کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔''

سحری کرنے میں تاخیر اور افطاری کرنے میں جلدی آنحضور ﷺ کا زندگی بھر معمول رہا۔ جس کے راوی حضرت سہل بن سعدؓ ہیں، وہ فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ ﷺ لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر

(مسلم، الصحیح، ۲:۷۷۱، کتاب الصیام، باب فضل السحور، رقم: ۱۰۹۸)

(ترمذی، السنن، ۳:۸۲، کتاب الصوم، باب ما جاء فی تعجیل الأفطار، رقم: ۶۹۹)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک وہ روزہ جلد افطار کرتے رہیں گے۔''

اسی طرح دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا سمع النداء أحدکم والاناء علی یدہ فلا یضعه حتی یقضی حاجته منه

(ابوداؤد، السنن، ۲:۳۰۴، کتاب الصوم، باب فی الرجل یسمع النداء والإناء علی یدہ، رقم: ۲۳۵۰)

''جب تم میں سے کوئی اذان سنے اور برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو اپنی ضرورت پوری کیے بغیر اسے نہ رکھے۔''

حدیث قدسی ہے کہ:

قال اللہ تعالی أحب عبادی إلی اعجلھم فطراً

(ترمذی، السنن، ۳:۸۲، کتاب الصوم، باب ما جاء فی تعجیل الأفطار، رقم: ۷۰۰)

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں میں مجھے پیارے وہ ہیں جو افطار میں جلدی کریں۔''

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس امت کے لوگوں میں یہ دونوں باتیں (یعنی افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرنا) رہیں گی تو اس وقت تک سنت کی پابندی کے باعث اور حدودِ شرع کی نگرانی کی وجہ سے خیریت اور بھلائی پر قائم رہیں گے۔

vi۔ سحری میں تاخیر

حضور نبی اکرم ﷺ سحری تناول فرمانے میں تاخیر کرتے یعنی طلوعِ فجر کے قریب سحری کرتے تھے۔

عن ابن عباسؓ قال قال: رسول الله ﷺ أمعاشر الأنبياء أمرنا أن تعجل أفطارنا ونؤخر سحورنا

(بیہقی، السنن الکبریٰ، ۴: ۲۳۸، رقم: ۷۹۱۴)

''حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہمیں (انبیاء کے گروہ کو) روزہ جلدی افطار کرنے اور سحری میں تاخیر کا حکم دیا گیا ہے۔''

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن سهل بن سعدؓ، قال قال رسول الله ﷺ: لا تزال أمتي على سنتي ما لم تنتظر يفطرها النجوم.

(ہیثمی، موارد الظمان، ۱: ۲۲۴، رقم: ۸۹۱)

''حضرت سہل بن سعد فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میری امت میری سنت پر اس وقت تک برابر قائم رہے گی، جب تک کہ وہ روزہ افطار کرنے کے لئے ستاروں کا انتظار نہ کرنے لگے گی۔''

آپ کا یہ عمل یہودیوں کے برعکس تھا، جن کے ہاں سحری کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا اور وہ افطاری کرنے کے معاملے میں آسمان پر ستاروں کے طلوع ہونے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ صحابہؓ کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ

آفتاب غروب ہوتے ہی افطاری سے فارغ ہو جاتے تھے۔

حضرت ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ سحری کھانے کی برکت کئی طرح سے حاصل ہوتی ہے، مثلا اتباع سنت، یہود و نصاری کی مخالفت، عبادت پر قوت حاصل کرنا، آمادگی عمل کی زیادتی، بھوک کے باعث جو بد خلقی پیدا ہوتی ہے، اسکی مدافعت سحری میں کئی حقداروں اور محتاجوں کو شریک کر لینا، جو اس وقت میسر آجاتے ہیں۔

علامہ ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں کہ روزے کا مقصد چونکہ پیٹ اور شرم گاہ کی خواہشات کو توڑنا اور درجہ اعتدال میں لانا ہے۔ لیکن اگر آدمی اتنا کھا جائے کہ جس سے روزے کے مقاصد پورے نہ ہوں، بلکہ ختم ہی ہو کر رہ جائیں تو یہ روزہ کی روح کے خلاف ہے۔ جبکہ عیش پسند لوگ ایسا کرتے ہیں کہ دن بھر کی کسر شام کو اور رات بھر کی کسر سحری کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

vii۔ حضور ﷺ کس چیز سے روزہ افطار فرماتے تھے

حضور ﷺ اکثر اوقات کھجوروں سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر وہ میسر نہ ہوتیں تو پانی سے افطار فرما لیتے تھے۔ حضرت سلیمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا أفطر أحدكم فليفطر على تمر فانه بركة فان لم يجد فليفطر على ماءٍ فانه طهور

(ترمذی، السنن، ۳:۴۶، کتاب الزکوۃ، باب ما جاء فی الصدقة علی ذی القربة، رقم: ۶۵۸)

''جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے چاہئے کہ کھجور سے کرے کیونکہ اس میں برکت ہے اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے کیونکہ پانی پاک ہوتا ہے۔''

حضور نبی اکرم ﷺ نے کھجور کو بہترین سحری قرار دیا:

عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: نعم سحور المؤمن

التمر

(ابوداؤد، السنن، ۲: ۳۰۳، کتاب الصوم، باب من سمی السحور الغداء، رقم: ۲۳۴۵)

''حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مومن کی بہترین سحری کھجور ہے۔''

ہمارے ہاں اکثر و بیشتر افطاری کے وقت عجیب مضحکہ خیز صورت نظر آتی ہے۔ یہ ہماری مجلسی زندگی کا خاصہ ہے، جو الا ماشاء اللہ افراتفری، بدنظمی اور ذہنی انتشار کی آئینہ دار ہے۔ اس کی ایک جھلک افطاری کے وقت بھی نظر آتی ہے۔ ادھر مغرب کی اذان بلند ہوئی، اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ شروع ہو گیا اور افطاری کے لئے بھاگ دوڑ مچ گئی۔ کوئی جلدی سے کھانے کی طرف لپک رہا ہے اور کلی کر کے مسجد کی طرف بھاگ رہا ہے۔ موذن کے اذان سے فارغ ہونے کے فوراً بعد مغرب کی نماز کھڑی ہو گئی۔ اس افراتفری میں افطاری کرنے والوں میں سے کسی کو دوسری اور کسی کو آخری رکعت میں جماعت ملی۔ بدنظمی اور عدم توازن پر مبنی یہ صورت حال ہماری کج فہمی کی پیداوار ہے، ہم اپنی لاعلمی کی بنا پر نماز مغرب میں غیر ضروری عجلت کو روا گردانتے ہیں، حالانکہ نماز کا وقت اتنا تنگ بھی نہیں، جتنا ہم سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم دس پندرہ منٹ افطاری کے لئے دیں اور پھر اطمینان اور یکسوئی سے نماز مغرب باجماعت ادا کریں۔ اتنا وقفہ کرنے سے نماز مکروہ نہیں ہو گی۔ فقہی اعتبار سے نماز مغرب کا وقت گرما و سرما کے موسموں کے تفاوت کے پیش نظر سوا گھنٹے سے ڈیڑھ گھنٹے تک رہتا ہے۔ یہ اس کی آخری حد ہے اور اس کے بعد عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے، لہٰذا مناسب اور احسن بات یہی ہے کہ چند منٹوں کے توقف کے بعد نماز مغرب کی جماعت کا اہتمام کیا جائے، تاکہ سب مسلمان آسانی سے شاملِ جماعت ہو سکیں۔

بھوک کی حالت میں طعام کو نماز پر فوقیت دینا

اسلام ایک سہل العمل دین ہے، جس میں ہر کس و ناکس کے لئے آسانیاں ہی آسانیاں ہیں، لیکن ایک ہم ہیں کہ اپنی کم فہمی اور نادانی کے باعث شریعت کی عطا کردہ

سہولتوں سے استفادہ نہیں کرتے اور خواہ مخواہ مشقت اٹھاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے امت کو نماز کے معاملے میں یہاں تک آسانی مرحمت فرما دی کہ اگر ایک طرف بھوک لگی ہو اور کھانے کے لئے دسترخوان بچھ گیا ہو اور دوسری طرف نماز کا وقت آن پہنچا ہو تو ایسی صورت میں کھانا کھانے کو ترجیح دی جائے اور تناول ماحضر کے بعد نماز ادا کی جائے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ بھوک کی حالت میں نماز میں وہ یکسوئی، انہماک، خشوع و خضوع اور طمانیت قلب نصیب نہیں ہوسکتی، جس کا حصول نماز کے باطنی آداب کا تقاضا ہے۔ ایسی نماز جس میں آپ بھوک کی شدت سے بے قرار ہوں اور دھیان بار بار دسترخوان کی طرف جا رہا ہو، ان کیفیات لذت و سرور سے کب آشنا ہوسکتی ہے، جو خدا کی بارگاہِ صمدیت میں محویت اور حضوریٔ قلب کا موجب ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ انسان پر شیطان ہمیشہ پیٹ کے راستے حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ حصولِ رزق کی کوششوں میں پریشانی سے فائدہ اٹھا کر اسے حرام کی طرف راغب کر دیتا ہے اور بھوک کے ہتھیار سے اسے شکار کر لیتا ہے۔ گویا رزق حرام کی راہ شیطان کی آماجگاہ ہوتی ہے، لہٰذا فکرِ معاش اور روزگار کی پریشانیوں سے نجات پا کر ہی عبادت کا حقیقی لطف اور کیف و سرور نصیب ہوتا ہے۔

بہترین عمل...... عمل مداومت

اسلام اعتدال اور توازن کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور وہ معاملات و عبادات میں افراط و تفریط کی روش اختیار کرنے کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتا۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو اسی راہ پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم فرمائی ہے۔ روایت میں ہے کہ ایک دفعہ چند صحابہؓ جن میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بھی تھے، صائم الدہر اور قائم الیل رہنے پر متفق ہو گئے۔ آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو حضرت عبداللہ بن عمرو کو طلب فرمایا، جو مکالمہ ہوا وہ انہی صحابی سے مروی حدیث پاک میں ملاحظہ فرمائیے:

قال لی رسول اللہ ﷺ یا عبداللہ ألم أخبر أنک تصوم الدھر و

تقوم اللیل فقلت بلی یا نبی اللہ ﷺ قال فلا تفعلن نم و قم و صم و أفطرفان لجسدک علیک حقاً و إن لعینک علیک حقاً و لضیفک علیک حقاً و إن لزورک علیک حقا لاصام من صام الدهر، صوم ثلاثة أیام من کل شهر صوم الدهر کله، صم کل شهر ثلاثة ایام

(مسلم، الصحیح، ۲:۸۱۷، کتاب الصیام، باب النهی عن صوم الدهر، رقم: ۱۱۵۹)

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا: اے عبداللہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ﷺ (ایسا ہی ہے)۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو (رات کو) قیام بھی کرو اور سوؤ بھی اس لئے کہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے، جس نے ہمیشہ کا روزہ رکھا اس نے (کوئی) روزہ نہیں رکھا، ہر ماہ کے تین روزے ہمیشہ کے روزوں کا ثواب رکھتے ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ تم ہر ماہ میں تین روزے رکھو۔''

ایک اور حدیث مبارکہ جسے حضرت ابن قیسؒ نے اپنے والد ماجد سے روایت کیا، اسی مضمون پر دلالت کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایامِ بیض یعنی چاند کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کے روزے رکھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا:

من صام من کل شهر ثلاثة ایام فذلک الدهر

(ترمذی، السنن، ۳:۱۳۵، کتاب الصوم، باب ما جاء فی صوم ثلاثة أیام من کل شهر، رقم: ۷۶۲)

جس نے ہر ماہ تین روزے رکھے، ایسا ہی ہے، جیسے وہ زندگی بھر روزے رکھنے والا ہو۔

آنحضرت ﷺ کے یہ حکمت آموز ارشادات عبادت میں میانہ روی اور

اعتدال کو ملحوظ رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ سب سے بہتر اور افضل عمل وہ ہے، جو خواہ مقدار میں تھوڑا ہی ہو، لیکن اسے پابندی وقت اور محافظت و مداومت کے ساتھ جاری رکھا جا سکے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أحب الامر إلی اللہ مادام علیہ صاحبہ، و إن قل

(مسلم، الصحیح، ۱: ۳۶۵، کتاب الصیام، باب صیام النبی ﷺ فی غیر رمضان، رقم: ۷۸۲)

''اللہ تعالی کی بارگاہ میں سب سے اچھا عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ قلیل ہو۔''

اسلام دین فطرت ہونے کے ناطے زندگی کے ہر معاملے میں نظم و ضبط (Discipline) پابندی وقت، (Punctuality) اور باقاعدگی (Regularity) پر زور دیتا ہے لیکن ہم نے اپنی کوتاہ نظری سے ان تصورات کو مغرب سے آئی ہوئی چیز سمجھ رکھا ہے، حالانکہ وہ اسلامی تعلیمات کا جزوِ لاینفک ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے دنیاوی اور دینی معاملات کو انہی تصورات کے سانچے میں ڈھالیں اور افراط و تفریط سے نجات حاصل کر کے دنیوی و اخروی کامیابیوں اور کامرانیوں سے بہرہ ور ہوں۔

۲۔ معمولِ قیامِ رمضان

آنحضرت ﷺ کا دوسرا مبارک معمول رمضان کی راتوں میں تواتر و کثرت کے ساتھ کھڑے رہنے اور نماز، تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی میں محویت سے عبارت ہے۔ نماز کی اجتماعی صورت جو ہمیں تراویح میں دکھائی دیتی ہے، اسی معمول کا حصہ تھی۔ حضور ﷺ نے رمضان المبارک میں قیام کرنے کی فضیلت کے باب میں ارشاد فرمایا:

فمن صامہ و قامہ ایماناً و احتسابا خرج من ذنوبہ کیوم ولدتہ امہ

(نسائی، السنن، ۴: ۱۵۸، کتاب الصیام، باب ذکر اختلاف یحیی بن أبی کثیر والنضر بن شیبان فیہ، رقم: ۲۲۰۹)

(ابن ماجہ، السنن، ۱: ۴۲۱، کتاب الصیام، باب ما جاء فی قیام شہر رمضان، رقم: ۱۳۲۸)

جس نے ایمان و احتساب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اور راتوں کو

قیام کیا وہ گناہوں سے اس دن کی طرح پاک ہو جاتا ہے، جس دن وہ بطنِ مادر سے پیدا ہوتے وقت تھا۔

اس ارشاد گرامی کی رو سے روزے کے آداب کی بجا آوری اور اس میں عبادت اور ذکر الٰہی کے لئے کھڑے رہنے سے انسان کے گناہ بارگاہ ایزدی کے عفو و کرم سے اس طرح مٹا دیئے جاتے ہیں، گویا وہ ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ رات کے قیام کے لئے جو محبوب عمل سنت نبوی سے ثابت ہے نماز تراویح ہے جس میں قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔

تراویح کی شرعی حیثیت

نماز تراویح کا سنت مؤکدہ ہونا نصِ حدیث سے ثابت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نماز تراویح مسجد میں باجماعت اور انفرادی طور پر گھر میں بھی ادا فرمائی اور یہ اس لئے کہ کہیں نماز تراویح ادا کرنا امت پر فرض نہ ہو جائے بصورت دیگر موجودہ نماز تراویح خلفائے راشدین کی سنت ہے، جس نے اجماعِ امت کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔

تراویح کا لغوی مفہوم

تراویح کا لفظ ''ترویحہ'' کی جمع ہے جس کا مادہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق راحت ہے۔ اگر تراویح کو راحت و آرام کے معنوں میں لیا جائے تو اس سے مراد وہ نماز ہو گی جسے آرام و اطمینان اور سکون سے ادا کیا جائے۔

لفظ تراویح کے ان لغوی معانی پر غور کر کے اگر ہم آج اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں تو ہماری نماز تراویح کی ادائیگی کی صورت کچھ اس طرح نظر آئے گی، گویا کوئی دشمن اپنی کمین گاہ سے ہم پر حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہو اور ہم انتہائی عجلت میں نماز تراویح سے فراغت حاصل کر کے اپنے گھروں کے عافیت کدوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ ہمارا یہ وطیرہ نماز تراویح کے معنوں سے ہرگز موافقت نہیں رکھتا۔

عربی لغت میں تراویح منتہی الجموع ہے جس سے بڑھ کر کوئی جمع نہیں ہوتی اور اس کا واحد ترویحہ ہے، جس سے مراد وہ وقفہ ہے جو چار رکعت ادا کرنے کے بعد تسبیح اور ذکر کے لئے رکھا گیا ہے۔ اس طرح بیس رکعت تراویح میں چار ترویحے ہوتے ہیں۔ اگر بیس رکعت کے بعد وتر کی نماز سے پہلے توقف کیا جائے تو کل پانچ ترویحے بنتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ چار ترویحے نماز کے اندر اور پانچواں ترویحہ وتروں سے پہلے ادا فرمایا کرتے تھے۔ ترویحے خواہ چار ہوں یا پانچ ان کا مقصد یہ ہے کہ روزے دار اس طرح بالاہتمام زیادہ سے زیادہ قیام اور عبادت ذوق وشوق سے کرسکیں اور رمضان المبارک کے فیوض و برکات سے متمتع ہوسکیں۔

رمضان المبارک میں قیام کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جتنا قیام تنہا اس مہینے کیا جاتا ہے، وہ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں نہیں ہوتا۔ اسی مناسبت سے اسے قیامِ رمضان سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ منشاء ایزدی اس سے یہ ہے کہ بندہ رمضان المبارک میں راتوں کی زیادہ سے زیادہ ساعتیں اس کے حضور عبادت اور ذکر وفکر میں گزارے اور اس کی رضا کا سامان مہیا کرے، لیکن ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم مختلف مساجد میں حفاظ کی رفتار تلاوت جانچتے ہیں اور اس مسجد میں نماز تراویح ادا کرتے ہیں، جس میں نماز سے جلد فراغت ہو سکے۔ ہم اس حقیقت سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں کہ قیامِ رمضان کا تقاضا ذکر و استغفار کی کثرت اور ذوق و شوق سے عبادت اور یاد الٰہی میں انہماک و استغراق ہے۔ رمضان المبارک کی رات کی ہر ساعت اتنی فضیلت اور قدر و منزلت کی حامل ہے کہ ہمارے لئے اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہم تراویح کی چار رکعتیں ادا کرنے کے بعد ایک مختصر وقفے کے لئے حالتِ تشہد میں رکتے ہیں اور بسرعت تمام تسبیحہ کے چند کلمات پڑھتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دو رکعت تراویح کی نیت سے شاملِ نماز ہو جاتے ہیں، جس میں امام نے قرأت کو جہاں سے چھوڑا تھا، شروع کر کے ایک مخصوص و متعین حصہ قرآن کا ختم کرتا ہے۔ اس سارے عمل میں قیام وسجود کے بعد ہم بمشکل آدھ منٹ تسبیح

تراویح کے لئے نکالتے ہیں۔ نماز تراویح کا صحیح اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ چار رکعت ادا کرنے کے بعد تراویح میں کم از کم اتنا وقت ضرور تسبیح و ذکر میں گزاریں جتنا وقت چار رکعتوں کی ادائیگی میں صرف ہوا ہے۔ صرف ایک ہی تسبیح کا مخصوص کر لینا ضروری نہیں، بلکہ اگر کسی کو وہ یاد نہ ہو تو وہ کوئی بھی تسبیح و استغفار، درود یا چند قرآنی آیات، جو یاد ہوں پڑھ سکتا ہے اگر کچھ بھی یاد نہ ہو تو محض خاموش بیٹھے رہنا بھی شاملِ عبادت متصور ہو گا۔

رمضان المبارک کی یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ ترویحہ میں خاموشی سے بیٹھنا بھی عبادت کا درجہ رکھتا ہے، لیکن یہ بات پیشِ نظر رہے کہ آرام و سکون سے بیٹھنے کے بغیر ترویحے کا عمل اپنی روح کے اعتبار سے نامکمل رہتا ہے۔ البتہ ہماری عجلت پسندی جو تیزی سے اٹھنے بیٹھنے سے عبارت ہے، تراویح کی روح کے منافی ہے۔

مقامِ تاسف ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دینی معاملات و عبادات میں ہمارا شغف اور جوش و ولولہ مضمحل اور کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ لوگ دور دراز سے بڑی جامع مسجد میں جوق در جوق نماز تراویح کے لئے چلے آتے تھے اور ان کا ذوق و شوق دیدنی ہوتا تھا، لیکن آج ہمارے قدم بادلِ نخواستہ مسجد کی طرف اٹھتے ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ رجحان غالب ہوتا ہے کہ نماز تراویح سے فارغ ہوتے ہی جلد از جلد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ نماز تراویح محض ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے گریبانوں میں جھانک کر اپنا محاسبہ کریں اور تراویح کے دوران زیادہ سے زیادہ تسبیح، ذکر و استغفار اور حضور ﷺ کی ذات پر درود و سلام بھیجیں اور خشوع و خضوع سے بارگاہ خداوندی میں اپنی گردن جھکا کر صدقِ دل سے گناہوں کی معافی مانگیں۔

۳۔ معمول ختم قرآن - ائمہ و علماء فقہ کی آراء کی روشنی میں

رمضان المبارک کے دوران نماز تراویح میں کم از کم ایک بار قرآن ختم کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم روزانہ کتنی مقدار میں پڑھا جائے؟ اس بارے میں ائمہ و علمائے فقہ کے فتاویٰ موجود ہیں۔ حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک فی رکعت تراویح میں کم از

کم دس آیات قرآنی کی تلاوت کی جائے۔قرآن پاک کی کل آیات تقریباً چھ ہزار ہیں اور ایک ماہ کے دوران ادا کردہ تراویح کی رکعتوں کی تعداد چھ سو بنتی ہے۔اس حساب سے اگر روزانہ دس سے بارہ آیتیں تلاوت کی جائیں تو بآسانی ماہ رمضان المبارک میں ایک قرآن ختم ہوسکتا ہے۔حضرت عمر فاروقؓ اس سے زیادہ قرآن پاک پڑھنے کے حق میں تھے اور وہ روزانہ بیس سے پچیس آیات تک تلاوت کرنے کے قائل تھے۔ بہرحال اس سے مقصود یہ ہے کہ حفاظ وقرأ کرام قرآن کریم کو اتنی مقدار میں نہ پڑھیں کہ ترتیل کے ساتھ تلاوت ممکن نہ رہے۔ قرأت میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ نماز تراویح کی جماعت میں بچے اور بوڑھے بھی شامل ہوتے ہیں۔اس بناء پر قرأت کو اتنا طول دینا ہرگز مناسب نہیں، جو ان کی برداشت سے باہر ہو جائے۔صرف اتنی مقدار پر کفایت کی جائے کہ ہر شخص اطمینان وسکون کے ساتھ نماز تراویح کے دوران قرأت کو سن سکے۔

جس طرح حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی کل جہاں کے لئے پیکرِ رحمت ہیں، اس طرح آپ ﷺ کا لایا ہوا دین بھی سراپا رحمت ہے، جس پر عمل کرنا امت کے ہر فرد کے لئے سہل اور آسان ہے لیکن ہم نے اپنی کم نظری اور کوتاہ اندیشی کی بنا پر اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اور کم وبیش ہر معاملے میں افراط وتفریط کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ رمضان المبارک میں ہمارے اندر عرصہ سے ایک غلط رجحان جڑ پکڑ رہا ہے کہ ہم بزعمِ خویش زیادہ سے زیادہ اجر وثواب کمانے کی غرض سے تراویح میں ایک سے زیادہ بار قرآن ختم کرنے کے رواج کو فروغ دے رہے ہیں جبکہ کچھ مقتدی بوجوہ طویل قرأت کے بوجھ کے متحمل نہیں ہوتے اور نتیجتاً عبادت میں ذوق وشوق پیدا ہونے کی بجائے لوگوں میں قرآن حکیم سے بے رغبتی بڑھنے لگی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ قرأت کی سماعت کرنا باعثِ اجر وثواب ہے لیکن اس شوق کو پورا کرنے کے لئے نماز تراویح کی بجائے خواہشمند حضرات کے لئے نوافل کی نماز کا اہتمام علیحدہ کیا جائے اور نماز تراویح میں صرف ایک بار قرآن سنایا جائے اور اس کی مقدار اتنی ہو کہ ہر شخص بغیر کسی

دشواری کے نماز تراویح میں بطیبِ خاطر شریک ہو سکے۔

رمضان وقرآن میں گہرا باہمی ربط وتعلق پایا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ

(القرآن، البقرة، ۲:۱۸۵)

رمضان کا مہینہ (وہ ہے) جس میں قرآن اتارا گیا ہے۔

آنحضور ﷺ کا دورانِ رمضان المبارک ایک بار ختمِ قرآن کا معمول تھا اور آپ ﷺ نے امت کو بھی اسی اعتدال پر چلنے کی تعلیم وتلقین فرمائی ہے۔ اسلام سادہ اور فطرت سے ہم آہنگ دین ہے اور تعلیماتِ مصطفوی ﷺ میں بھی اسی فطری سادگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے دین میں تنگی پیدا نہ کرو۔ اسی لئے ہر امتی کی سہولت کے پیشِ نظر آپ ﷺ ماہ صیام میں ایک بار قرآن پاک ختم کرنے کے معمول پر زندگی بھر کاربند رہے، ورنہ اگر آپ ﷺ چاہتے تو رمضان المبارک میں ہزارہا قرآن ختم کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ کے غلاموں کی یہ شان ہے کہ ملا علی قاریؒ مرقاۃ المفاتیح میں رقمطراز ہیں:

إن عليا كرم الله وجهه كان يبتدئ القرآن من ابتداء قصد ركوبه مع تحقق المبانی و تفهم المعانی و يختمه حين و ضع قدمه فی ركابه الثانی

(ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، ۵:۳۴۴)

''حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شانِ تلاوت یہ تھی کہ وہ گھوڑے کی ایک رکاب پر پاؤں رکھتے ہوئے تلاوت شروع کرتے اور قرأت کی تمام شرائط اور معانی و مفاہیم کی سمجھ کے ساتھ دوسری رکاب پر پاؤں رکھنے تک پورا قرآن ''والناس'' تک ختم کر ڈالتے۔'

جس کے غلام کی یہ شان ہو، اس آقا کی قدرت کی وسعت کا کیا عالم ہو گا لیکن

ہمارے آقا و مولا ﷺ کو اپنے کمزور امتیوں کا خیال تھا، جنہیں پریشانی اور تکلیف میں دیکھنا آپ ﷺ کو ہرگز گوارا نہ تھا۔

رمضان المبارک اور رسمِ شبینہ

رمضان المبارک میں نماز تراویح کے دوران ایک سے زیادہ بار ختم قرآن کرنا سنت نبوی ﷺ سے تعارض رکھتا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز تراویح میں صرف ایک بارقرآن ختم کیا جائے۔ شبینہ کرانے کی رسم جس کا رواج ان دنوں فروغ پکڑ رہا ہے، خلافِ سنت ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس سے لوگوں میں قرآن حکیم کے سننے سے گریز اور بے رغبتی کا رجحان تقویت پاتا ہے۔

آنخضرت ﷺ اپنے صحابہؓ کو دورانِ ماہ ایک ختم قرآن پر اِکتفا کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا معمول ہر روز ایک قرآن ختم کرنے کا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابی موصوف کو بلایا اورحسبِ دستور اس مہینے میں ایک قرآن ختم کرنے کی ہدایت فرمائی۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ مجھے اس سے زیادہ کی استطاعت ہے اور مجھے حافظِ قرآن ہونے کے پیشِ نظر زیادہ کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ آپ ﷺ نے اس کے زیادہ اصرار پر پہلے بیس دن، پھر دس دن اور آخر میں ہر سات دن کے بعد ایک قرآن ختم کرنے کی اجازت ان الفاظ میں عطا فرما دی:

اقرأه فی کل سبع

(احمد بن حنبل، المسند، ۲: ۱۶۳، رقم: ۶۵۱۶)

''سات دن میں ایک قرآن پڑھ لیا کرو۔''

اس سے یہ نکتہ بڑی صراحت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ایک دن میں قرآن مجید کے شبینے کرانے کا رواج صریحاً خلافِ سنت ہے۔

شبینہ کا صحیح طریقہ

بہرحال اگر شبینہ کرانا مقصود ہو تو حضور ﷺ کی سنت کے مطابق ختم قرآن کے لئے زیادہ سے زیادہ سات سے دس دن یا کم از کم تین رات کی محفل شبینہ کا اہتمام کیا جائے، لیکن اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ تلاوت کردہ قرآنی الفاظ کو سننے والے اس کی نشست و برخاست اور مطالب و معانی کے ساتھ سمجھ سکیں، نہ کہ رفتار اتنی تیز ہو کہ الفاظ گڈمڈ ہو جائیں اور سننے والے کے کچھ بھی پلے نہ پڑے۔

شبینہ میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال غلط، نامناسب اور بے جواز ہے اس لئے کہ قرآن مجید پڑھا جا رہا ہو تو اس کا سننا ہر ایک کے لئے فرض ہو جاتا ہے اور نہ سننے والا شریعت کی نظر میں گنہگار ٹھہرتا ہے لہٰذا مناسب اور دانشمندانہ بات یہ ہے کہ شبینہ کے لئے اول تو لاؤڈ سپیکر نہ لگایا جائے اور اگر اس کا استعمال ناگزیر ہو تو اس کے لئے اندرونی نظام (Internal Arrangement) ہو، تاکہ اس کی آواز مسجد کی چار دیواری سے باہر نہ جا سکے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال غیر ضروری اور بلاجواز کیا جاتا ہے۔ یہ عمل دین میں تصنع، ریاکاری اور دکھلاوے کے ذیل میں آتا ہے۔ اس رجحان کی حوصلہ شکنی از بس ضروری ہے۔

دینی امور میں اعتدال اور میانہ روی

آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو ہر معاملے میں جس کا تعلق دینی امور سے ہو یا دنیوی امور سے اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم فرمائی ہے۔ افراط و تفریط سے پاک طرز عمل اختیار کرنا آپ ﷺ کے نزدیک کتنی اہمیت رکھتا ہے، اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جو انتہائی دھیمی آواز میں اپنے معمول کے مطابق قرآن حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ رک گئے اور ان سے اتنی دھیمی آواز میں قرآن پڑھنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ وہ عرض کرنے لگے حضور ﷺ وہ ذات جس کی رضا اور خوشنودی مقصود ہے، سینے کے اندر

دل کی دھڑکن کی آواز بھی سن لیتی ہے، اس لئے میں قرأت آہستہ اور دھیمی آواز میں کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اپنے دیرینہ یارِ غمگسار سے ارشاد فرمایا ''اے ابوبکر تم اپنی آواز کو ذرا بلند کرلو۔، ، پھر حضور ﷺ کا گذر ایسے مقام سے ہوا، جہاں حضرت عمر فاروقؓ انتہائی بلند آواز میں تلاوت کلام پاک فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے اتنی بلند آواز میں تلاوت کی وجہ پوچھی تو انہوں نے عرض کیا کہ میں قرآن اس لئے بلند آواز سے پڑھتا ہوں تاکہ میری گونجدار آواز سے خوابِ غفلت میں مبتلا لوگ بیدار ہو جائیں اور ان کے کانوں میں دعوت حق کا آوازہ پڑ جائے۔ اس پر حضور ﷺ نے فاروق اعظمؓ کو اپنی آواز ذرا پست کر لینے کی ہدایت فرمائی۔

(المستدرک للحاکم، ۱:۳۱۰، رقم: ۱۱۶۸)

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام دین وسط ہے، جو ہر معاملے میں غلو سے پاک اور متوسط و متوازن طریق اور طرزِ عمل اختیار کرنے کا سبق دیتا ہے۔

دورانِ رمضان حضور ﷺ اور جبرائیل علیہ السلام کے دورۂ ختم قرآن کا معمول

صحیحین کی متفق علیہ حدیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر رمضان المبارک میں رات کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن پاک کا دور کرنے کے لئے آقائے دوجہاں ﷺ کے حجرہ مبارکہ میں تشریف لاتے۔ جہاں باری باری ان دونوں ہستیوں میں سے ایک کلام پاک کی تلاوت کرتی تو دوسری سماعت فرماتی۔ یہ معمول ہر رمضان میں جاری رہا، یہاں تک کہ وصال مبارک سے پہلے آخری رمضان آیا تو آپ ﷺ نے سابقہ معمول کے برعکس دو مرتبہ قرآن پاک کا دور جبرائیلؑ کی معیت میں فرمایا۔ حفاظ و قرأء کرام کی کتنی خوش قسمتی ہے کہ وہ دورانِ تراویح ہر رمضان میں قرأت اور سماعت کا فریضہ ادا کر کے بیک وقت آنحضور ﷺ اور جبرائیل علیہ السلام کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

۴۔ معمولِ تہجد

رمضان المبارک کے دوران حضور اکرم ﷺ کی نمازِ تہجد کی ادائیگی کے بارے میں معمول مبارک یہ تھا کہ آپ ﷺ نمازِ تہجد میں آٹھ رکعت ادا فرماتے، جس میں وتر شامل کر کے کل گیارہ رکعتیں بن جاتیں۔ تہجد کا یہی مسنون طریقہ آنحضور ﷺ سے منسوب ہے۔

بعض بزرگانِ دین کی طرف تہجد کی بارہ رکعتیں منسوب کی جاتی ہیں اور ان کی ادائیگی کی صورت کچھ اس طرح ہوتی تھی کہ بعض پہلی رکعت میں بارہ مرتبہ سورۂ اخلاص شروع کرتے اور بتدریج کم کرتے جاتے، یہاں تک کہ آخری رکعت میں ایک بار سورۂ اخلاص پر ختم کر دیتے۔ کوئی اس سے برعکس عمل شروع کر کے سورۂ اخلاص کی تعداد بڑھاتا چلا جاتا۔ بہرحال کسی بھی طریقہ کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، نماز ادا ہو جاتی ہے۔

ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ تہجد کے بارے میں آنحضور ﷺ سے مختلف طرزِ عمل کیوں اپنایا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کے معاملے میں سرکار دوجہاں ﷺ نے جس جس عمل کی تعلیم امت کو عطا فرمائی، اس میں سہولت اور آسانی کا پہلو مدنظر رکھا گیا ہے۔ تہجد میں رکعتوں کی کمی وبیشی کو وقت کی فراغت پر منحصر رکھا گیا ہے، اگر کسی کے پاس زیادہ وقت نہ ہو تو دوگانہ ادا کرے۔ وقت زیادہ ہونے کی صورت میں رکعتوں کی تعداد کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ بہرحال تہجد کی ادائیگی کی تاکید کی گئی ہے۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عليكم بقيام الليل فإنه دأب الصالحين قبلكم

(ترمذی، السنن، ۵:۵۵۲، کتاب الداعوت، باب فی دعاء النبی ﷺ، رقم: ۳۵۴۹)
(بیہقی، السنن الکبریٰ، ۲:۵۰۲، رقم: ۴۴۲۳)

تم پر رات کا قیام (نمازِ تہجد) لازمی ہے کیونکہ تم سے پہلے صالحین کا یہ عمل رہا ہے۔

فضائل نماز تہجد

نماز تہجد تمام نفلی نمازوں میں افضلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے آنحضور ﷺ نے فرمایا:

شرف المومن صلاته بالليل و استغناؤه فى ايدن الناس.

(سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، ۴: ۵۲۶، رقم: ۱۹۰۳)

مومن کی بزرگی قیام اللیل میں ہے اور عزت لوگوں سے استغناء میں ہے۔

نماز تہجد میں مداومت اختیار کرنے سے بندہ اپنے رب کی نظر میں وہ مقام و مرتبہ حاصل کر لیتا ہے کہ اسے عزت و وقار اور شانِ استغناء نصیب ہوتی ہے، جس کے صلے میں اسے دنیا میں کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی حاجت نہیں رہتی اور اس کی جبینِ نیاز آستانہ خداوندی کے سوا اور کسی در پر نہیں جھکتی۔ بندہ جب اپنے رب سے تعلق آشنائی محکم و پختہ تر کر لیتا ہے تو اس کی زندگی علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی عملی تفسیر بن جاتی ہے:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

راتوں کی تنہائی میں خدا سے راز و نیاز اور اس کے آگے گڑگڑا کر تضرع و زاری کے ساتھ دعائیں مانگنے سے بندہ دنیا سے مستغنی ہو جاتا ہے اور کسی فرعون کو خاطر میں نہیں لاتا۔ رسول مکرم ﷺ نے اپنی امت کے شب زندہ دار اور نماز تہجد کی خاطر قیام اللیل کرنے والوں کی شان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عن ابن عباسؓ، قال: قال رسول الله ﷺ: أشراف أمتى حملة القرآن و أصحاب الليل

(بیہقی، شعب الایمان، ۲: ۵۵۶، رقم: ۲۷۰۳)

میری امت کے برگزیدہ افراد وہ ہیں جو قرآن کو (اپنے سینوں میں) اٹھائے

ہوئے ہیں اور شب بیداری کرنے والے ہیں۔

امت مصطفوی ﷺ کے یہ پاک باز اور قدسی صفاتِ مردانِ باخدا ہیں، جن کے بارے میں اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَ طَاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا○

(القرآن، المزمل، ٧٣:٦)

بیشک رات کا اٹھنا نفس کو سختی سے روندتا ہے اور (وقتِ دعا دل و زبان کی یکسانیت کے ساتھ) سیدھی بات نکلتی ہے۔

ان نفوس قدسیہ کی راتیں یوں بسر ہوتی ہیں کہ ان کے پہلو شب کی خلوت میں بستروں سے الگ رہتے ہیں، جب دوسری خدائی خواب گراں کی لذتوں میں غلطاں ہوتی ہے، وہ اپنے رب کو منانے کے لئے اس کے حضور پیکر عجز و نیاز بنے گڑگڑا رہے ہوتے ہیں۔ موسم سرما کی ٹھنڈی راتوں میں نرم و گداز بستر کے آرام کو چھوڑ کر وہ اپنے نہاں خانہ دل کو ذکرِ الٰہی کے نور سے منور کرتے ہیں اور اس میں ایسی لذت و حلاوت پاتے ہیں، جو دنیا کے عیش و آرام اور آسائش و راحت میں نصیب نہیں ہوسکتی۔

رمضان المبارک کی راتوں میں حضور اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ نماز عشاء و تراویح ادا کرنے کے بعد سونے کے لئے تشریف لے جاتے، پھر رات کے کسی حصے میں نماز تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو بشمول وتر گیارہ رکعتیں نماز کی ادا فرماتے۔

نماز تہجد کے لئے نماز عشاء کے بعد کچھ سونا شرط اور مسنون ہے، یہی عمل افضل و مستحب ہے، جو سنتِ صحابہؓ اور سنتِ سلف صالحین سے ثابت ہے، بغیر نیند کے نماز تہجد کا ادا کرنا مکروہ ہے۔

تہجد کا لغوی مفہوم

''تہجد'' کا لفظ عربی لغت میں ''ہجود'' سے مشتق ہے جس کے معنی رات کو سونے کے آتے ہیں گویا تہجد وہ نماز ہے جو رات کے کسی حصے میں سونے کے بعد ادا کی جائے۔

اس کے لئے نیند کرنا شرط ہے، خواہ اس کا وقت تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ پس نیند کے بغیر جو نماز ادا کی جائے گی، وہ نوافل کے زمرے میں آئے گی، جس کا اپنا ثواب اور اجر ہے، لیکن اس نماز کو تہجد ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نمازِ تہجد کے اوقات

نماز تہجد کے لئے رات کا کوئی حصہ مخصوص و متعین نہیں۔ نماز عشاء کے بعد نیند کے لئے بستر پر چلے جائیں، خواہ وہ پندرہ منٹ کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ پھر آپ اٹھ کر نماز تہجد ادا کر سکتے ہیں۔ یہ خیال کہ تہجد صرف رات کے پچھلے حصے میں ہی ادا ہو سکتی ہے، کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں حضور اکرم ﷺ کی نماز تہجد کے بارے میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت نقل کرتے ہیں:

عن ابن عباسؓ، قال قال رسول الله ﷺ: من صلی رکعتین بعد عشاء الآخرة یقرأ بفاتحة الکتاب مرة (قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ) بنی الله له قصرین فی الجنة اهل الجنة

(سیوطی، الدارالمنثور، ٦: ۴١۵)
(فضائل القرآن لابن الضریس: ١١٦، رقم: ٢٧٠)

جو شخص آخر عشاء کے بعد دو رکعت اس طرح ادا کرے کہ ایک مرتبہ فاتحہ الکتاب اور بیس مرتبہ **قل هو الله احد** پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں دو محل بنائے گا، جن کا اہل جنت مشاہدہ کریں گے۔

یاد رہے کہ نماز تہجد کا وقت فجر تک رہتا ہے۔ حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اور ان کے تتبع میں اکثر بزرگانِ دین کا یہ معمول تھا کہ وہ نماز عشاء کے بعد سوتے اور پھر نصف شب کے بعد آخری حصے میں اٹھتے تھے۔ بعض بزرگوں کا نصف شب کے پہلے حصے میں نماز تہجد کا معمول بھی رہا ہے۔

۵۔ کثرتِ صدقات و خیرات

حضور نبی اکرم ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ وہ صدقہ و خیرات کثرت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ کوئی سوالی ان کے در سے خالی نہیں لوٹتا تھا لیکن رمضان المبارک میں صدقہ و خیرات کی مقدار باقی مہینوں کی نسبت اور زیادہ بڑھ جاتی۔ اس ماہ صدقہ و خیرات میں اتنی کثرت ہوجاتی کہ ہوا کے تیز جھونکے بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکتے حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ

فاذا لقيه جبريل عليه السلام كان رسول الله ﷺ أجود بالخير من الريح المرسلة

(بخاری، الصحیح، ۶۷۲:۲، کتاب الصوم، باب أجود ما کان النبی یکون فی رمضان، رقم: ۱۸۰۳)

جب جبریل امین آجاتے تو آپ ﷺ کی سخاوت کی برکات کا مقابلہ تیز ہوا نہ کر پاتی۔

حضرت جبریل علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام محبت لیکر آتے تھے۔ رمضان المبارک میں چونکہ عام دنوں کی نسبت کثرت سے آتے تھے۔ اس لئے حضور نبی اکرم ﷺ ان کے آنے کی خوشی میں صدقہ و خیرات بھی کثرت سے کرتے۔

جس کا تذکرہ امام نوویؒ یوں فرماتے ہیں:

و فی هذا الحديث فوائد منها بيان عظيم جوده ﷺ و منها استحباب أكثار الجود فی رمضان و منها زيادة الجود والخير عند ملاقاة الصالحين و عقب فراقهم للتأثر بلقائهم و منها استحباب مدارسة القرآن

(نووی، شرح النووی علی صحیح مسلم، ۶۹:۱۵)

اس حدیث پاک سے کئی فوائد اخذ ہوتے ہیں مثلاً (ا) آپ ﷺ کی جود وسخا

کا بیان، (۲) رمضان المبارک میں کثرت سے صدقہ و خیرات کے پسندیدہ عمل ہونے کا بیان، (۳) نیک بندوں کی ملاقات پر جود وسخا اور خیرات ہونے کا بیان، (۴) نیک بندوں سے ملنے کے بعد ان کی ملاقات کی خوشی میں صدقہ و خیرات، (۵) قرآن مجید کے شرح درس و تدریس کے لئے مدارس کے قیام کا جواز۔

۶۔معمول اعتکاف

رمضان المبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ بڑی باقاعدگی کے ساتھ اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ زیادہ تر آپ ﷺ آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے، کبھی کبھار آپ ﷺ نے پہلے اور دوسرے عشرے میں بھی اعتکاف فرمایا۔ لیکن جب حضور نبی کریم ﷺ کو مطلع کر دیا گیا کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرے میں ہے۔ اس کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ نے ہمیشہ آخری عشرے میں ہی اعتکاف فرمایا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ کے معمولِ اعتکاف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

ان النبی کان یعتکف العشر الآواخر من رمضان حتی توفاہ اللہ تعالیٰ

(بخاری، الصحیح، ۲:۷۱۳، کتاب الاعتکاف، باب الاعتکاف فی العشر الآوخر، رقم: ۱۹۲۲)

حضور نبی اکرم ﷺ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ آخری عشرہ کے علاوہ رمضان المبارک کے پہلے اور دوسرے عشرے میں بھی اعتکاف فرمایا:

عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال: أن رسول اللہ ﷺ إعتکف العشر الاول من رمضان ثم إعتکف العشر الاوسط فی قبة ترکیة علی

سدتها حصير قال: فاخذ الحصير بيده فنحاها فی ناحية القبة ثم أطلع راسه فكلم الناس فدنوا منه فقال: إنی اعتكفت العشر الاول ألتمس هذه الليلة ثم اعتكفت العشر الاوسط ثم أتيت فقيل لی: إنها فی العشر الآواخر فمن أحب منكم أن يعتكف فليعتكف

(مسلم، الصحیح، ۲: ۸۲۵، کتاب الصیام، باب فضل لیلۃ القدر والحث علی طلبھا، رقم: ۱۱۶۷)

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک کا پہلا عشرہ اعتکاف فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درمیانی عشرہ اعتکاف فرمایا اور یہ اعتکاف ایسے ترکی خیمہ میں تھا جس کے دروازے پر بطور پردہ چٹائی تھی جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مبارک ہاتھ سے پکڑ کر خیمہ کی طرف ہٹایا اور پھر اپنا سر اقدس نکال کر صحابہ کرام کو اپنے قریب آنے کے لئے فرمایا جب وہ قریب آ گئے تو فرمایا: میں نے لیلۃ القدر کی تلاش میں پہلا عشرہ اعتکاف کیا، پھر میں نے درمیانی عشرہ اعتکاف کیا، پھر مجھے بتایا گیا کہ وہ آخری عشرہ میں ہے اس لئے تم میں سے جو اعتکاف کرنا چاہتا ہے وہ (اس آخری عشرے کا) اعتکاف کرے۔

وصال مبارک کے سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیس دن اعتکاف فرمایا:

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال: كان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يعتكف فی كل رمضان عشرة أيام، فلما كان العام ألذی قبض فيه إعتكف عشرين يوماً

(بخاری، الصحیح، ۲: ۷۱۹، کتاب الإعتکاف، باب الإعتکاف فی العشر الأوسط من رمضان، رقم: ۱۹۳۹)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال رمضان المبارک میں دس دن تک اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ لیکن جس سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصال فرمایا اس سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیس دن تک معتکف رہے۔

اعتکاف میں انسان دنیاوی معاملات سے علیحدگی اختیار کرکے خدا کی رضا کی

تلاش میں گوشۂ تنہائی اختیار کرتا ہے۔ صوفیاء کرام اور اولیاء کرام حضور نبی اکرم ﷺ کی اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی میں چلہ کشی کے عمل کو اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ اس عمل کے ذریعے خدا کو راضی کرسکیں اور تزکیہ نفس کے مقام کو حاصل کرسکیں۔

جزوِ ہفتم

رمضان المبارک میں اکابر اسلاف کے معمولات

آج سے کچھ عرصہ قبل رمضان المبارک میں اہل مکہ اور اہل مدینہ کے معمولات نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے، لیکن امتدادِ زمانہ سے وہ سب اقدار زوال پذیر ہو چکی ہیں اور عبادت کا جوش و خروش قصہ ماضی بن چکا ہے۔

اہل مکہ کے معمولات رمضان المبارک

کتبِ تاریخ و سیر میں اہل مکہ کے معمولات رمضان المبارک کے باب میں ان کے نماز تراویح ادا کرنے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے، ان کا انداز یہ تھا کہ وہ ہر چار رکعت ادا کرنے کے بعد طوافِ کعبہ کرتے اور ہر طواف کے سات چکروں کے دوران تسبیحات پڑھتے اور طواف مکمل کرنے کے بعد مقامِ ابراہیم پر دوگانہ نفل ادا کرتے۔ اس طرح بیس تراویح کی رکعتوں کے ساتھ اضافی طور پر پانچ مرتبہ طواف و تسبیحات کے علاوہ دس رکعت نفل زائد ادا کرتے۔ اہل مکہ کا شغف عبادت اور والہانہ پن اپنی مثال آپ تھا۔

اہل مدینہ کے معمولات رمضان المبارک

اہل مدینہ کے معمولات رمضان کا ذکر امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے بطور خاص کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ ہر چار رکعت کے بعد کمال ذوق و شوق اور اطمینان و یکسوئی سے کلمات تسبیح و استغفار پڑھتے اور ہر ترویحے کے اختتام پر چار

رکعت نفل کا اضافہ کر لیتے۔ اس طرح وہ تراویح کی بیس رکعتوں کے علاوہ سولہ رکعت نفل اضافی طور پر ادا کر کے کل چھتیس رکعت ادا کرتے۔ کتبِ تاریخ میں ان کے اس عمل کو ستہ عشریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اہل مدینہ کے ان معمولات پر ایک طویل عرصہ تک ائمہ امت اور ان کے متبعین عمل پیرا رہے۔ وہ کتنا ایمان پرور اور بصیرت افروز منظر ہوگا، جب لوگ حضور اکرم ﷺ کے روضہ اطہر کے سامنے حضوری قلب اور والہانہ انہماک سے رات گئے تک عبادت اور ذکر وفکر میں مشغول رہتے ہوں گے۔

آہ! محفل سے پرانے بادہ کش رخصت ہوئے

افسوس صد افسوس کہ امتداد زمانہ کے ساتھ معاملہ کی بساط یکسر پلٹ چکی ہے۔ وہ سب معمولات جن کا ذکر اہل مکہ و اہل مدینہ کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ کے زمانے تک ان پر عمل ہوتا رہا، پھر اس کے بعد امت پر انحطاط و ادبار کے سائے چھانے لگے تو جہاں زندگی کے ہر شعبے میں بے عملی کا جمود اور نحوست طاری ہو گئی، وہاں عبادات و دینی معاملات میں وہ روحانی جوش، ذوق وولولہ اور انہماک و استغراق نہ رہا۔ نوافل اور دعا و مناجات ترک کر دینے کا رجحان عام پایا جاتا ہے۔ ہمارے واعظینِ قوم میں الا ماشاء اللہ وہ برقِ طبعی اور شعلہ مقالی نہیں اور ان میں کردار کا وہ جوہر نہیں، جو ہمارے اسلاف کا طرہ امتیاز تھا۔ اب دین محض ظواہر پرستی کا نام بن کر رہ گیا ہے اور بقول اقبالؒ:

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالیؓ نہ رہی

ہم میں عظمت وشوکت رفتہ کے سب آثار رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

نماز تراویح اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا معمول

خواتین بھی اگر نماز تراویح باجماعت ادا کرنا چاہیں تو وہ اپنے طور پر کسی قاری

کو مقرر کر کے اس کی اقتداء میں نماز ادا کر سکتی ہیں۔ اس ضمن میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنے غلام حضرت ذکوانؓ کی اقتداء میں نماز تراویح ادا فرمایا کرتی تھیں۔

ایک غلام کے پیچھے حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نماز ادا کرنا انسانیت کے لئے کتنا انقلاب آفریں درس ہے۔ اسلام نے آقائیت اور خواجگی کے تمام بت پاش پاش کر دیئے اور انسانی مساوات کی وہ روح پرور اور بصیرت افروز مثالیں پیش کیں کہ آج کی نام نہاد مہذب، متمدن اور ترقی یافتہ دنیا اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

رمضان المبارک میں ہمارا معمول ...... ایک لمحہ فکریہ

رمضان المبارک کی ہر ہر ساعت ہمارے لئے سعادتوں کی پیامبر اور خدائے ذوالجلال کی بے پایاں رحمتوں کی نوید بن کر آتی ہے، لیکن کیا ہم ان سے مستفیض ہو کر اپنے لئے اخروی نجات اور کامیابی کا توشہ و سامان فراہم کرتے ہیں؟ کیا ہم اس ماہ مقدس کے شب و روز کے سعید لمحوں کو غنیمت جان کر اپنی عاقبت سنوارنے کا اہتمام کرتے ہیں؟ ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانک کر سوچنا چاہیئے کہ ہم اس ماہ مبارک کا حق کہاں تک ادا کر پاتے ہیں۔

ہمیں اپنا یہ معمول بنانا چاہیئے کہ جب ہم سحری کے لئے بیدار ہوں تو باوضو ہو کر کچھ وقت نماز تہجد کی ادائیگی کے لئے نکالیں اور پھر پورا ماہ اس کی پابندی کے لئے کوشاں رہیں۔ کیا بعید ہے کہ اس مشق سے ہماری نماز تہجد کی عادت مداومت اختیار کر جائے اور ہماری بقیہ زندگی میں تہجد کا معمول اس قدر راسخ ہو جائے کہ پھر اسے ترک کرنے کا تصور بھی نہ ہو سکے۔

رمضان المبارک کو یہ شرف اور فضیلت حاصل ہے کہ نماز تراویح اور نماز تہجد کے درمیان سونے کا وقفہ بھی شامل عبادت تصور کر لیا جاتا ہے۔ گویا اس مقدس اور مبارک مہینے کی ہر ہر ساعت فیوض و برکات کی حامل ہو کر نامہ اعمال میں بطور عبادت لکھ دی جاتی ہے۔

نماز تہجد اور صلحائے امت

یوں تو نفلی عبادتیں اور بھی ہیں، جن کا اپنا درجہ ہے، لیکن قرب الٰہی کے اعتبار سے جو مقام نماز تہجد کو حاصل ہے وہ کسی بھی اور عبادت کو نصیب نہیں۔ جب ساری خدائی خواب شیریں کے مزے لے رہی ہوتی ہے تو اللہ کا بندہ محض اپنے رب کی رضا کے لئے رات کی نیند اور آرام کو چھوڑ کر بارگاہِ ایزدی میں قیام اور سجدہ ریزیاں کرتا ہے اور اپنے گناہوں اور لغزشوں کی بخشش و معافی کا طلب گار ہوتا ہے۔ خلوت کی ان ساعتوں میں بندے کو اپنے رب سے جو قرب نصیب ہوتا ہے، اس کا عشرعشیر بھی وقت کی کسی اور گھڑی میں نصیب نہیں ہوتا۔

حضور ﷺ صحابہؓ اور ان کے متبعین، جملہ اولیاء عرفا اور مشائخ کے ہاں شب بیداری اور نماز تہجد کی ادائیگی ہمیں اپنے نقطہ کمال پر نظر آتی ہے۔ اللہ کے ان سب برگزیدہ بندوں کے احوال میں مذکور ہے کہ وہ رات کو دیر تک نوافل اور نماز تہجد میں مشغول رہتے تھے۔ تہجد کے بغیر کوئی مقامِ ولایت پر فائز نہیں ہوسکتا اور جس کی تین تہجد نمازیں پے در پے قضا ہو جائیں، اس سے مقام ولایت سلب کر لیا جاتا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ پر خلافت کی ذمہ داریوں کا بار عظیم تھا۔ وہ دن بھر امور مملکت، رعایا کی خبر گیری اور ان کی حاجت برداری میں مصروف رہتے اور ان کی راتیں اپنے رب کے ذکر وفکر، قیام و سجود اور گریہ و زاری میں بسر ہوتیں۔ گویا نہ دن کو آرام اور نہ رات کو سکون و قرار نصیب ہوتا۔ کسی نے پوچھا حضرت شب و روز یہ اضطراب و التہاب اور بے سکونی و بے آرامی کس لئے؟ آپ کے جسم و جان کا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔

یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ فرمانے لگے اگر میں دن میں آرام کرنے لگوں تو رعایا کے حال سے بے خبر ہو جاؤں اور رات کو چین کی نیند سوؤں تو خدا کی یاد سے غافل قرار پاؤں۔ یہ دونوں حالتیں مجھے گوارا نہیں ہیں، اس لئے میرے دن خلق خدا کے لئے اور راتیں ذات کبریا کے لئے وقف ہیں۔

جزو ہشتم

روزہ کے احکام و مسائل

حکم الٰہی کے مطابق ماہ رمضان المبارک کے پورے روزے روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہیں۔ ان کی فرضیت سے انکار کرنے والا بالاتفاق کافر اور بغیر کسی معقول شرعی عذر کے نہ رکھنے والا سخت گنہگار اور حکم الٰہی کا نافرمان اور باغی متصور ہوتا ہے۔

روزے کے متعلق چند ضروری اور اہم مسائل و احکامات قارئین کے استفادے کے لئے درج ذیل ہیں۔

شرائط وجوب

روزہ جن شرائط کے ساتھ فرض ہوتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔مسلمان ہونا	۲۔ عاقل ہونا
۳۔ بالغ ہونا	۴۔تندرست ہونا
۵۔مقیم ہونا	۶۔عورت کا حیض و نفاس سے پاک ہونا

دوسرے لفظوں میں کافر، پاگل یا مجنون، بچے، بیمار، مسافر اور حائضہ پر روزہ فرض نہیں، تاآنکہ پاگل عقل مند، بچہ بالغ، بیمار صحتمند، مسافر مقیم اور حائضہ حالت پاکیزگی میں آ جائے۔

شرائطِ وجوبِ ادا

متذکرہ بالا صورتوں میں تین وجوہات ایسی ہیں جن کے رفع ہونے پر روزے

کی قضا رمضان کے بعد واجب ہو گی۔ عدمِ ادائیگی کی صورت میں ساری زندگی اس پر روزہ واجب رہے گا۔

۱۔ بیمار جب مکمل طور پر تندرست ہو جائے اور روزہ رکھنے کی استطاعت کا مالک ہو جائے۔

۲۔ مسافر جب سفر سے واپس آ جائے یا سفر کے بعد مقیم ہو جائے۔

۳۔ عورت جب حیض و نفاس سے حالت طہر میں آ جائے۔

روزہ نہ رکھنے کے شرعی عذر

جن مجبوریوں کے باعث شریعت نے رخصت دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو روزہ رکھے، ورنہ مجبوری کے اختتام پر قضا روزوں کو ادا کرے۔ عام طور پر واقع ہونے والے وہ بڑے بڑے عذر یہ ہیں:

۱۔ مرض یا بھوک و پیاس کی شدت

کوئی شخص کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے کہ روزہ رکھنے سے مرض کے بڑھ جانے کا خطرہ ہو یا پھر بھوک پیاس کی وجہ سے جان جانے کا خطرہ ہو۔ ان صورتوں میں دیندار اور مسلمان ڈاکٹر کی رائے ہی زیادہ قابلِ اعتبار ہو گی۔

۲۔ سفر

اس عذر کے لئے سفر کی مقدار وہی معتبر ہو گی، جس میں نماز کی قضا لازم آتی ہے۔ دورانِ سفر اگر روزہ باعث تکلیف نہ بنے تو روزہ رکھ لینا ہی افضل ہے۔

۳۔ کمزور، لاغر اور بوڑھا ہونا

کوئی شخص کسی وجہ سے اتنا کمزور یا بڑھاپے کی وجہ سے بہت زیادہ لاغر ہو اور اسے دوبارہ طاقت آنے کی امید بھی نہ ہو تو اس کے لئے رخصت ہے کہ وہ ہر روزے کے بدلے صدقہ فطر کی مقدار میں فدیہ دیتا رہے یا کسی فقیر مسکین وغیرہ کو پیٹ بھر کر دو وقت کا

کھانا کھلاتا رہے۔ معذور کو اس صورت میں یہ اختیار ہے کہ وہ یہ فدیہ شروع رمضان میں دے دے، ہر روز دیتا رہے یا آخر میں اکٹھا ادا کر دے۔

۴۔ عورت کا حاملہ ہونا یا دودھ پلانا

رمضان المبارک میں کوئی عورت اگر حاملہ ہو یا بچے کو دودھ پلاتی ہو اور روزہ رکھنے سے اسے یا بچے کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو تو وہ بھی روزہ قضا کر سکتی ہے۔

۵۔ جہاد میں شرکت

دشمن کے مقابلے میں لڑنا پڑے اور لڑائی میں حالت روزہ، کمزوری کی وجہ سے کسی رکاوٹ کا سبب بنے تو ایسے مجاہد کے لئے بھی رخصت ہے۔

ان تمام صورتوں میں معذور عورت یا مرد کو چاہئے کہ وہ سرعام کھانے پینے سے پرہیز کریں' کیونکہ اس سے رمضان المبارک کا تقدس پامال ہوتا۔

روزے کے ارکان

روزے کی شرعی اور اصطلاحی تعریف سے ہی اس کے ارکان کا تعین ہو جاتا ہے یعنی:

۱۔ نیتِ روزہ

۲۔ امساک یعنی کھانے پینے سے پرہیز کرنا اور مباشرت سے رکے رہنا

۳۔ سحری سے غروبِ آفتاب تک کے معین وقت کی پابندی

روزے کی نیت کے احکام

نیت دل کے ارادے کا نام ہے۔ روزے کی صحت کے لئے نیت سب سے اولیت رکھتی ہے، ورنہ کھانے پینے سے محض رکے رہنے سے ہرگز روزہ نہیں ہو گا۔

کتبِ فقہ میں روزوں کی مختلف اقسام بیان ہوئی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ رمضان کا روزہ

۲۔ نذرِ معین کا روزہ

۳۔ نفلی روزہ

ان کی نیت رات سے کر لیں تو افضل ہے، ورنہ نصف النہار سے قبل نیت کر لینا بھی درست ہو گا، لیکن ان اقسام کے روزوں کے علاوہ نیت کا صبح صادق سے پہلے کرنا ضروری ہے، مثلاً کفارہ کے روزے، قضا کے روزے اور نذرِ غیر معین کے روزے۔

- اگر نیت کے مسنون الفاظ دہرا لئے جائیں تو افضل ہے ورنہ اگر کوئی سحر کے وقت روزہ رکھنے کے لئے اٹھا اور کچھ کھا پی کر روزہ رکھ لیا تو یہی اس کی نیت ہے۔
- جمہور ائمہ کے نزدیک ہر روزے کی الگ نیت ضروری ہے۔ البتہ امام اعظمؒ کے نزدیک پورے رمضان المبارک میں پہلے روزے کی نیت کر لینا ہی کافی ہے بشرطیکہ پورے ماہ میں روزوں کا تسلسل قائم رہے۔
- روزہ کی حالت میں محض روزہ توڑنے کی نیت سے روزہ نہیں ٹوٹتا' جب تک کہ کچھ کھایا پیا نہ جائے۔
- اگر کوئی شخص رات کو روزہ کی نیت کر کے بعد میں اس نیت سے رجوع کر لے اور اگلے دن صبح سے شام تک کھائے پیئے بغیر رہا تو یہ اس کا روزہ نہیں ہے۔

نیت روزہ کے مسنون اور مختصر الفاظ یہ ہیں:

نویت بصوم غد للہ تعالی من شهر رمضان

''اللہ کے لئے ماہِ رمضان کے روزے کی میں نیت کرتا ہوں۔''

اگر رات کو نیت نہ کر سکے اور دن کو کرے تو یوں کہے:

نویت أن أصوم هذا الیوم للہ تعالی من شهر رمضان.

’’میں اللہ تعالیٰ کے لئے ماہِ رمضان کے اس دن کے روزے کی نیت کرتا ہوں۔‘‘

دن کو نیت کرنی پڑے تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو صبح صادق سے روزہ دار تصور کرے۔

سحری و افطاری کے احکام

۱۔ سحری کرنا یعنی صبح صادق سے قبل کچھ کھا پی لینا سنت ہے:

۲۔ سحری کا وقت تو نصف شب کے بعد شروع ہو جاتا ہے مگر افضل ترین سحری آخری حصہ شب کی ہے۔

۳۔ سحری میں تاخیر افضل ہے تو افطاری میں جلدی کرنا سنت ہے:

۴۔ افطاری میں بلاوجہ تاخیر کرنا مکروہ ہے۔

۵۔ افطاری میں عجلت سے مراد یہ نہیں کہ وقت سے پہلے ہی افطار کر لیا جائے اس پر احادیث میں سخت سزا کا ذکر آیا ہے۔

۶۔ روزہ کھجور، چھوہارے یا پانی سے افطار کرنا سنت ہے اور مستحب یہ ہے کہ تین، پانچ یا نو دانے کھائے۔

روزہ توڑنے والی چیزیں

۱۔ عمداً کھانے پینے یا جماع کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اگر بھول کر کھا پی لیا، جماع کر لیا تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۲۔ ہر قسم کی تمباکو نوشی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

۳۔ دانتوں میں رکی ہوئی چنے کے برابر یا اس سے کم چیز نکال کر کھا لی تو بھی روزہ جاتا رہا۔

۴۔ نتھنوں میں دوا چڑھائی یا کان میں تیل ڈالا یا دوائی، تیل وغیرہ حلق میں چلا گیا تو روزہ ٹوٹ گیا، لیکن سادہ پانی اگر کان میں چلا گیا، اس سے کلی وغیرہ چاہے جتنی کثرت سے کر لیں، بشرطیکہ حلق کے اندر نہ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۵۔ بلاقصد بھی اگر کلی کرتے ہوئے پانی حلق سے نیچے چلا گیا تو روزہ نہ رہا۔

۶۔ قصداً منہ بھر کر قے کی تو روزہ ٹوٹ گیا، بلااختیار اور بلا قصد قے ہوگئی تو (ا) اگر منہ بھر کر ہوئی اور کوئی قطرہ واپس حلق سے اتر گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا (ب) اگر منہ بھر کر نہیں ہوئی اور اس کے چند قطرے واپس چلے گئے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

۷۔ خون تھوک کے ساتھ پیٹ میں چلا گیا اور خون تھوک پر غالب تھا تو روزہ ٹوٹ گیا، ورنہ نہیں۔

۸۔ کنکری، لوہے کا ٹکڑا یا کسی ایسی چیز کا کھا لینا جو عام طور پر نہیں کھائی جاتی تو بھی روزہ ٹوٹ گیا۔

۹۔ منہ میں کوئی ایسی رنگین چیز رکھی جس سے تھوک پر اس چیز کا رنگ غالب آ گیا اور وہ تھوک اس نے نگل لی تو روزہ جاتا رہا۔

ماہ رمضان میں اگر اتفاق سے کسی کا روزہ ٹوٹ گیا تو روزہ ٹوٹنے کے بعد بھی کچھ کھائے پیئے نہیں، بلکہ سارا دن روزہ داروں کی طرح رہنا ضروری ہے۔

روزہ کے مکروہات

مندرجہ ذیل امور روزہ کے مکروہات ہیں:

۱۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، گالی گلوچ کرنا یا کسی کو تکلیف دینا۔

۲۔ روزہ دار کا کوئی چیز بلاوجہ زبان پر رکھ کر چبانا یا چبا کر اگل دینا وغیرہ۔

۳۔ قولاً یا عملاً جنسی رغبت اور شہوانی جذبات برانگیختہ کرنے والے امور۔

۴۔ روزہ کی حالت میں پانی چڑھانے یا کلی کرنے میں مبالغہ کرنا۔

۵۔ پیاس کی حالت میں پانی کے غرغرے کرنا' کیونکہ اس صورت سے روزہ ضائع ہونے کا قوی امکان ہے۔

علاوہ ازیں غسل کرنا، ٹھنڈا پانی سر پر ڈالنا، کلی کرنا، سادہ مسواک کرنا، سرمہ لگانا، بدن پر تیل ملنا، خوشبو لگانا یا سونگھنا مکروہات روزہ میں شمار نہیں ہوتے۔

روزہ توڑ ڈالنے کا کفارہ

کسی شرعی عذر کی وجہ سے رمضان کا روزہ یا کوئی دوسرا نفلی روزہ ٹوٹ گیا تو اس کی قضا لازم ہے، لیکن بلا عذر شرعی رمضان المبارک کا روزہ توڑنے پر قضا کے ساتھ کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ رمضان المبارک کے ایک روزے کا بدل تو سال بھر کے روزے بھی نہیں بن سکتے، لیکن شریعت نے اس کی کم از کم مقدار یہ مقرر کی ہے کہ وہ شخص لگاتار دو ماہ یعنی ساٹھ ایام کے روزے رکھے۔ اس میں تسلسل شرط ہے یا پھر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مساکین کو دونوں وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھلائے۔

جزو نہم

چند نفلی روزوں کی فضیلت

روزہ تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ ہے اس لئے اسلام نے فرض روزوں کے علاوہ مختلف ایام کے روزوں کی ترغیب بھی دی ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء وصلحاء کی زندگیوں کا معمول تھا کہ وہ فرض روزوں کے علاوہ زندگی بھر نفلی روزوں کا بطور خاص اہتمام کرتے۔ نفلی روزوں کی فضیلت کے پیش نظر درج ذیل سطور میں بعض روزوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صومِ عاشورہ

صومِ عاشورہ دسویں محرم کا روزہ ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ نویں محرم کا یا گیارہویں محرم کا بھی روزہ رکھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

أفضل الصیام، بعد رمضان، شھر اللہ المحرم۔

(مسلم، الصحیح، ۱:۸۲۱، کتاب الصوم، باب فضل صوم المحرم، رقم: ۱۱۶۳)

”رمضان المبارک کے بعد سب روزوں میں افضل اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں۔“

عن أبی قتادۃ الانصاری، سئل عن صوم یوم عآشوراء فقال یکفر السنۃ الماضیۃ

(مسلم، الصحیح، ۲:۸۱۹، کتاب الصیام، باب اِستحباب صیام ثلاثۃ أیام من کل شھر و صوم یوم عرفۃ و عاشوراء و الإثنین و الخمیس، رقم: ۱۱۶۲)

حضرت ابو قتادہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عاشورہ کے روزے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عاشورہ کا روزہ گزشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

صومِ عرفہ

یہ نویں ذوالحجہ کا روزہ ہے:

عن أبی قتادة الانصاری، سئل عن صوم یوم عرفة، قال یکفر السنة الماضیة والباقیة

(مسلم، الصحیح، ۲:۸۱۹، کتاب الصیام، باب اِستحباب صوم ثلاثة أیام من کل شهر وصوم یوم عرفة، رقم: ۱۱۶۲)

''حضرت ابوقتادہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ سے عرفہ کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عرفہ کا روزہ گزشتہ اور آئندہ سال (کے گناہوں) کے لئے کفارہ ہے۔''

عن أبی هریرة، أن رسول اللہ ﷺ: نهی عن صوم یوم عرفة بعرفة

(ابوداؤد، السنن، ۲:۳۲۶، کتاب الصیام، باب فی صوم عرفة بعرفة، رقم: ۲۴۴۰)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے عرفات میں عرفہ کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔

شوال کے چھ روزے

عن أبو أیوب الانصاریؓ، أن رسول اللہ ﷺ: قال من صام رمضان ثم أتبعه ستاً من شوال کان کصیام الدهر

(مسلم، الصحیح، ۲:۸۲۲، کتاب الصیام، باب اِستحباب صوم ستة أیام من شوال اِتباعا رمضان، رقم: ۱۱۶۴)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس

شخص نے رمضان المبارک کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو گویا اس نے زمانے بھر کے روزے رکھے۔

شعبان کا روزہ اور شب برأت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب شعبان کی پندرھویں رات (شب برأت) آئے تو اس رات میں قیام کرو یعنی نفلی نمازیں پڑھو اور دن میں روزہ رکھو کہ اللہ تعالی سورج ڈوبنے کے بعد سے آسمانِ دنیا پر خاص تجلی فرماتا ہے اور اعلان فرماتا ہے کہ کیا ہے کوئی بخشش کا طلبگار کہ میں اسے بخش دوں؟ کیا ہے کوئی روزی طلب کرنے والا کہ میں اسے روزی دوں؟ کیا ہے کوئی مصیبت میں گرفتار کہ میں اس کو رہائی دوں؟ کیا ہے کوئی ایسا؟ کیا ہے کوئی ایسا؟ اس قسم کی ندائیں ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔

ایامِ بیض کے روزے

ہر اسلامی مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخوں کے روزے ایام بیض کے روزے کہلاتے ہیں۔

عن أبی ذر قال: قال رسول الله ﷺ من صام من كل شهر ثلاثة أيام فذلك صيام الدهر

(ترمذی، السنن، ۳:۱۳۵، کتاب الصوم، باب ما جاء فی صوم ثلاثۃ أیام من کل شھر، رقم: ۷۶۲)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ہر مہینے کے تین روزے رکھے یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے اس نے ہمیشہ روزے رکھے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مہینے کے یہ روزے ایسے ہیں، جیسے کوئی ہمیشہ روزے رکھتا رہا ہو اور فرمایا کہ جس سے ہو سکے، ہر مہینے میں تین روزے رکھے۔ ہر روزہ دس دن کے گناہ مٹاتا ہے اور وہ شخص گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے پانی کپڑے

کو پاک کر دیتا ہے۔

قال کان رسول اللہ ﷺ لا یفطر أیام البیض فی حضر ولا سفر.

(نسائی، السنن، ۴:۱۹۸، کتاب الصیام، باب صوم النبی ﷺ، رقم: ۲۳۴۵)

''حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر اور حضر میں ایامِ بیض کے روزے رکھا کرتے تھے۔''

دوشنبہ اور جمعرات کا روزہ

عن أبی ہریرۃؓ، أن رسول اللہ ﷺ قال تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس فأحب أن یعرض عملی و أنا صائم

(ترمذی، السنن، ۳:۱۲۲، کتابن الصوم، باب ما جاء فی صوم یوم الاِثنین والخمیس، رقم: ۷۴۷)

''حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سوموار اور جمعرات کو اعمال (بارگاہ خداوندی میں) پیش کئے جاتے ہیں۔ میں پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال اس صورت میں پیش ہوں کہ میں روزہ سے ہوں۔''

عن أبی ہریرۃؓ قال قال: رسول اللہ ﷺ: أن یوم الاثنین والخمیس یغفر اللہ فیھما لکل مسلم إلا متھاجرین یقول دعھما حتی یصطلحا

(ابن ماجہ، السنن، ۱:۵۵۳، کتاب الصیام، باب صیام یوم الاِثنین والخمیس، رقم: ۱۷۴۰)

''حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سوموار اور جمعرات کے روز اللہ تعالی ہر مسلمان کی مغفرت فرماتا ہے، سوائے باہم لڑنے والوں کے، ان کے لئے حکم ہوتا ہے کہ انہیں چھوڑ دو تاوقتیکہ یہ دونوں صلح کر لیں۔''

بدھ، جمعرات و جمعہ کا روزہ

عن أنس بن مالک، أنه سمع النبی ﷺ یقول: من صام الأربعاء، والخمیس، والجمعة بنی الله له قصرا فی الجنة من لولؤ، ویا قوت، و زبر جد ، و کتب له براء ة من النار

(طبرانی، المعجم الاوسط، ۱:۸۷، رقم: ۲۵۴)

''حضرت انس بن مالک ص سے مروی ہے کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے بدھ، جمعرات اور جمعہ کا روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں موتی اور یاقوت و زبر جد کا محل بنائے گا اور اس کے لئے دوزخ سے برأت لکھ دی جائے گی۔''

صومِ داؤدی

سال بھر اس طرح روزے رکھنا کہ ایک دن روزہ دار رہے اور ایک دن بلا روزہ، صوم داؤدی کہلاتا ہے۔ یہ حضرت داؤدؑ کا روزہ تھا۔

عن عبدالله بن عمروؓ، یقول: قال رسول الله ﷺ أحب الصیام إلی الله تعالیٰ صیام داؤد کان یصوم یوماً و یفطر یوماً

(نسائی، السنن، ۴:۱۹۸، کتاب الصیام، باب صوم النبی الله داؤد علیہ السلام، رقم: ۲۳۴۴)

''حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کو روزوں میں داؤدی روزے سب سے زیادہ پسند ہیں وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن بغیر روزے کے رہتے تھے۔''

جزو دہم

حقیقتِ اعتکاف

وصالِ حق کے لئے تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کی خواہش ہر دور میں سعید روحوں کا شیوہ رہا ہے اور انسان اخلاقی و روحانی کمال کے حصول کے لئے مختلف نوعیت کی اضافی مشقتیں اور مجاہدات اپناتا چلا آیا ہے، چنانچہ حصولِ مقصد کی تگ و دو میں کبھی تو وہ جادۂ اعتدال پر گامزن رہا ہے اور کبھی افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے۔ وصالِ محبوب کی خاطر تزکیہ نفس کے لئے کی جانے والی مختلف النوع کاوشوں میں سے ایک مسلمہ طریق مخلوق سے بے رغبتی اور کنارہ کشی ہے، جس میں افراط کی معروف صورت رہبانیت ہے جو مختلف امم سابقہ کا شیوہ رہا ہے۔

رہبانیت کیا ہے؟

امِم سابقہ میں وصالِ حق کے متلاشیوں نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ معمولات حیات اور دنیاوی مشاغل و مصروفیات جاری رکھتے ہوئے اپنی منزل کو نہیں پا سکتے اور نفس کی غفلتیں اور سماجی ذمہ داریوں کی الجھنیں انہیں وہ محنت و مشقت اور مجاہدہ نہیں کرنے دیتیں، جو معرفتِ حق اور وصالِ محبوب کے لئے ضروری ہے تو انہوں نے لذّات نفسانی سے دستبرداری اور علائق دنیوی سے کنارہ کشی کی راہ اپنائی۔ سماجی ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے جنگلوں اور ویرانوں کا رخ کیا۔ بیوی، بچوں اور معاشرتی زندگی کی دیگر مصروفیات سے منہ موڑ کر غاروں کی خلوتوں اور جنگلوں کی تنہائیوں میں جا ڈیرہ لگایا اور وہیں رہ کر کثرتِ عبادت و مجاہدہ بلکہ نفس کشی کے ذریعے وصالِ حق کی جستجو کرنے لگے۔ قرآن نے ان کے اس تصورِ حیات کو رہبانیت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قرآن کی رو

سے یہ طرز زندگی وصال حق کی متلاشی روحوں نے ازخود اختیار کیا تھا۔ یہ طریقہ ان پر فرض نہیں کیا گیا تھا، ارشاد ہوتا ہے:

وَ رَهْبَانِيَّةَ نِابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○

(القرآن، الحدید، ۵۷:۲۷)

''اور رہبانیت جس کی ابتدا خود انہوں نے کی، ہم نے اس کو ان پر فرض نہ کیا تھا، مگر انہوں نے اسے اللہ کی رضا مندی کے لئے اختیار کیا، لیکن جس طرح اس کو نبھانا چاہئے تھا، نباہ نہ سکے پھر (بھی) ان میں جو ایمان لائے ہم نے ان کو اجر دیا اور ان میں سے اکثر (تو) نافرمان ہی ہیں۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دینِ عیسوی میں اصلاً رہبانیت فرض نہ کی گئی تھی بلکہ اس کا تعلیماتِ مسیح علیہ السلام میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ بعد کے لوگوں نے ازخود رضائے الٰہی کی خاطر زیادہ ریاضت و مجاہدہ اور عبادت و مشقت کی خاطر رہبانیت (ترکِ دنیا) کی صورت پیدا کر لی۔ چونکہ یہ کام بھی رضائے الٰہی کے نصب العین کے تحت کیا گیا تھا، اس لئے قرآنی بیان کے مطابق باری تعالیٰ نے اسے امرِ مستحسن سمجھ کر قبول کر لیا۔ اب ضروری تھا کہ رہبانیت کے جملہ تقاضے کماحقہ پورے کئے جاتے، تاکہ اس سے صحیح روحانی فائدہ میسر آتا' لیکن ان میں سے اکثر افراد بالالتزام ان تقاضوں کو پورا نہ کر سکے، اس لئے انہیں ''نافرمان'' قرار دیا گیا اور جنہوں نے اس کے تقاضوں کو صحیح طور پر پورا کیا' انہیں باری تعالیٰ نے اجر وثواب سے بہرہ ور کیا۔

گویا جب تک رہبانیت میں مقصدیت کارفرما رہی اسے گوارا کیا جاتا رہا، لیکن جب وہ بھی محض رسمِ دنیا بن کر رہ گئی، اس کی روح فوت ہوگئی اور وہ مقصدیت جس کی وجہ سے اسے گوارا کر لیا تھا' وہ پیش نظر نہ رہی تو اس کی افادیت بھی ختم ہو کر رہ گئی۔

ایک غور طلب نکتہ

یہاں ایک نکتہ جو قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن نے اس فعل کو کہیں حرام قرار نہیں دیا اور نہ ہی اسے کوئی ایسا فعل مذموم قرار دیا ہے، جس پر اللہ رب العزت کی نافرمانی لازم آتی ہو، بلکہ نہایت حکیمانہ انداز میں اس بات کی نشاندہی کی جا رہی ہے کہ ہم نے تو اس فعل کو گوارا بھی کر لیا تھا، لیکن محض اس لئے کہ اسے ہماری ہی رضا کے حصول کے لئے اپنایا گیا تھا اور ان لوگوں کا مقصود و مطلوب سوائے وصال حق کے اور کچھ نہ تھا لہٰذا ہم نے ان پر نہی وارد نہ کی۔ گویا رہبانیت فی نفسہ کوئی مذموم اور ناپسندیدہ شعار زندگی نہیں تھا۔

اسلام میں رہبانیت کا تصور

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا رهبانية فی الاسلام

(عجلونی، کشف الخفا، ۲:۵۱۰)

''اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔''

حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بالعموم یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ اسلام نے رہبانیت کی نفی کر دی ہے، یا اسلام میں رہبانیت نام کی کسی شے کا کوئی وجود نہیں۔ یہ استنباط اپنی جگہ درست ہے، لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو آپ ﷺ نے اپنے اس فرمان اقدس کے ذریعے نفس کشی کے بیجا ضابطوں سے نجات عطا کر کے اپنی امت کو ایک بہت بڑی نعمت سے بہرہ ور کر دیا ہے اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی زبان حال سے پوری امت کو یہ خوشخبری دے رہا ہے کہ اے شمع دین حق کے پروانو! تلاش حق کے راہ نوردو اور جلوہ محبوب کے متلاشیو! اب تمہیں اپنے محبوب کے دیدار و وصال کے لئے اپنی بیوی بچوں کو خیرباد کہنے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہیں حصولِ منزل کے لئے جنگلوں،

ویرانوں، غاروں کو اپنا مسکن بنانے کی حاجت نہیں۔ اب تمہیں تزکیۂ نفس اور تصفیہ باطن کے لئے معاشرتی زندگی اور سماجی ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی صورت میں ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہوتے ہوئے رہبانیت جیسی بے جا مشقتوں کے بوجھ سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی اتباع و اطاعت کے ذریعے اسی دنیا میں رہتے ہوئے، کاروبار زندگی کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے، بیوی بچوں اور دیگر افراد معاشرہ کے حقوق کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے وصالِ یار اور قربِ الٰہی کی منزل کو پا سکتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے رہبانیت کا نعم البدل اعتکاف کی صورت میں ہمیں عطا کر دیا ہے۔

اعتکاف کے ہوتے ہوئے ہمیں عبادت و ریاضت اور نفس کشی کے حصول کے لئے رہبانیت کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلام کا عمومی مزاج

اسلام دین فطرت ہے، جو انسان کے فطری داعیات اور نفسی مقتضیات کی رعایت رکھتے ہوئے ان کی تکمیل کے لئے حکیمانہ راہ تجویز کرتا ہے۔ اسلام اگر کسی چیز پر پابندی عائد کرتا ہے یا کسی تصور کو ختم کرتا ہے تو انسان کو اس کا بہتر بدل عطا کرتا ہے تاکہ اس تصور کی خوگر طبائع پر یہ تبدیلی گراں نہ گزرے اور اس تبدیلی کی نہ صرف افادیت مسلّم ہو جائے، بلکہ انسانی طبائع اس کی طرف بہ رغبت مائل بھی ہو۔

سود کا بدل......قرض حسنہ

مثال کے طور پر جب سودی لین دین جیسے انسانیت کش نظام کو معاشرے سے ختم کرنے کا ارادہ کیا گیا تو اس کے خاتمے سے پہلے زکوٰۃ و صدقات اور قرض حسنہ جیسے انسانیت پرور تصورات کو متعارف کرایا گیا اگر زکوٰۃ و صدقات اور قرض حسنہ جیسے انسان پرور نظام کو رائج کئے بغیر سود کی لعنت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی جاتی تو یقیناً مطلوبہ

نتائج برآمد نہ ہو سکتے۔

نشہ شراب کا بدل......نشہ شرابِ عشق الٰہی

اسلام نے شراب کو یکدم حرام قرار نہیں دیا، بلکہ اسلام جو دین فطرت ہے اور انسانی طبائع کی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہے، شراب پر بتدریج پابندی عائد کی اور اس وقت تک اسے کلیتًا حرام قرار نہیں دیا، جب تک کہ شراب کے نشہ اور کیف و سرور کے رسیا طبائع کو عشق الٰہی کے نشہ سے متعارف نہیں کرا دیا۔ جب تک ذکر الٰہی اور دیدار مصطفوی ﷺ کے نشے سے بہرہ ور نہیں کر دیا گیا اور لوگوں کو نشہ شراب کا نعم البدل عطا نہیں کر دیا گیا، شراب پر پابندی نہیں لگائی گئی۔

علی ہذا القیاس اسلام نے جن جن امور پر پابندی عائد کی ہے، فطرتِ انسانی کی مقتضیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کا بہتر بدل انسان کو عطا کر دیا ہے۔

ایک سوال

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام مذموم امور پر بھی اس وقت تک پابندی عائد نہیں کرتا، جب تک اس کا بہتر بدل مہیا نہیں کر دیتا، تو رہبانیت جو فی نفسہ اتنی ناپسندیدہ اور مذموم چیز نہیں تھی، بلکہ معرفتِ حق اور وصالِ الٰہی کی طلب سے عبارت ایک باقاعدہ نظامِ حیات تھا، جب اسلام اس پر پابندی عائد کر رہا ہے تو کیا اس کا کوئی نعم البدل نہیں دیا گیا ہو گا۔ اسلام کی حکیمانہ تعلیمات کے پیش نظر یہ ممکن ہی نہیں کہ اس نے رہبانیت کا بہتر بدل امت مسلمہ کو فراہم نہ کر دیا ہو اور وہ نعم البدل جو جادۂ حق کے متلاشیوں کو اسلام نے عطا کیا ہے ’’اعتکاف‘‘ ہے۔

حقیقتِ اعتکاف......خلوت نشینی

اعتکاف کی حقیقت خلوت نشینی ہے اور یہ رب العزت کا اپنے محبوب ﷺ کے

تصدق سے امتِ مصطفوی ﷺ پر خصوصی لطف و احسان ہے کہ وصالِ حق کی وہ منزل جو اممِ سابقہ کو زندگی بھر کی مشقتوں اور بے جا ریاضتوں کے نتیجے میں بھی حاصل نہیں ہوسکتی تھی، فقط چند روز کی خلوت نشینی سے میسر آ سکتی ہے چنانچہ اعتکاف کی حقیقت یہ ہے کہ انسان چند روز کے لئے علائقِ دنیوی سے کٹ کر گوشہ نشین ہو جائے۔ ایک محدود مدت کے لئے خلوت گزیں ہو کر اللہ کے ساتھ اپنے تعلقِ بندگی کی تجدید کر لے۔ اپنے من کو آلائشِ نفسانی سے علیحدہ کر کے اپنے خالق و مالک کے ذکر سے اپنے دل کی دنیا آباد کر لے۔ مخلوق سے آنکھیں بند کر کے اپنے خالق کی طرف لو لگا لے۔ ان کیفیات سے مملو ہو کر جب انسان دنیا و مافیہا سے کٹ کر صرف اپنے خالق و مالک کے ساتھ لو لگا لیتا ہے تو اس کے یہ چند ایام سالوں کی عبادت اور محنت و مشقت پر بھاری قرار پاتے ہیں۔

خلوت نشینی کیوں؟

سوال پیدا ہوتا ہے آخر خلوت نشینی کا فلسفہ کیا ہے؟ انسان آخر خلوت نشینی کیوں اختیار کرے؟ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان کا نفس انسان کو ہمہ وقت برائی کی طرف اکساتا رہتا ہے۔

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَ مَّارَةٌ بِالسُّوۡٓءِ

(القرآن، یوسف، ۱۲:۵۳)

''بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے۔''

ارشاد قرآنی کی رو سے تمرّد و انحراف انسانی نفس کا شیوہ اور اس کی فطرت میں شامل ہے چنانچہ کاروبارِ حیات کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے انسان بالعموم غفلتوں کا شکار رہتا ہے، نتیجتاً انسان میں کسی کا بندہ ہونے کا شعور بیدار نہیں رہتا اور انسان مسلسل بغاوت و سرکشی پر مائل رہتا ہے۔ اسی شعورِ بندگی کو بیدار کرنے کے لئے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اس امر کی تعلیم دی ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں تھوڑی دیر کے لئے گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور اپنے آپ کو ایک مجرم کی حیثیت سے اپنے

آ قا و مولا کی بارگاہ میں پیش کر کے اصلاح و احوال کا متمنی ہو۔ یہ معمول زندگی بھر رہنا چاہئے لیکن رمضان المبارک چونکہ خصوصی رحمتوں کا مہینہ ہے، اس لئے اس ماہِ رحمت میں خلوت نشینی کے اس تصور کو ایک باقاعدہ ضابطے کے تحت اعتکاف کی صورت میں متعین کر دیا گیا، تاکہ سال بھر علائق دنیوی میں ملوث رہنے والا انسان چند روز کے لئے اپنے نفس کے متمرّد اور سرکش گھوڑے کو لگام ڈال سکے، نیز کثرتِ ذکرِ الٰہی اور ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے تصفیۂ باطن کر کے خلوت میں جلوتِ محبوب کی دولت سے بہرہ ور ہو سکے۔

اعتکاف کی نیت کیا ہو؟ ایک ایمان افروز نکتہ

احوالِ نفس کے اختلاف کے پیش نظر اعتکاف کے لئے مختلف لوگوں کی نیت مختلف ہوسکتی ہے، مثلاً بعض لوگ اس نیت سے اعتکاف کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے ہو ائے نفس کو علائقِ دنیوی سے پاک اور مخلوق کے شر سے خود کو بچائیں گے۔ اس نیت سے خلوت نشینی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا گناہوں کا گھر ہے اور مخلوق کے ساتھ میل ملاپ سراسر گھاٹے کا سودا ہے، لہٰذا خود کو اس شر سے محفوظ کرنے کے لئے انسان کو خلوت گزیں ہو جانا چاہئے۔ یہ نیت بھی درست ہے، لیکن اس میں پنہاں ایک بہت بڑا فساد بجائے خود نفس کے لئے ایک بہت بڑے تمرّد اور سرکشی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس نیت سے اعتکاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا انسان نے خود کو دوسروں سے بہتر جانا اور اپنے نفس کو مخلوقِ خدا کے شر سے بچانے کے لئے گوشہ تنہائی میں چلا گیا۔ اعتکاف کے لئے بہترین نیت یہ ہے کہ انسان اعتکاف کرتے ہوئے یہ نیت کرے کہ میرا نفس فتنہ و فساد کی آماجگاہ اور شر کا پیکر ہے۔ اس میں ہر آن بغاوت و سرکشی کے میلانات سر اٹھاتے رہتے ہیں، کیوں نہ میں کچھ عرصہ کے لئے گوشہ نشین ہو جاؤں، تاکہ مخلوقِ خدا کچھ عرصہ کے لئے میرے نفس کی فتنہ سامانیوں اور اس کے شر کی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ رہ سکے۔

ایک دلچسپ حکایت

ایک مرتبہ ایک خلوت گزیں درویش سے کسی نے گوشہ نشینی کی وجہ دریافت کی تو

انہوں نے بتایا کہ ’’میرے پاس ایک کتا ہے‘ جو نہایت خطرناک ہے، میں اس کے شر سے لوگوں کو بچانے کے لئے خلوت نشیں ہو گیا ہوں۔‘‘ پوچھا گیا ’’وہ کتا کہاں ہے؟‘‘ انہوں نے فرمایا ’’میرا نفس۔‘‘

حقیقتِ نفس

نفسِ انسانی اپنی خلقت کے اعتبار سے بہیمانہ خصلتوں کی مرقع ہے۔ حرص و ہوا، لالچ و مفاد پرستی، غرور و تکبر، خودغرضی و خود پسندی، بغض، حسد، کینہ و عداوت، عیاری و مکاری، دجل وفریب وغیرہ، یہ سب نفس کے خصائل ہیں، جن سے انسان کو ہمہ وقت اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔ نفس کبھی عالم کو اپنے علم کے گھمنڈ پر اکساتا ہے، تو کبھی عبادت گزار کو کثرتِ مجاہدہ کے تکبر پر، کبھی کسی سخی کو سخاوت کے زعم میں مبتلا کر کے ہلاکتوں میں ڈالتا ہے تو کبھی کسی مجاہد کو خود پسندی کے فریب میں۔ غرضیکہ یہ ظالم ہمہ وقت انسان پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے اور ہر انسان پر اس کا حملہ اس کے حسبِ حال ہوتا ہے اور نیکو کاروں پر تو خود پسندی اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کے فتور کی صورت میں ایسے ہلاکت خیز حملے کرتا ہے کہ آنِ واحد میں انسان کا خرمنِ اعمال خاکستر ہو کر رہ جاتا ہے اور انسان کی مدتوں کی کمائی آناً فاناً لٹ کر رہ جاتی ہے۔ نفس کی ہلاکت خیزیوں کا یہ عالم ہے کہ انسان کبھی زندگی بھر اس کی غارت گری پر مطلع نہیں ہو پاتا اور جب اچانک پردہ اٹھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ میں کس قدر فریبِ نفس میں مبتلا رہا اور یہ ظالم نفس کس طرح مجھے اپنے دامِ تزویر میں شکار کئے ہوئے تھا؟

مقصودِ خلوت نشینی

خلوت نشینی کا مقصود یہ ہے کہ انسان گوشہ تنہائی میں داخل ہو کر خود کو مخلوق سے قلباً جدا کر لے اور جب خلوت نشینی سے باہر آئے‘ نفس سے خود کو جدا کر چکا ہو۔ نفس سے جدا ہونے کا مطلب خصائلِ نفس سے اپنے آپ کو مبرا کر لینا ہے۔ درست ہے کہ نفس کثرتِ ریاضت و مجاہدہ سے بھی کمزور ہوتا ہے، لیکن ان معمولات سے کہیں زیادہ ندامت

کے آنسوؤں اور کثرتِ گریہ و زاری سے کمزور پڑتا ہے۔ کثرتِ رقت وگریہ زاری نفس کی تمام آلائشوں کو دھو دیتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان خصائلِ نفس سے جدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب نفسِ انسانی اپنی خصلتوں سے جدا ہو جاتا ہے تو اسے اپنے محبوب و مطلوب کی جلوت نصیب ہو جاتی ہے اور وہ اپنے من کی مراد پا لیتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ جب تک انسان نفس کی معیت میں رہتا ہے، رب کی معیت سے محروم رہتا ہے اور جب بندہ نفس اور اس کی خصلتوں سے جدا ہو جاتا ہے تو اسے اپنے رب کی صحبت نصیب ہو جاتی ہے۔ حضرت مالک بن مسعودؓ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ کو خلوت سے وحشت نہیں ہوتی؟ تو فرمانے لگے کبھی صحبتِ محبوب میں بھی کسی کو وحشت ہوتی ہے۔ میں خلوت میں اپنے محبوب کی جلوت سے بہرہ ور ہوتا ہوں۔ ان پرکیف اور سرور آفریں لمحات میں وحشت کیسی؟

حاصلِ کلام یہ کہ جب تک انسان نفس کے شر کے تابع رہتا ہے، وصالِ یار سے محروم رہتا ہے اور جب علائقِ دنیوی سے کچھ دیر منہ موڑ کر تزکیہ نفس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور قلباً وحالاً جلوت سے خلوت آرا ہو جاتا ہے تو اسے اپنے محبوب کے وصال کی دولت بے بہا حاصل ہو جاتی ہے۔ گویا یہ خلوتیں اسے ربِ جلیل کی جلوتیں عطا کر دیتی ہیں اور اگر انسان کثرتِ ذکر وفکر، عبادت و ریاضت اور گریہ و زاری کو اپنا مستقل شعار بنا لینے کے ساتھ ساتھ محاسبہ نفس کی راہ پر استقامت سے چل نکلے تو ان جلوتوں کو دوام بھی نصیب ہو سکتا ہے اور جب ان کیفیات کو دوام مل جاتا ہے تو پھر انسان اس آیت قرآنی کا مصداق بن جاتا ہے:

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ

(القرآن، النور، ۲۴:۳۷)

’’(اللہ کے نور کے حامل) وہی مردان (خدا) ہیں جنہیں نہ تو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے اور نہ ہی اقامت نماز اور ایتائے زکوٰۃ سے۔‘‘

اس مقام پر جلوتِ یار کی کیفیت نفسِ انسانی میں یوں رچ بس جاتی ہے کہ وہ مخلوق کی جلوت میں رہتے ہوئے بھی جلوتِ محبوب کی حلاوت پاتا ہے۔ انسان کا ظاہر مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ باطن اپنے آقا و مولا کے ساتھ اور یوں وہ انجمن میں بھی خلوت کے مزے لوٹتا ہے۔

اعتکاف کے مسائل

عبادت کی نیت سے اللہ تعالی کے لئے مسجد میں ٹھہرنے کا نام اعتکاف ہے، اعتکاف کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اعتکاف واجب (۲) اعتکاف سنت (۳) اعتکاف مستحب

اعتکاف واجب

کسی نے یہ منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں ایک دن یا دو دن کا اعتکاف کروں گا اور اس کا کام ہو گیا۔ یہ اعتکاف واجب ہے اور اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ یاد رکھو کہ اعتکاف واجب کے لئے روزہ شرط ہے۔ بغیر روزہ کے اعتکاف واجب صحیح نہیں ہے۔

(درمختار، ۲:۱۲۹)

اعتکاف سنت موکدہ

یہ اعتکاف رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں کیا جاتا ہے، یعنی بیسویں رمضان کو سورج ڈوبنے سے پہلے اعتکاف کی نیت سے مسجد میں داخل ہو جائے تو تیسویں رمضان کو سورج ڈوبنے کے بعد یا انتیسویں رمضان کو چاند ظاہر ہونے کے بعد مسجد سے نکلے۔ یاد رہے کہ اعتکاف سنت موکدہ کفایہ ہے، یعنی اگر محلّہ کے سب لوگ چھوڑ دیں گے تو سب آخرت کے مواخذہ میں گرفتار ہوں گے اور اگر ایک آدمی نے بھی اعتکاف کر لیا تو سب آخرت کے مواخذہ سے بری ہو جائیں گے۔ اس اعتکاف میں بھی روزہ شرط ہے مگر

وہی رمضان کے روزے کافی ہیں۔

(درمختار، ۲: ۱۳۰)

اعتکاف مستحب

اعتکاف مستحب یہ ہے کہ جب کبھی بھی دن یا رات میں مسجد کے اندر داخل ہو تو اعتکاف کی نیت کرے جتنی دیر مسجد میں رہے گا، اعتکاف کا ثواب پائے گا۔ نیت کے لئے صرف دل میں اتنا خیال کر لینا اور منہ سے کہہ لینا کافی ہے کہ میں نے خدا کے لئے اعتکاف مسجد کی نیت کی۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱: ۱۹۷)

اعتکاف کے چند دیگر مسائل

- اعتکاف کرنے والوں کے لئے بلاعذر مسجد سے نکلنا حرام ہے، اگر نکلے تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا، چاہے قصداً نکلے یا بھول کر۔ اس طرح عورت نے جس گھر میں اعتکاف کیا ہے، اس کا بھی اس گھر سے نکلنا حرام ہے۔ اگر عورت اس مکان سے باہر نکل گئی تو خواہ وہ قصداً نکلی ہو یا بھول کر اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

(درمختار، ۲: ۱۳۳)

- مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد میں اعتکاف کرے اور عورت اپنے اس گھر میں اس جگہ اعتکاف کرے، جو جگہ اس نے نماز پڑھنے کے لئے مقرر کی ہو۔

(درمختار، ۲: ۱۲۹)

- اعتکاف کرنے والا دو عذروں کے سبب سے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے۔ ایک عذرِ طبعی جیسے رفع حاجت، غسل فرض اور وضو کے لئے، دوسرا عذرِ شرعی جیسے نماز جمعہ کے لئے جانا اگر مسجد میں نماز جمعہ نہ ہوتی ہو۔ ان دونوں عذروں کے سوا کسی اور وجہ سے مسجد سے نکلا تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا، اگرچہ بھول کر ہی نکلے۔

(درمختار، ۲: ۱۳۳)

- اعتکاف کرنے والا دن رات مسجد میں ہی رہے گا۔ وہیں کھائے، پیئے، سوئے مگر احتیاط رکھے کہ کھانے پینے سے مسجد گندی نہ ہونے پائے۔ معتکف کے سوا کسی اور کو مسجد میں کھانے پینے اور سونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی آدمی مسجد میں کھانا پینا اور سونا چاہئے تو اس کو چاہئے کہ اعتکاف مستحب کی نیت کر کے مسجد میں داخل ہو اور نماز پڑھے یا ذکر الٰہی کرے، پھر اس کے لئے کھانے پینے اور سونے کی بھی اجازت ہے۔

(درمختار، ۲:۱۳۴)

- اگر اعتکاف میں بیٹھتے وقت یہ شرط کر لی کہ مریض کی عیادت و نماز جنازہ میں جائے گا تو یہ شرط جائز ہے۔ اب اگر ان کاموں کے لئے مسجد سے باہر گیا تو اعتکاف فاسد نہ ہوگا، مگر دل میں نیت کر لینا کافی نہیں بلکہ زبان سے کہنا بھی ضروری ہے۔

(بہار شریعت، ۱:۴۷۴)

- اگر مسجد گر گئی یا کسی نے زبردستی مسجد سے نکال دیا اور وہ فوراً ہی کسی دوسری مسجد میں چلا گیا تو اعتکاف فاسد نہ ہوگا۔
- اعتکاف کرنے والا بالکل ہی چپ نہ رہے اور نہ لوگوں سے بہت زیادہ بات چیت کرے، بلکہ اس کو چاہئے کہ نفل نمازیں زیادہ پڑھے، تلاوت کرے، علم دین کا درس دے، اولیاء و صالحین کے حالات سنے اور دوسروں کو سنائے، کثرت سے درود شریف پڑھے اور ذکرِ الٰہی کرے۔ اکثر باوضو رہے اور دنیاداری کے خیالات سے دل کو پاک و صاف رکھے اور بکثرت رو رو کر اور گڑگڑا کر خداوند تعالیٰ سے دعا مانگے۔
- اعتکاف کی قضا صرف قصداً اعتکاف توڑنے ہی سے نہیں ہوتی، بلکہ اگر عذر کی وجہ سے بھی اعتکاف چھوڑ دیا، مثلاً بیمار ہو گیا یا بلا اختیار چھوٹا جیسے عورت کو حیض یا نفاس آیا، جنون یا بے ہوشی طاری ہوئی، ان صورتوں میں بھی قضا واجب ہے۔
- معتکف اگر بہ نیت عبادت بالکل چپ رہے کہ چپ رہنے کو ثواب سمجھے تو یہ مکروہ

تحریمی ہے اور اگر چپ رہنے کو ثواب کی بات سمجھ کر نہ چپ رہے تو حرج نہیں اور بری باتوں سے چپ رہا تو یہ چپ رہنا مکروہ نہیں، بلکہ یہ تو اعلی درجے کی بات ہے ۔کیونکہ بری باتوں سے زبان کو روکے رکھنا بہرحال واجب ہے اور جس بات میں نہ ثواب ہو نہ گناہ یعنی مباح باتیں تو یہ بھی بلاضرورت معتکف کو مکروہ ہیں، کیونکہ بلاضرورت مسجد میں مباح کلام بھی نیکیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

(بہارشریعت، ۱:۴۷۴)

○ سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ اعتکاف ہو یا کوئی بھی عبادت اس میں صرف رضائے الٰہی کی نیت رکھے۔ دکھاوا، نیک نامی اور شہرت کو ہرگز ہرگز دخل نہ دے' ورنہ ہر عبادت بے نور و بے رونق بلکہ ضائع و غارت ہو جائے گی اور ثواب کی جگہ گناہ نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

جزو یازدہم

شب قدر اور اس کی فضیلت

شب قدر اور اس کی فضیلت

رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات شب قدر کہلاتی ہے، جو بہت ہی قدر و منزلت اور خیر و برکت کی حامل رات ہے۔ اسی رات کو اللہ تعالیٰ نے ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا ہے۔ ہزار مہینے کے تراسی برس چار ماہ بنتے ہیں، گویا جس شخص کی یہ ایک رات عبادت میں گزری‘اس نے تراسی برس چار ماہ کا زمانہ عبادت میں گزار دیا اور تراسی برس کا زمانہ کم از کم ہے کیونکہ ’’خیر من الف شھر‘‘ کہہ کر اس امر کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کریم جتنا زائد اجر عطا فرمانا چاہئے گا، عطا فرما دے گا۔ اس اجر کا اندازہ انسان کے بس سے باہر ہے۔

شب قدر کا معنی و مفہوم

إنما سميت بذلک لعظمها و قدرها و شرفها

(قرطبی، الجامع الأحکام القرآن، ۲۰:۱۳۰)

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ قدر کا معنی مرتبہ کے ہیں‘چونکہ یہ رات باقی راتوں کے مقابلے میں شرف و مرتبہ کے لحاظ سے بلند ہے، اس لئے اسے ’’لیلۃ القدر‘‘ کہا جاتا ہے۔

أن اللہ تعالیٰ يقضي الأ قضية فی ليلة نصف شعبان و يسلمها إلى أربابها فی ليلة القدر

(قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۲۰:۱۳۰)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو تمام فیصلے فرما لیتا ہے اور چونکہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سال کی تقدیر و فیصلے کا قلمدان فرشتوں کو سونپا جاتا ہے' اس وجہ سے یہ ''لیلۃ القدر'' کہلاتی ہے۔

اس رات کو قدر کے نام سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے:

نزل فیھا کتاب ذو قدر، علی لسان ذی قدر، علی امۃ لھا قدر، و لعل اللہ تعالی انما ذکر لفظۃ القدر فی ھذہ السورۃ ثلاث مرات لھذا السبب.

(رازی، تفسیر الکبیر، ۳۲:۲۸)

اس رات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قابل قدر کتاب، قابل قدر امت کے لئے صاحبِ قدر رسول کی معرفت نازل فرمائی، یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ میں لفظ قدر تین دفعہ آیا ہے۔

قیل سمیت بذلک لأن الارض تضیق بالملائکۃ فیھا

(تفسیر الخازن، ۴:۳۹۵)

قدر کا معنی تنگی کا بھی آتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے اسے قدر والی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس رات آسمان سے فرش زمین پر اتنی کثرت کے ساتھ فرشتوں کا نزول ہوتا ہے کہ زمین تنگ ہو جاتی ہے۔

و قال ابو بکر الوراق: سمیت بذلک لأن من لم یکن لہ قدر و لا خطر یصیر فی ھذہ اللیلۃ اذ قدر إذا احیاھا

(قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۲۰:۱۳۱)

امام ابوبکر الوراق قدر کہنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ رات عبادت کرنے والے کو صاحب قدر بنا دیتی ہے، اگرچہ وہ پہلے اس لائق نہیں

تھا۔

یہ رات کیوں عطا ہوئی؟

اس کے حصول کا سب سے اہم سبب نبی اکرم ﷺ کی اس امت پر شفقت اور آپ ﷺ کی غم خواری ہے۔ موطا امام مالک میں ہے کہ:

إن رسول الله ﷺ أری أعمار الناس قبله أو ماشاء الله من ذلک فکانه تقاصر أعمار اُمته ان لا یبلغوا من العمل، مثل الذی بلغ غیرهم فی طول العمر، فاعطاه الله لیلة القدر خیر من ألف شهر.

(امام مالک، الموطا، ۱:۳۲۱، کتاب الصیام، باب ما جاء فی لیلة القدر، رقم: ۶۹۸)

''جب رسول پاک ﷺ کو سابقہ لوگوں کی عمروں پر آگاہ فرمایا گیا تو آپ ﷺ نے ان کے مقابلے میں اپنی امت کے لوگوں کی عمر کو کم دیکھتے ہوئے یہ خیال فرمایا کہ میری امت کے لوگ اتنی کم عمر میں سابقہ امتوں کے برابر عمل کیسے کر سکیں گے؟ (پس) آپ ﷺ کو لیلۃ القدر عطا فرما دی، جو ہزار مہینے سے افضل ہے۔''

اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ سے منقول روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بنی اسرائیل کے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا گیا، جس نے ایک ہزار ماہ تک اللہ تعالی کی راہ میں جہاد کیا تھا۔

فعجب رسول الله ﷺ لذلک و تمنی ذالک لامته فقال یا رب جعلت امتی أقصر الامم الاعمارا و أقلها أعمالا فاعطاه الله تبارک و تعالیٰ لیلة القدر

(تفسیر الخازن، ۴:۳۹۷)

تو آپ ﷺ نے اس پر تعجب کا اظہار فرمایا اور اپنی امت کے لئے آرزو

کرتے ہوئے جب یہ دعا کی کہ اے میرے رب میری امت کے لوگوں کی عمریں کم ہونے کی وجہ سے نیک اعمال بھی کم ہوں گے تو اس پر اللہ تعالی نے شب قدر عنایت فرمائی۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے مختلف شخصیات حضرت ایوبؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت حزقیلؑ، حضرت یوشعؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان حضرات نے اسی اسی سال اللہ تعالی کی عبادت کی ہے اور پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔ صحابہ کرامؓ کو ان برگزیدہ ہستیوں پر رشک آیا۔

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ اسی وقت جبرائیلؑ آپ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

یا محمد عجبت امتک من عبادة هولاء النفر ثمانین سنة ، فقد أنزل الله علیک خیراً من ذلک ثم قرأ إنا اَنۡزَلۡنَاهُ فِی لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ فسر بذلک رسول الله ﷺ.

(قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۲۰:۱۳۲)

’’اے نبی محترم! آپ کی امت کے لوگ ان سابقہ لوگوں کی اسی اسی سالہ عبادت پر رشک کر رہے ہیں تو آپ کے رب نے آپ کو اس سے بہتر عطا فرما دیا ہے اور پھر سورۃ القدر کی تلاوت کی، اس پر رسول خدا ﷺ کا چہرۂ اقدس فرطِ مسرت سے چمک اٹھا۔‘‘

چنانچہ حضور ﷺ کے طفیل یہ کرم فرمایا کہ اس امت کو لیلۃ القدر عنایت فرما دی اور اس کی عبادت کو اسی نہیں بلکہ ۸۳ سال چار ماہ سے بڑھ کر قرار دیا۔

امتِ محمدی ﷺ کی خصوصیت

لیلۃ القدر فقط آپ ﷺ کی امت کی خصوصیت ہے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ حضرت انسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

إن الله وهب لامتی لیلة القدر لم یعطها من کان قبلهم

(سیوطی، الدر المنثور، ۶:۳۷۱)

’’یہ مقدس رات اللہ تعالیٰ نے فقط میری امت کو عطا فرمائی ہے سابقہ امتوں میں سے یہ شرف کسی کو بھی نہیں ملا۔‘‘

پہلی امتوں میں عابد کسے کہا جاتا تھا؟

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ پہلی امتوں میں عابد اسے قرار دیا جاتا تھا، جو ہزار ماہ تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا، لیکن نبی اکرم ﷺ کے صدقہ میں اس امت کو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ ایک رات کی عبادت سے اس سے بہتر مقام حاصل کر لیتی ہے۔

قيل ان العابد کان فيما مضی يسمی عابداً حتی يعبد الله الف شهر عبادة، فجعل الله تعالی لأمة محمد ﷺ عبادة ليلة خير من ألف شهر کانوا يعبدونها

(فتح القدیر، ۵:۴۷۲)

’’سابقہ امتوں کا عابد وہ شخص ہوتا جو ایک ہزار ماہ تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا، لیکن اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے افراد کو یہ شبِ قدر عطا کر دی، جس کی عبادت اس ہزار ماہ سے بہتر قرار دی گئی۔‘‘

گویا یہ عظیم نعمت بھی سرکار دوجہاں ﷺ کی غلامی کے صدقہ میں امت کو نصیب ہوئی ہے۔

فضیلتِ شب قدر ...... احادیث کی روشنی میں

سیدنا ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

من قام ليلة القدر ايماناً و احتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه

(بخاری، الصحیح، ۲:۷۰۹، کتاب صلوۃ التراویح، باب فضل لیلۃ القدر، رقم: ۱۹۱۰)

(بخاری، الصحیح، ۲:۶۷۲، کتاب الصوم، باب من صام رمضان إیماناً و إحتساباً و نیۃ، رقم: ۱۸۰۲)

’’جس شخص نے شب قدر میں اجر و ثواب کی امید سے عبادت کی، اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔‘‘

اس ارشاد نبوی ﷺ میں جہاں لیلۃ القدر کی ساعتوں میں ذکر وفکر، عبادت و طاعت کی تلقین کی گئی ہے، وہاں اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ عبادت سے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہو، ریاکاری یا بدنیتی نہ ہو اور آئندہ عہد کرے کہ میں برائی کا ارتکاب نہیں کروں گا، چنانچہ اس شان کے ساتھ عبادت کرنے والے بندے کے لئے یہ رات مژدۂ مغفرت بن کر آتی ہے۔

حضرت سیدنا انسؓ سے مروی ہے کہ رمضان المبارک کی آمد پر ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

إن هذا الشهر قد حضركم و فيه ليلة خير من ألف شهر من حرمها فقد حرم الخير كله ولا يحرم خيرها إلا محروم

(ابن ماجہ، السنن، ۱:۵۲۶، کتاب الصیام، باب ما جاء فی فضل شهر رمضان، رقم: ۱۶۴۴)

’’یہ جو ماہ تم پر آیا ہے، اس میں ایک ایسی رات ہے، جو ہزار ماہ سے افضل ہے، جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا، گویا وہ سارے خیر سے محروم رہا اور اس رات کی بھلائی سے وہی شخص محروم رہ سکتا ہے جو واقعتاً محروم ہو۔‘‘

ایسے شخص کی محرومی میں واقعتاً کیا شک ہوسکتا ہے، جو اتنی بڑی نعمت کو غفلت کی وجہ سے گنوا دے۔ جب انسان معمولی معمولی باتوں کے لئے کتنی راتیں جاگ کر بسر کر لیتا ہے تو اسی سال کی عبادت سے افضل عبادت کے لئے دس راتیں کیوں نہیں جاگ سکتا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے لیلۃ القدر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

إذا كان ليلة القدر نزل جبرائيل عليه السلام في كبكبة من الملٰئكة يصلون على كل عبد قائم أو قاعد يذكر الله عزوجل

(بیہقی، شعب الایمان، ۳:۳۴۳، رقم: ۳۷۱۷)

’’شب قدر کو جبرائیل امین علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں زمین پر اتر آتے ہیں اور ہر شخص کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں جو کھڑے، بیٹھے (یعنی کسی حال میں) اللہ کو یاد کر رہا ہو۔‘‘

شب قدر کو مخفی کیوں رکھا گیا؟

اتنی اہم اور بابرکت رات کے مخفی ہونے کی متعدد حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ دیگر اہم مخفی امور مثلاً اسمِ اعظم، جمعہ کے روز قبولیت دعا کی گھڑی کی طرح اس رات کو بھی مخفی رکھا گیا۔

۲۔ اگر اسے مخفی نہ رکھا جاتا تو عمل کی راہ مسدود ہو جاتی اور اسی رات کے عمل پر اکتفا کر لیا جاتا، ذوقِ عبادت میں دوام کی خاطر اس کو آشکار نہیں کیا گیا۔

۳۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کسی انسان کی وہ رات رہ جاتی تو شاید اس کے صدمے کا ازالہ ممکن نہ ہوتا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کو چونکہ اپنے بندوں کا رات کے اوقات میں جاگنا اور بیدار رہنا محبوب ہے، اس لئے رات تعین نہ فرمائی' تاکہ اس کی تلاش میں متعدد راتیں عبادت میں گزریں۔

۵۔ عدمِ تعین کی وجہ سے گنہگاروں پر شفقت بھی ہے، کیونکہ اگر علم کے باوجود اس رات میں گناہ سرزد ہوتا تو اس سے لیلۃ القدر کی عظمت مجروح کرنے کا جرم بھی لکھا جاتا۔

(امام رازی، التفسیر الکبیر، ۳۲:۲۸)

ایک جھگڑا علمِ شبِ قدر سے محرومی کا سبب بنا

ایک نہایت اہم وجہ اس کے مخفی کر دینے کی جھگڑا بھی ہے، حضرت عبادہ بن

صامتؓ سے مروی حدیث میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اس رات کی تعین کی بارے میں اپنی امت کو آگاہ فرما دیں کہ یہ فلاں رات ہے، لیکن دو آدمیوں کے جھگڑے کی وجہ سے بتلانے سے منع فرما دیا، روایت کے الفاظ یوں ہیں:

خرج النبی ﷺ لیخبرنا بلیلة القدر، فتلاحی رجلان من المسلمین، فقال: خرجت لأخبرکم بلیلة القدر، فتلاحی فلان و فلان فرفعت.

(بخاری، الصحیح، ۲:۷۱۱، کتاب صلوة التراویح، باب رفع معرفة لیلة القدر لتلاحی الناس رقم: ۱۹۱۹)

''ایک مرتبہ رسالتمآب ﷺ سب قدر کی تعین کے بارے میں آگاہ کرنے کے لئے گھر سے باہر تشریف لائے، لیکن راستہ میں دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تمہیں شب قدر کے بارے میں اطلاع دینے آیا تھا، مگر فلاں فلاں کی لڑائی کی وجہ سے اس کی تعیین اٹھا لی گئی۔''

اس روایت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ لڑائی جھگڑے کی وجہ سے انسان اللہ تعالی کی بہت سی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج امت برکتوں اور سعادتوں سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ مذکورہ روایت سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ شاید اس کے بعد تعین شب قدر کا آپ کو علم نہ رہا۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں کیونکہ شارحین حدیث نے تصریح کر دی ہے کہ تعین کا علم جو اٹھا لیا گیا تھا تو صرف اسی ایک سال کی بات تھی، ہمیشہ کے لئے نہیں۔

امام بدر الدین عینی شرح بخاری میں رقمطراز ہیں:

فان قلت لما تقرر إن الذی إرتفع علم تعینها فی تلک السنة فهل أعلم النبی ﷺ بعد ذلک بتعینها؟ قلت روی عن ابن عینیه أنه أعلم بعد ذلک بتعینیها.

(ملا علی قاری، عمدة القاری، ۱۱:۱۳۸)

”اس سال تعین شب قدر کا علم اٹھا لیا گیا اس کے بعد حضور ﷺ کو اس کی تعین کا علم رہا یا نہ؟ میں کہتا ہوں کہ حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ آپ کو اس کے تعین کا علم تھا۔“

ہمارے نزدیک آقائے دوجہاں ﷺ کو نہ صرف تعین کا علم ہے، بلکہ آپ بعض غلاموں کو اس پر آگاہ بھی فرماتے ہیں۔

ایک صحابی کو آگاہ فرمانا

حضرت ابن عبداللہ بن انیسؓ الجھنی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا:

یا رسول اللہ إن لی بادیة أکون فیها و أنا أصلی فیها بحمد اللہ فمرنی بلیلة أنزلها إلی هذا المسجد فقال: أنزل لیلة ثلاث و عشرین.

(ابوداؤد، السنن، ۲:۵۲، کتاب الصلوۃ، باب فی لیلۃ القدر، رقم: ۱۳۸۰)

”میں ایک ویرانے میں رہتا ہوں، وہاں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نماز ادا کرتا ہوں آپ مجھے حکم دیں کہ کون سی رات آپ کے ہاں مسجد نبوی میں بسر کرنے کے لئے آؤں تو آپ نے فرمایا رمضان کی تیئسویں رات آ جاؤ۔“

یہ صحابی ہمیشہ تیئسویں رات کو مسجد نبوی میں آ کر جاگا کرتے۔ لوگوں نے آپ کے صاحبزادے سے پوچھا کہ بتاؤ آپ کے والد اس رات کیا کرتے تھے تو انہوں نے کہا:

کان یدخل المسجد إذا صل العصر فلا یخرج إلاّ لحاجة حتی یلی الصبح فاذا صلی الصبح وجد دابته علی باب المسجد فجلس علیها ولحق ببادیة۔

(ابوداؤد، السنن، ۲:۵۲، کتاب الصلوۃ، باب فی لیلۃ القدر، رقم: ۱۳۸۰)

”وہ عصر کے بعد صبح تک مسجد سے بغیر کسی حاجت کے باہر نہ آتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو اپنی سواری جو مسجد کے دروازے کے پاس کھڑی ہوتی اس پر سوار ہو کر اپنے دیہات کی طرف روانہ ہو جاتے۔“

اس روایت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہر آدمی کے لئے شب قدر کی رات الگ الگ ہے۔

شب قدر کے تعین کے سلسلہ میں ایک ایمان افروز واقعہ

۱۹۶۵ء میں میرے والد گرامی حضرت علامہ ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ رمضان المبارک میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور آخری عشرہ میں حضور ﷺ کے روضہ اقدس کے سامنے مسجد نبویؐ میں اعتکاف میں بیٹھے۔ رمضان المبارک کی پچیسویں شب نصف شب کے قریب اللہ تعالی نے کرم فرمایا اور حضور ﷺ کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”اٹھ یہ رات شب قدر ہے۔“ انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے دست اقدس میں ایک گھڑی (ٹائم پیس) ہے، جس پر اس وقت تقریباً بارہ بج کر پچاس منٹ کا وقت تھا۔

والد گرامی فرماتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ نہ صرف حضور ﷺ نے شب قدر کی اطلاع فرمائی ہے، بلکہ اس رات کی خصوصی قبولیت کی ساعت کی بھی نشاندہی فرما دی ہے۔ میں جلدی سے اٹھا، وضو کیا، ساتھ ہی راولپنڈی کے ایک نومسلم پروفیسر جو سکھ مذہب ترک کر کے مسلمان ہوئے تھے، بھی معتکف تھے۔ میں نے چاہا کہ ان مبارک لمحات کی خبر ان کو بھی کروں، لیکن یہ سوچ کر کچھ دیر کے لئے رک گیا، کہیں یہ افشائے راز حضور ﷺ کو نامنظور نہ ہو، لیکن پھر میں یہ سوچ کر انہیں آگاہ کرنے کے لئے ان کی طرف چلا ہی گیا کہ یہ بھی حضور ﷺ کی بارگاہ کے مہمان ہیں۔ اگر منع کرنا مقصود ہوتا تو آپ ﷺ ایسا حکم فرما دیتے۔ جب میں اس ارادے سے ان کے قریب گیا تو وہ میرے قدموں کی آہٹ سن کر بیدار ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا پروفیسر صاحب اٹھیں، کیونکہ یہی رات

لیلۃ القدر ہے۔ وہ مسکرانے لگے ہاں اجابت کی گھڑی بارہ بج کر پچاس منٹ پر ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا آپ کو کس نے بتایا؟ کہنے لگے کہ جس ہستی کے در پر آپ مہمان ہیں، میں بھی انہیں کا مہمان ہوں۔ آپ تو صرف ایک وطن چھوڑ کر درِ مصطفیٰ ﷺ پر آئے ہیں، جبکہ میں نے اس در کی غلامی کے لئے دو ہجرتیں کی ہیں، ایک اپنے مذہب سے اور دوسری اپنے وطن سے لہٰذا حضور ﷺ نے مجھے بھی اپنی نوازشاتِ کریمانہ کا مستحق سمجھا اور دولتِ دیدار سے نوازتے ہوئے اس مبارک گھڑی کے متعلق آگاہ فرما دیا ہے۔

شب قدر کی تعین کے بارے میں تقریباً پچاس اقوال ہیں، ان میں سے دو اقوال نہایت ہی قابل توجہ ہیں۔

۱۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسالتمآب ﷺ نے فرمایا:

تحروا ليلة القدر فى الوتر، من العشر الأواخر من رمضان

(بخاری، الصحیح، ۲:۷۱۰، کتاب الصلوۃ التراویح، باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الأواخر، رقم: ۱۹۱۳)

''لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔''

چونکہ اعتکاف کا مقصد بھی تلاشِ لیلۃ القدر ہے، اس لئے ان آخری ایام کا اعتکاف سنت قرار دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ کو جب تک اللہ تعالیٰ نے اس شب قدر کی تعین سے آگاہ نہیں فرمایا تھا، آپ ﷺ اس کی تلاش کے لئے پورا رمضان اعتکاف کرتے تھے، لیکن جب آگاہ فرما دیا گیا تو وصال تک صرف آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے رہے۔

۲۔ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب شبِ قدر کی رات ہے۔ جمہور علماء اسلام کی یہی رائے ہے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

قد اختلف العلماء فى ذالك والذى عليه المعظم انها ليلة سبع و عشرين

(قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۲۰:۱۳۴)

’’علماء کا شب قدر کی تعین کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ لیلۃ القدر کی رات ستائیسویں شب ہے۔‘‘

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں:

و کثیر منھم ذھب الی انھا اللیلۃ السابعۃ من تلک الاوتار۔

(آلوسی، روح المعانی، ۳۰:۲۲۰)

’’علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ طاق راتوں میں سے ستائیسویں ہے۔‘‘

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور قاری قرآن حضرت ابی بن کعبؓ کی بھی یہی رائے ہے۔ حضرت زو بن جیشؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعبؓ سے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ جو شخص پورا سال عبادت کرے گا' وہ شب قدر کو پالے گا۔

حضرت ابی بن کعبؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جانتے ہیں کہ شب قدر رمضان کی آخری راتوں میں سے ہے اور وہ ستائیسویں رات ہے، لیکن آپ نے اس کا ذکر اس لئے کر دیا تاکہ لوگ فقط انہی راتوں کو ہی نہ جاگیں، بلکہ پورا سال عبادت کریں اور اس کے بعد حلف اٹھا کر کہا کہ وہ رات ستائیسویں ہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ رسالتمآب ﷺ نے جو اس کی علامت بیان فرمائی ہے' وہ اسی رات میں پائی جاتی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ ستائیسویں کو شب قدر قرار دیتے ہوئے تین دلیلیں بیان کیا کرتے تھے۔ جس کو امام رازیؒ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

أنه قال لیلۃ القدر تسعۃ حروف وھو مذکور ثلاث مرات فتکون السابعۃ والعشرین

(رازی، تفسیر کبیر، ۳۰:۲۳)

’’لفظ لیلۃ القدر کے ۹ حروف ہیں اور اس کا تذکرہ تین دفعہ ہوا ہے اور مجموعہ

۲۷ ہوگا۔‘‘

سورۃ القدر کے کل ۳۰ الفاظ ہیں، جن کے ذریعے شب قدر کے بارے میں بیان کیا گیا ہے لیکن اس سورۃ میں جس لفظ کے ساتھ اس رات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ’’ہی‘‘ ضمیر ہے اور یہ لفظ اس سورۃ کا ستائیسواں لفظ ہے۔

ان السورة ثلاثون كلمة و قوله (هى) هى السابعة و عشرون فيها

(رازی، تفسیر کبیر، ۳۲:۳۰)

(قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱۰:۱۳۶)

’’سورۃ کے کل کلمات تیس ہیں (اور ان میں) ’’ھی‘‘ ستائیسواں کلمہ ہے۔‘‘

اسی دلیل کو امام ابوبکر الوراق نے یوں بیان کیا ہے کہ رمضان کی تیس راتوں کی طرح اس سورۃ کے بھی تیس الفاظ ہیں گویا ہر لفظ رمضان کی ایک رات پر دال ہے لہٰذا ان میں سے ’’ھی‘‘ ستائیسواں لفظ ہونے کی وجہ سے ستائیسویں رات پر دلالت کر رہا ہے۔

(قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱۰:۱۳۶)

سیدنا فاروق اعظمؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے شب قدر کی تعین کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

أحب الأعداد إلى الله تعالى الور واحب الوتر إليه السبعة فذكر السموت السبع والارضين السبع والاسبوع و عدد الطواف.

(امام رازی، تفسیر کبیر، ۳۲:۳۰)

’’اللہ تعالیٰ کو طاق عدد پسند ہے اور طاق عددوں میں سے بھی سات کے عدد کو ترجیح حاصل ہے کیونکہ اللہ تعالی اپنی کائنات کی تخلیق میں سات کے عدد کو نمایاں کیا ہے مثلاً سات آسمان، سات زمین، ہفتہ کے دن سات، طواف کے چکر سات وغیرہ۔‘‘

شب قدر کا وظیفہ

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسالتمآب ﷺ سے عرض کیا کہ شب قدر کا کیا وظیفہ ہونا چاہیے تو آپ ﷺ نے ان الفاظ کی تلقین فرمائی:

أللهم إنک عفو تحب العفو فاعف عنی.

(احمد بن حنبل، المسند، ٦: ١٧١، رقم: ٢٥٤٢٣)

''اے اللہ تو معاف کر دینے والا اور معافی کو پسند فرمانے والا ہے پس مجھے بھی معاف کر دے۔''

باب پنجم

فلسفہ زکوٰۃ

جزو اوّل

زکوٰۃ کی فرضیت و اہمیت

ارکان اسلام میں نماز کے بعد دوسرا اہم ترین رکن زکوٰۃ ہے۔ قرآن حکیم میں بیاسی (۸۲) مقامات وہ ہیں جہاں نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم یکجا وارد ہوا ہے۔ شریعت مطہرہ میں زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ تنہا اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ و السلام کے وصال کے بعد سر زمین عرب میں ہر طرف فتنے سر اٹھانے لگے جن سے اسلامی ریاست کو نازک ترین صورتِ حال اور بحران کا سامنا کرنا پڑا تو اپنی سنگینی کے اعتبار سے سب سے بڑا چیلنج منکرین زکوٰۃ کا تھا۔ اسلامی تاریخ کے اس انتہائی نازک لمحے (Critical juncture) میں سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کمال جرأت ایمانی سے اکثر صحابہ کے مشوروں کے علی الرغم اس بات کا ببانگِ دہل اعلان کیا کہ جو کوئی نماز اور زکوٰۃ میں کسی قسم کی تفریق اور امتیاز روا رکھے گا میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ چنانچہ امیر المؤمنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے باغیوں کے خلاف کھلم کھلا جہاد کیا اور ان کی تلوار اس وقت تک نیام میں نہ آئی جب تک منکرین زکوٰۃ کی برپا کی ہوئی شورش پوری طرح فرو نہ ہوگئی۔

اسلامی حکومت کے فرائض چہارگانہ

قرآنِ حکیم نے اسلامی ریاست کے صاحبانِ اقتدار و اختیار کے فرائض منصبی اور وظائف (Functions) گنواتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ○

متذکرہ آیہ کریمہ کی رو سے حکومتِ اسلامیہ کے قیام کے چار بنیادی مقاصد بالترتیب درج ذیل ہیں:

۱۔ اقامت الصّلوٰۃ　　　　۲۔ ایتائے زکوٰۃ

۳۔ امر بالمعروف　　　　۴۔ نہی عن المنکر

اس سے مترشح ہوا کہ جب حکام منصبِ حکومت پر متمکن ہو کر زمامِ اقتدار سنبھال لیں تو ان کے لئے لازمی و لابدی ہے کہ وہ اسلامی معاشرے میں نظامِ صلوٰۃ برپا کرنے کے بعد نظام زکوٰۃ کا قیام عمل میں لائیں۔ ایسا کر لینے کے بعد ہی اسلامی ریاست کے اربابِ بست و کشاد پر تیسرا اور چوتھا فریضہ یعنی افراد معاشرہ کو معروف (نیکی) کا حکم دینا اور (منکر) برائی سے روکنا عائد کیا گیا ہے۔

اسلامی ہیئتِ اقتدار اس قوتِ نافذہ (Authority) کا نام ہے جس کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرے اور افراد کو ایسے مواقع فراہم کرے جس سے معاشرے میں ایک طرف اچھائیوں اور نیک کاموں کو فروغ ملے، تو دوسری طرف اور افعال قبیحہ و مذمومہ کا سدّ باب اور حوصلہ شکنی ہو۔ اس طرح ایسے راستے ہموار ہوتے رہیں گے جن پر چل کر لوگوں کی اخلاقی، مذہبی اور روحانی زندگی روبہ اصلاح ہو جائے گی اور برائیوں کا از خود قلع قمع ہوتا جائے گا۔ محض زبانی تبلیغ کرتے رہنا اسلامی ہیئت حاکمہ کے لئے کافی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جب تک ان بنیادی محرکات اور اسباب کو جن سے برائی کو فروغ پانے کے مواقع ملتے ہیں، جڑ سے نہ اکھاڑ دیا جائے کسی بھی انسانی معاشرے کی اصلاح و تطہیر ممکن نہیں۔

اسلام میں مادی اور روحانی نظام کے تقاضے باہم متعارض نہیں

اسلامی ریاست کے حاکمانِ بااختیار کے چہار گانہ وظائف و فرائض کے باہمی تعلق کی معنویت کو سمجھ لینا از بس ضروری ہے۔ اسلام کی ہمہ گیریت اس امر کی متقاضی ہے کہ صرف انسان کے روحانی تقاضوں ہی کی تکمیل نہ کی جائے بلکہ سب سے پہلے اس کی

مادی اور دنیاوی احتیاجات وضروریات کی تکمیل اور ان سب تقاضوں کی فراہمی کا سامان کیا جائے اس لئے کہ اسلام میں ترک دنیا اور رہبانیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جہاں اسلام نے عبادات و روحانیات کا ایک جامع نظام دیا ہے وہاں انسانی جسم کو صحت مند و توانا رکھنے کے لئے مادی اسباب ولوازمات سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ مادیات اور روحانیات ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اور اعتدال و میانہ روی کی روش پر کار بند رہتے ہوئے ایک ہمہ وجوہ متوازن زندگی گزارنے کے تقاضے ہرگز ایک دوسرے سے متعارض و متصادم نہیں اس لئے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو کامل طور پر فطرت سے ہم آہنگ ہے اور اس کا کوئی پہلو ایک دوسرے کا نقیض نہیں ہے۔

نظام صلوٰۃ وعبادات سے اسلامی معاشرہ روحانی برکات وثمرات سے متمتع وفیض یاب ہوتا ہے۔ حقوق اللہ جن کے لئے نظامِ صلوۃ وعبادات ابتداء بھی ہے اور نقطۂ کمال بھی اسلام کے روحانی نظام کی اساس کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اسلامی حکومت کی اولین ذمہ داری اس کا نفاذ قرار پایا تا کہ اسلامی معاشرے کی روحانی ضرورتوں کی تکمیل ہو سکے۔ اس کے باوصف چونکہ زکوٰۃ کا تعلق اقتصادیات سے ہے، یہ اسلام کے اقتصادی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کے حکم کے پیچھے یہ فلسفہ کارفرما ہے کہ اسلامی حکومت پورے معاشرے کو ایسا اقتصادی و معاشی نظام، طرزِ زندگی اور سماجی ڈھانچہ مہیا کرے جس سے حرام کمائی کے راستے مسدود ہو جائیں اور رزقِ حلال کے دروازے کھلتے چلے جائیں۔ اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر صاحبِ مال پر یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ سالانہ بنیادوں پر اپنے جمع شدہ اموال پر اڑھائی فی صد کے حساب سے مال نکال کر اجتماعی طور پر حکومت کے بیت المال میں جمع کرا دے تا کہ وہ اسے معاشرے کے نادہند (Have Nots) اور محتاج افراد کی ضروریات پوری کرنے پر صرف کر سکے۔ اس شرح سے اگر سب اہل ثروت اور متمول افراد اپنے سال بھر کے اندوختہ و زر و مال سے اپنا اپنا حصہ نکالتے رہیں تو اس طرح نہ صرف ان کی کمائی حلال اور ان کا مال و متاع آلائشوں سے پاک و صاف ہو جائے گا بلکہ معاشرے میں پائی جانے والی معاشی ناہمواریاں بھی از خود

دور ہوتی رہیں گی۔ اگر یہ سوچ افرادِ معاشرہ کے قلوب و اذہان میں جاگزیں ہو جائے تو پوری زندگی میں حلال وحرام کی حدیں متعین ہو جائیں گی اور اجتماعی حیات کے احوال و معاملات سنور جائیں گے۔

یہ تصور کی نیکی محض نماز، روزہ اور نفلی عبادات پر موقوف ہے جس سے ہمارے زندگی بھر کے گناہ ڈھل جاتے ہیں ایک خیالِ محض ہے جو اسلامی نظام کو مفلوج کرنے کے مترادف ہے۔ ہم سال میں ایک بار محافلِ میلاد منعقد کر کے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جشنِ میلاد النبی ﷺ کے اہتمام پر رقم خرچ کر کے پورا سال حرام و حلال سے بے نیاز ہر کر جو چاہیں کرتے پھریں ہم سے کوئی مواخذہ اور باز پرس نہ ہوگی۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی کوئی تعلیم رسول کریم ﷺ نے دی ہے اور نہ ہی سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی نے، جن کی گیارہویں بڑے اہتمام سے منا کر بزعم خویش یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے پورے مہینے کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

اسلام کی جس روح کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے اس کی تعلیم بفحوائے ارشادِ قرآنی:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً

(القرآن، البقرہ، ۲: ۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ۔''

کی آیہ کریمہ میں دی گئی ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسلام میں پورے کا پورا داخل ہوا جائے اگر اس کے برعکس

نیمے دروں نیمے بروں

والی کیفیت ہو گی یعنی اس کے کسی جزو کو ماننا اور کسی کا انکار کرنا ہمارا شعار ہوگا تو ہمارا یہ طرز عمل منافقت اور اسلام سے کھلم کھلا مذاق کے مترادف ہو گا۔ ایسا اسلام ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ہمیں اس دو رنگی کو چھوڑ کر یا تو پورے کا پورا اسلام گلے سے لگانا

ہو گا یا پھر ترکِ اسلام کی راہ اپنانا ہو گی۔

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سرا سر موم ہو یا سنگ ہو جا

نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ زکوٰۃ کا قیام اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ ایک سے انسان کی روحانی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے تو دوسرے سے اس کی مادّی ضرورتوں کی کفالت کی ضمانت میسر آتی ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ افراد کی روحانی اور مادی تقاضوں کی تکمیل کے بعد ہی جنم لیتا ہے جس کے نتیجے میں نیکیوں اور اچھائیوں کو فروغ ملتا ہے اور اس کے اندر پائی جانے والی برائیوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو ذہن نشین کرنے کے لئے کہ اسلامی نظام کے نفاذ سے اچھائیوں کا فروغ اور برائیوں کا سدّ باب کس طرح ممکن ہے، یہ بات ذہن میں مستحضر ہونی چاہئے کہ امر بالمعروف کا تعلق نظامِ صلوٰۃ سے اور نہی عن المنکر، کا تعلق نظام زکوٰۃ سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کے روحانی نظام کے نافذ کرنے سے نیکیوں کو فروغ ملتا ہے جب کہ اس کے اقتصادی نظام کا نفاذ برائیوں کو جڑ سے کاٹنے کا موجب بنتا ہے اگر اسلام کا اقتصادی نظام مفقود ہو تو غیر متوازن معیشت کے مضر اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوں گے اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹ جانے کی وجہ سے ارتکازِ زر کا رجحان فروغ پذیر ہوگا جس سے معاشرے میں برائیاں جنم لینے لگیں گی اور ایسی راہیں کھل جائیں گی جو فسق و فجور کی زندگی پر منتج ہونگی۔ بندہ و خالق کے مابین تعلق عبودیت پیدا کر دینا اسلام کا اولین تقاضا ہے جو انسانی زندگی میں روحانی نظام کے نفاذ کو مستلزم ہے، اس لئے کہ جب تک انسانوں کے اندر خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ محبت، للّٰہیت اور اخلاص کی بناء پر تعلق پیدا نہیں ہوگا ان میں ایثار و قربانی کی زندگی اپنانے کا محرک (Motive) اور میلانِ طبع ناپید رہے گا۔ روحانیت کا مطمع نظر یہ ہے کہ بندے کا اپنے مولا سے تعلق اتنا پختہ اور محکم ہو جائے کہ اس کی زندگی کا محور اس کی رضا کا حصول بن کر رہ جائے۔ جب یہ مقصد ہمہ وقت بندے کے پیشِ نظر رہے تو پھر وہ اپنی ذہنی تسکین اور مادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے بے لگام نہیں ہوگا۔ اس کے رگ و پے میں

روحانیت کی دوڑتی ہوئی لہر اس کے قدم غلط راستوں کی طرف جانے سے روک دے گی اور رضائے خداوندی کے تابع ہونے کے بعد وہ اپنی دولت غلط کاموں پر خرچ نہیں کرے گا۔ یہی سبب تھا کہ اسلام نے سب سے پہلے روحانی ضرورتوں کی بات کی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کو اولیت دی تاکہ انسان صحیح معنوں میں انسانیت کے منصب پر فائز ہو جائے اور اس کے پاس دولت کی بہتات کہیں اسے فرعون و قارون کے مقام پر نہ گرا دے۔ فرعون و قارون دونوں ایسے بے خدا نظام کے علمبردار تھے جس کی اساس تعلق باللہ کا فقدان اور مادی دولت وقوت کی کثرت تھی۔

اگر بندے کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق بالاخلاص استوار نہ ہو تو پھر اس کے اندر یہ سوچ سرائت کر جاتی ہے کہ اس کی کمائی ہوئی دولت اس کی محنت، قابلیت اور ذاتی استعداد کا نتیجہ ہے اس لئے وہ اسے خدا کی راہ میں کیوں دے؟ اس کے برعکس تعلق باللہ سے بندے کی سوچ کا رخ یہ ہو جاتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے خدا کی عطا ہے۔ وہ اپنی ساری پونجی اور مال و متاع کو اپنے خالق و مالک کی دین سمجھتا ہے اور اس کا عقیدہ یہ بن جاتا ہے کہ جب تک میرا رب مجھ سے راضی ہے یہ ساری نعمتیں میرے پاس رہیں گی اور اگر وہ انہیں چھین لینا چاہے تو میرے دائرہ اختیار میں کچھ بھی نہ رہے گا۔ اس عقیدے کی بناء پر وہ بندہ خدا کی رضا کو برقرار رکھنے کے لئے اس کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا اپنا شعارِ حیات بنا لیتا ہے کہ اس طرح وہ اللہ کی نعمتوں کا حقدار اور سزا وار ٹھہرتا ہے۔ یہی سوچ کا فرق ہے جس سے اس کی زندگی کا رخ یکسر تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ انتہائی اہم ہے کہ اس دنیا میں جو دارالمحن ہے، آزمائشیں غیر مسلموں کے لئے نہیں بلکہ اہل ایمان کے لئے ہیں۔ دولت ایمان سے تہی دامن افراد چونکہ اخروی نعمت سے محروم ٹھہرا دیئے گئے ہیں بنا بریں ان کیلئے صرف یہی دنیا اور اس کے راحت و آرام ہیں۔ اس کے برعکس حق تعالی نے اہل ایمان مرد و زن سے آخرت کی لازوال نعمت کا وعدہ کر رکھا ہے لہٰذا انہیں ان کے ایمان کی پرکھ کے لئے قدم قدم پر آزمایا جاتا ہے تاکہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہو جائے او یہ پتہ چل سکے کہ ان میں کون مستحق

ہے اور کون نہیں۔

قرآن حکیم نے بڑے بصیرت آموز پیرائے میں ان دو قسم کی سوچ رکھنے والے شخصوں کا حال بیان فرمایا ہے جو زمینوں اور باغات کے مالک تھے۔ ایک کی سوچ یہ تھی کہ یہ سب کچھ میرے رب کا فضل اور اس کی عطا ہے جسے برقرار رکھنے کا فقط یہ طریقہ ہے کہ میں اسے اس کی راہ میں خرچ کرتا چلا جاؤں۔ دوسرے شخص کی سوچ کا رخ اس کے برعکس یہ تھا کہ مجھ پر برسنے والا ہُن میری محنت و کاوش کا ثمرہ اور نتیجہ ہے لہٰذا مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس دولت کو اپنی آسائش و تعیش پر خرچ کرنے کی بجائے سائلوں اور محروموں کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر خرچ کرتا پھروں۔ اگلی صبح جب وہ شخص سو کر اٹھا تو اس کا باغ جل کر راکھ بن چکا تھا اور سوائے عبرت انگیز تباہی و بربادی کے اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا اور اس کا یہ زعم کہ اس کا اثاثہ اس کی ذاتی محنت و قابلیت کا نتیجہ ہے خاک میں مل گیا تھا۔ قرآنِ کریم نے فلسفہ زکوٰۃ کے باب میں ان دو سوچوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے امر بالمعروف کے بعد نہی عن المنکر قائم کرنے کا حکم صادر فرمایا اور اس ضمن میں روئے خطاب اہل ایمان سے کرکے انہیں نظامِ زکوٰۃ برپا کرنے کی تلقین کی تاکہ معاشرے کو اس کے اندر پنپنے والی برائیوں سے پاک و صاف کیا جاسکے اور ان خرابیوں کا قلع قمع کیا جائے جو اسے گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔

اب جہاں تک مسلم معاشرے کو نیکیوں کی آماجگاہ بنانے کا تعلق ہے و ﷲِ عَاقِبَةُ الْاَمُوْر کے مصداق ہر کام کا انجام اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کیلئے صلوٰۃ و عبادات کا روحانی نظام ہے جس کے تحت وہ ذاتِ پاک ہر کسی کو اس کی سعی و کاوش کا اجر ضرور دے گی لیکن یہ دنیا دارِ مکافات ہے یہاں اسباب سے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ انسان کا کام کوشش کرتے رہنا ہے اور اس کا نتیجہ اس ذاتِ کریمانہ پر چھوڑ دینا ہے جو کسی کی محنت کے اجر کو رائیگاں نہیں جانے دیتی۔ اس کا ارشاد ہے:

وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

(القرآن، النجم، ۵۳: ۳۹)

’’اور یہ کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے کوشش کی۔‘‘

اس ساری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ شروع میں درج کردہ آیہ کریمہ میں اسلامی حکومت کے جو چار بنیادی فرائض بیان کئے گئے ہیں ان میں دوسرا فریضہ نظامِ زکوٰۃ کا قیام ہے جس کے بغیر کسی بھی اسلامی سلطنت کا تشخص برقرار نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی ریاست اسلام کے نام پر وجود میں آتی ہے تو اس کے لئے لازمی و لابدی ہے کہ وہ اسلام کے اقتصادی نظام کے نفاذ کو نظام زکوٰۃ سے متحقق کرے۔ اگر وہ اس بنیادی فریضے سے پہلو تہی کرتی ہے تو اس حکومت کے اسلامی ہونے کا دعویٰ محل نظر ہے۔

زکوٰۃ کا لغوی معنی و مفہوم

لغوی اعتبار سے زکوۃ کا لفظ دو معنوں کا حامل ہے۔ اس کا ایک معنی پاکیزگی، طہارت اور پاک صاف ہونے یا کرنے کا ہے اور دوسرا معنی نشوونما اور بالیدگی کا ہے جس میں کسی چیز کے بڑھنے، پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے پہلے معنی کی وضاحت میں جو پاکیزگی و طہارت پر دلالت کرتا ہے قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد محلِ غور وفکر ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○

(القرآن، الشّمس، ۹۱:۹،۱۰)

’’تحقیق جس نے تزکیہ نفس کیا وہ کامیاب ہوا اور جو معصیت میں مبتلا ہوا وہ خائب و خاسر ہوا۔‘‘

اس آیۂ کریمہ میں دنیوی و اخروی کامیابی کیلئے طہارت و تزکیہ نفس کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اسے مدنظر رکھنے سے زکوٰۃ کا اطلاق راہ خدا میں خرچ کیے جانے والے اس مال پر ہوتا ہے جو دولت کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک و صاف کر دیتا ہے۔ بقول اقبال

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین

زکوٰۃ کا دوسرا مفہوم نشوونما پانے، بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا ہے۔ جیسے وہ کھیتی جو بہت بڑھ رہی ہو اور پھل پھول لا رہی ہو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے:

زَكَا الزّرع

’’کھیتی نے نشوونما پائی۔‘‘

اس مفہوم کو پیش نظر رکھیں تو زکوٰۃ کے لفظ کا اطلاق اس مال پر ہوتا ہے جسے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اس میں کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ وہ خدا کا فضل اور برکت شامل ہونے کی وجہ سے بڑھتا رہتا ہے۔

یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ فی نفسہٖ مال و دولت میں کوئی برائی نہیں اور امیر وغریب ہونا بذات خود کوئی شرف وفضیلت یا تحقیر کی بات نہیں۔ یہ مال و دولت کا استعمال یا عدم استعمال ہے جو اس کی قدر و قیمت اور اہمیت ومعنویت کو متعین کرتا ہے۔ اس کی مثال پانی کی سی ہے جو اگر کسی جگہ جمع ہو کر دیر تک کھڑا رہے اور اس کے نکاس کا کوئی اہتمام و بندوبست نہ ہو تو اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ پانی جو صاف و شفاف ہونے کی صورت میں انسان کے لیے حیات بخش اور صحت افزا تھا متعفن ہونے کی وجہ سے بیماری کا گھر اور موت کا سامان بن جاتا ہے۔ پانی کو صاف و شفاف اور تعفن سے پاک رکھنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ وہ ایک جگہ زیادہ دیر جمع نہ ہو اور اس کے نکاس کا خاطر خواہ بندوبست ہوتا رہے۔ اس اعتبار سے زکوٰۃ، مال و دولت اور سرمائے کے لئے گردش اور نکاس کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو زر و مال کو ایک جگہ بغیر خرچ کیے جمع رہنے سے باز رکھتا ہے۔ اس طرح سال میں ایک بار ادا کی ہوئی زکوٰۃ، مال و دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز نہیں ہونے دیتی اور اس گردشِ زر سے سرمائے کا چشمۂ صافی تکدر آشنا نہیں ہونے پاتا۔

زکوٰۃ اپنے مفہوم کے اعتبار سے وہ میل کچیل ہے جسے نکال دیا جائے تو دولت آلودگی سے پاک و صاف ہو جاتی ہے۔ یہ صرف ان مستحقین کا حق ہے جن کی تفصیل صراحت کے ساتھ کتب فقہ میں بیان کر دی گئی ہے۔ زکوٰۃ کا حق حقوق العباد کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر اسے صحیح طریقہ اور جگہ پر استعمال کیا جائے تو اس کی یہ ادائیگی اتنی بڑی نیکی ہے جس سے بے شمار برکتیں پیدا ہوتی ہیں اور دینے والے کا مال بجائے گھٹنے کے بڑھتا رہتا ہے۔

حقوق العباد ہونے کے ناطے زکوٰۃ اگر ایک طرف بندوں کا حق ہے تو دوسری طرف یہ خالق کا بھی حق ہے۔ اس کی عدم ادائیگی سے جہاں ایک طرف بندوں کے حق کو ٹھکرایا جاتا ہے وہاں لامحالہ خالق کے حق کو ٹھکرائے جانے کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

فرضیت زکوٰۃ کا سبب اور غرض و غایت

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر ان عوامل کی نشاندہی فرمائی ہے جو فرضیت زکوٰۃ کا سبب بنے۔ باری تعالیٰ اہل ایمان سے براہ راست مخاطب ہو کر یوں ارشاد فرماتے ہیں:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰـكُمْ

(القرآن، البقرہ، ۲:۲۵۴)

”اے ایمان والو! ہم نے جو تمہیں رزق دیا اس میں سے خرچ کرو۔“

دوسرے مقام پر دولت رشد و ہدایت اور تقویٰ سے بہرہ یاب ایمانداروں کی علامات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

(القرآن، البقرہ، ۲:۳)

''(قرآن) متقین کیلئے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے، نماز قائم کرتے اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر روئے خطاب پھر ایمان والوں کی طرف کرتے ہوئے اللہ جل مجدہٗ نے ارشاد فرمایا:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ

(القرآن، البقرہ، ۲:۲۶۷)

''اے ایمان والو! جو پاکیزہ (مال) تم کماؤ اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو۔''

اسی پیرایہ میں مزید تاکید کے ساتھ انفاق مال کی ضرورت پر ان الفاظ سے زور دیا گیا:

وَاَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

(القرآن، المنافقون، ۶۳: ۱۰)

''ہم نے تمہیں جو رزق عطا کیا اسے اس سے پہلے کہ تم پر موت آ جائے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرلو۔''

اس آیۂ کریمہ میں اہل ایمان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ قبل اس کے کہ تمہیں مرگ ناگہانی آ کر دبوچ لے اپنا پاک وطیب مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اپنا وطیرہ بنا لو۔ موت کے بعد جب ظاہری اسباب حیات منقطع ہو جائیں گے اور قیامت کے دن تم سے مواخذہ اور جواب طلبی ہو گی تو سوائے پچھتاوے کے تمہارے پاس کچھ نہ ہو گا، تم بارگاہ خداوندی میں گڑگڑا کر التجا کرو گے کہ ہمیں ایک اور زندگی کی مہلت عطا کر تاکہ ہم تیری رضا کے لیے تیری راہ میں خرچ کر کے تیری مقبول اور صالح بندوں میں شامل ہو جائیں لیکن اس روز کا پچھتاوا اور لجاجت بے کار جائے گی اور جواب آئے گا کہ مہلت وہی تھی جو دنیا میں ایک بار تمہیں عطا ہو چکی اب دوسری بار عمل کا موقع کسی کو بھی مرحمت نہیں کیا جائے گا۔

قرآن کریم کے بالاستیاب مطالعے سے یہ حقیقت الم نشرح ہو گئی کہ اس کے مختلف مقامات پر بڑی شرح و بسط اور شد و مد کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ باری تعالیٰ جگہ جگہ اہل ایمان کو یہ کہہ کر جھنجھوڑتا ہے کہ اس مال میں سے میری راہ میں خرچ کرو جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے۔''مِمَّا رَزَقْنٰکُم'' کے الفاظ غور طلب ہیں کہ انسان بسا اوقات یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کا مال اور اس کی کمائی، اس کی ذاتی محنت و کاوش اور استعداد و قابلیت کا نتیجہ ہے۔ اس کا یہ زعم باطل اور اس کا یہ دعویٰ خام ہے اس لیے کہ انسان کے پاس جو کچھ مال و متاع ہے وہ اس کے رب کی عطا اور فضل ہے جس سے اسے کسی لمحہ محروم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی بناء پر خالق کائنات نے قرآن حکیم میں جگہ جگہ انسان کے اس برخود غلط خیال اور دعویٰ کا بطلان کرتے ہوئے اس کے شعور اور تحت الشعور میں یہ تصور راسخ کیا ہے کہ وہ یہ بات پلے باندھ لے کہ دنیا و آخرت کی ہر نعمت اس کی محنت و مشقت اور قابلیت کا نتیجہ نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کی عطا اور اس کے فضل کی مرہون منت ہے۔ جب انسان کے باطن میں یہ شعور پختہ ہو کر جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اس کا سارا مال و متاع اس کے اللہ کی دین سے ہے تو پھر ''مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ'' کا معنی اس کی سمجھ میں آ جاتا ہے اور وہ جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے اسے قرض حسنہ تصور کرتا ہے۔

یہ بات کتنی لطیف اور عجیب ہے کہ وہ ذات جو سب کچھ عطا کرنے والی ہے اپنے بندے سے اس میں سے کچھ حصہ بطور قرض کے مانگتی ہے اس وعدے کے ساتھ کہ جو کچھ وہ میرے نام پر میری راہ میں خرچ کرے گا میرے پاس اس کے حساب میں جمع ہوتا رہے گا۔ اب یہ مسلمہ دستور ہے کہ ہر قرض خواہ کے ذمے قرض کا لوٹانا لازم ہوتا ہے۔ اور وہ ذات کریمانہ جو اتنی جواد، سخی اور بن مانگے ہر ایک کو عطا کرنے والی ہے کیوں نہ بے اندازہ اور بہتر انداز سے قرض ادا کرے گی۔ یہ تو اس نے انسان کی عزت افزائی اور اکرام کے سامان پیدا کیے ہیں ورنہ کون دینے والا ہے جو اپنے دیئے ہوئے میں سے قرض مانگتا ہے۔

شریعت اسلامیہ میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی دو

قسمیں ہیں: ایک انفاق واجبہ اور دوسری انفاق نافلہ۔ ان میں ایک قسم فرض اور دوسری نفلی صدقہ کے زمرے میں آتی ہے۔ یہاں صدقہ کے باب میں ضمناً ایک بات کی وضاحت مطلوب ہے۔ ہمارے ہاں غلط طور پر ایک تصور در آیا ہے کہ لوگ بالعموم صدقہ کے نام دی ہوئی چیز کھانے یا استعمال کرنے سے گھبراتے ہیں کہ شاید ایسا کرنے سے ان پر کوئی مصیبت نازل ہوجائے گی۔ حالانکہ صدقہ کی اصلیت و ماہیت پر ذرا غور کریں تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ صدقہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے یعنی انفاق ہی کا نام ہے۔ صدقات خواہ واجبہ ہوں یا نافلہ ان کے مستحقین بہر حال غرباء و مساکین، یتامیٰ اور دیگر اہل حاجت ہوتے ہیں لیکن قرآن حکیم نے صدقات کے مصارف بیان کرتے ہوئے مختلف انواع (Categories) کے ذکر میں مسافروں کے ذکر کو بھی شامل کیا ہے۔ اب کوئی مسافر چاہے کروڑ پتی ہو سفر کی حالت میں ضرورت مند ہوسکتا ہے۔ اس طرح بوجوہ صدقہ کا مال اس پر بھی جائز ہے لہٰذا صدقہ سے کسی قسم کی گھبراہٹ (Allergy) کی ضرورت نہیں۔

صدقات واجبہ کے برعکس صدقات نافلہ وہ صدقات ہیں جو محض خدا کی رضا کے لیے صرف کیے جاتے ہیں۔ ان کے مصرفات کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔ انہیں مستحقین کی امداد سے لے کر مسجد کی تعمیر اور کسی بھی نیک کام کیلئے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ شریعت مطہرہ نے کسی کو بھی ان کے جواز سے خارج نہیں کیا۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ تصور کہ سادات کیلئے صدقہ جائز نہیں ہے، اس کا اطلاق صرف صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ وعشر پر ہوتا ہے۔ جہاں تک نفلی صدقات کا تعلق ہے وہ سید ہو یا غیر سید، مسجد ہو یا مدرسہ، یا فلاحی نوعیت کا کوئی بھی نیک کام ہر ایک پر انہیں خرچ کرنا بہمہ وجوہ جائز ہے اور شریعت نے اس سلسلے میں کوئی قدغن نہیں لگائی۔ احیائے اسلام، تبلیغ و دعوت دین، مشن اور جہاد سے متعلق امور اور ان لوگوں کی ضروریات کی کفالت جنھوں نے خود کو دین کیلئے وقف کر دیا ہے ان سارے کاموں کے مصارف نفلی صدقات کے ذریعے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا جواز قرآن حکیم میں نص قطعی سے فراہم ہوتا ہے۔ ارشاد خداوندی

ہے:

لِلۡفُقَرَاءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ لَا یَسۡئَلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا

(القرآن، البقرہ، ۲:۲۷۳)

''(صدقات) ان فقراء کیلئے ہیں جو اللہ کی راہ میں محصور کیے گئے ہیں اور زمین میں پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کے سوال نہ کرنے کی بنا پر انجان انہیں مالدار تصور کرتے ہیں۔ ان کی حالت ان کے چہروں سے پہچانی جا سکتی ہے۔ وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے۔''

یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ نصاب کی شرط صرف صدقات واجبہ کیلئے ہوتی ہے جب کہ صدقات نافلہ کسی شرط اور حد سے مشروط نہیں۔ ہر کوئی جتنا چاہے بغیر کسی روک ٹوک کے راہ خدا میں خرچ کر سکتا ہے جس کے پاس زیادہ مال ہے وہ زیادہ اور جس کے پاس کم مال ہے وہ کم خرچ کرے۔ غریب بھی اپنی وسعت و استعداد کے مطابق اپنی ضرورت سے بچا کر خدا کی رضا کیلئے نکال سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اسلاف نے ایثار، بے نفسی اور قربانی کی ایسی تابناک مثالیں قائم کیں ہیں کہ تاریخ اسلام کے اورق ان کی تابانی سے اب بھی جگمگا رہے ہیں۔

شیر خدا سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شان میں اللہ رب العزت نے یہ آیات بینات نازل فرمائیں:

وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّاَسِیۡراً

(القرآن، الدھر، ۷۶: ۸)

''اور وہ (نیک لوگ) اللہ کی محبت پر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ حسنین کریمینؓ بیمار پڑ گئے۔ سیدہ عالم حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ نے منت مانی کہ اگر ان کے جگر پارے شفایاب ہو گئے تو وہ تین روزے رکھیں گے۔ حسنین کریمینؓ کو خدا تعالیٰ نے صحت عطا فرما دی تو انہوں نے منت پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے اس وقت اس گھرانے میں سحری و افطاری کیلئے کچھ بھی موجود نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے کہیں سے بقدر ضرورت جو ادھار لیے تا کہ نان شعیر سے روزے رکھے جا سکیں۔ ان پاک فطرت ہستیوں نے پہلا روزہ رکھ لیا۔ حضرت فاطمہؓ نے روزے کی افطاری کے لیے جَو کی روٹی اور چند کھجوروں کا اہتمام کیا۔ غروب آفتاب کے وقت وہ روزہ افطار کرنے ہی والے تھے کہ دروازے پر کسی سائل نے صدا دی کہ 'میں یتیم ہوں، کھانے کیلئے کچھ نہیں کچھ خدا کیلئے عطا کیجئے۔' حضرت علیؓ نے روٹی اور کھجوریں اس سائل کو دے دیں اور سیدہ عالم کے ساتھ سادہ پانی سے روزہ افطار کر لیا۔ دوسرے دن پھر روزہ رکھ لیا۔ جب افطاری کا وقت آیا تو گھر کے سامنے سائل کی صدا بلند ہوئی کہ 'اے اہل بیت میں مسکین ہوں اور کئی روز سے بھوکا ہوں للہ کچھ عطا کیجئے۔' حضرت علیؓ نے افطاری کا سارا سامان اٹھا کر اس سائل کے حوالے کر دیا اور پہلے روز کی طرح سادہ پانی سے روزہ افطار کر لیا۔ تیسرے دن بھی عین افطاری کے وقت دروازے پر دستک ہوئی اور سائل نے صدا دی کہ میں ایک اسیر ہوں کچھ واسطے خدا کھانے کو دیجئے۔ حضرت علیؓ نے اسے واپس نہ موڑا اور ماحضر اس کی نذر کر دیا درآنحالیکہ یہ تیسری افطاری بھی سادہ پانی سے کی گئی تھی۔ خانوادۂ سادات کی اس فیاضی، سخاوت او رایثار پر حضرت جبریل امین علیہ السلام متذکرہ صدر آیات کی سورت میں، جن میں حضرت علیؓ کی مدح بیان ہوئی ہے، محبوب خدا ﷺ کی خدمت میں خوشنودئ خدا کا پروانہ لے کر حاضر ہوئے۔

صدقات نافلہ کے باب میں اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ ان کے لیے نصاب کی کوئی حد متعین نہیں۔ اس کے باوصف صدقات واجبہ جو زکوٰۃ، عشر اور صدقہ فطر پر مشتمل ہے، کیلئے کم از کم حد (Minimium Limit) مقرر ہے جس کی ادائیگی ہر

صاحب نصاب کے ذمے فرض قرار دی گئی ہے اور اس سے انکار انسان کو دائرہ اسلام ہی سے خارج کر دیتا ہے۔

زکوٰۃ کی کم از کم حد سال کے اندوختہ مال پر اڑھائی فی صد کی شرح از روئے شریعت مقرر کی گئی ہے لیکن یہ وہ حد ہے جس سے اسلام کے ایک بنیادی رکن کی بجا آوری فرضیت کی حد تک ہوتی ہے اور اس سے پہلو تہی انسان کے ایمان و اسلام کو معرضِ خطر میں ڈال دیتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اہل ایمان کے ذمہ ان کے مالوں میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔''

زکوٰۃ سے انکار نص قطعی کے مطابق صریحاً کفر و بغاوت اور دائرہ اسلام سے اخراج کے مترادف ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسلامی تاریخ کے نازک ترین لمحے میں جب مملکت اسلامیہ چاروں طرف سے گونا گوں آزمائشوں اور فتنوں سے دو چار تھی منکرین زکوٰۃ کے خلاف اعلانیہ جہاد کیا اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے ساتھ ان تمام باغیوں کا قلع قمع کر دیا جنہوں نے صرف زکوٰۃ سے انکار کیا تھا۔ اس سے یہ بات بغیر کسی ابہام کے نکھر کر سامنے آئی کہ اسلامی نظام میں زکوٰۃ کی ادائیگی ایک ایسے بنیادی فریضے کا حکم رکھتی ہے جس سے انکار صریحاً بغاوت متصور ہوتی ہے اور ایسا کرنے والوں کے خلاف اسلامی حکومت کے اربابِ اقتدار کیلئے جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی بہت سے حقوق ہیں جن کا مال میں سے نکالنا کبھی فرض کبھی واجب، کبھی مستحب اور کبھی نفل قرار پاتا ہے۔ اس پر بحث آگے آئے گی۔ سر دست وہ نکتہ جس پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ سوال ہے جو اکثر ذہنوں میں سر اٹھاتا ہے کہ جب انسان محنت و مشقت اور اپنی دماغی و ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دولت کماتا ہے تو وہ اس دولت میں سے زکوٰۃ و صدقات کی صورت میں دوسروں کو حصہ دار کیوں بنایا جائے؟ اسلام کے تصور ملکیت کو موجودہ معروضی صورتحال میں سمجھنا از بس ضروری ہے۔ ہمارے ذہن ملکیت کے جس تصور سے آشنا ہیں وہ سرمایہ دارانہ یا اشتراکی نظام ہائے

معیشت سے اخذ کردہ ہے۔ اسلام کا اقتصادی تصور سرمایہ دارانہ اور اشتراکی فکر کی اساس پر استوار کیے گئے اقتصادی تصورات سے یکسر مختلف اور متمیز ہے۔ وہ یہ کہ خالق کائنات نے اس دنیا میں جو چیز بھی پیدا کی ہے وہ انسان کی فلاح و بہبود اور بہتری کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ گویا اموال و املاک اور جائیدادوں کی صورت میں جو کچھ بھی موجود ہے اس سے بنی نوع انسان کا فائدہ مقصود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَالَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّافِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا

(القرآن، البقرہ،۲:۲۹)

''وہ (ربّ) جس نے تمہارے لئے ہی پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے۔''

اس تصور کو کہ ہر چیز کی تخلیق میں حضرت انسان کی منفعت مضمر ہے ایک اور مقام پر قرآن حکیم ان الفاظ سے واضح فرماتا:

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ

''اور وہ جو لوگوں کے لئے نفع مند ہو وہی زمین میں رہتا ہے۔''

اس آیہ کریمہ سے یہ بات طے شدہ ہے کہ اس دنیا میں صرف وہی چیز باقی رہتی ہے کہ جس میں لوگوں کے لئے نفع بخشی اور فیض رسانی ہو۔ کسی شے کے باقی رہنے یا قائم رکھے جانے کا جواز قرآن حکیم کے فلسفہ کی رو سے صرف یہ ہے کہ اس سے کسی نہ کسی صورت میں انسان کے لئے سود مندی اور نفع بخشی کا پہلو وابستہ ہو۔

مغربی سائنس نے دنیا کو بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کا تصور دیا ہے جس کے مطابق صرف وہی چیز باقی رہتی ہے جو اپنے ماحول میں سب سے زیادہ سازگار اور مطابقت رکھنے والی ہو۔ اس کے علاوہ ہر چیز بقائے اصلح کی اس رزم گاہ میں فنا کی گھاٹ اتر جاتی ہے۔ اس تصور کے مقابلے میں اسلام کا پیش کردہ تصور اشیاء کی تخلیق اور بقا کے بارے میں ان کی انسان کے لئے فائدہ مندی اور نفع بخشی سے متعلق ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور قرونِ اولیٰ کے

مسلمان شوکت وعزت اور تمکنت کی زندگی اس لئے بسر کرتے تھے کہ اس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ اس میں ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کرکے دوسروں کی بہتری کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ دوسرے کی جان بچانے کے لئے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ تاریخ کا یہ واقعہ زبان زدِ عام و خاص ہے کہ ایک معرکہ جہاد میں کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم جاں بہ لب تھے۔ شدتِ تشنگی کا یہ عالم تھا کہ ہر زبان پر 'العطش العطش' تھا۔ اتنے میں پانی کا ایک پیالہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو دیا گیا وہ اسے منہ لگانے کو ہی تھے کہ دوسر صحابی رضی اللہ عنہ کی صدائے العطش کان میں پڑی۔ انہون نے پیالہ وہیں چھوڑ دیا اور کہا کہ یہ اسے دیا جائے پانی کا پیالہ اس صحابی رضی اللہ عنہ تک لے جایا گیا تو اتنے میں پہلا صحابی رضی اللہ عنہ جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ نے ابھی پیالہ منہ کو لگایا نہ تھا کہ اگلے صحابی رضی اللہ عنہ کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے پیالہ لوٹا دیا کہ پہلے کی جان بچائی جائے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی اپنی زندگی کے سانس پورے کرکے بادہ شہادت سے مخمور ہوگیا۔ علی ہذا القیاس پانی کا وہ پیالہ میدانِ جنگ میں پڑے ہوئے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ تک بڑھتا رہا اور کسی نے ایک بوند پانی سے اپنے خشک حلق کو تر نہ کیا یہاں تک کہ وہ سب رہتی دنیا تک ایثار و بے نفسی کی یہ یادگار مثال قائم کرکے واصل بحق ہوگئے اور جاتے جاتے متذکرہ بالا آیاتِ قرآنی کی عملی تفسیر پیش کر گئے۔ یہی سبب تھا کہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے قدم جس طرف اٹھتے تھے بغیر تلوار چلائے اسلام کا فیضان پھیلتا چلا جاتا تھا۔ ان کی تلوار صرف ظلم وزیادتی کے استیصال کے لئے نیام سے نکلی تھی ورنہ اطراف و اکنافِ عالم میں پیغام اسلام کی وسعت پذیری ان کے کردار اور اوصاف حمیدہ کی مرہون منت تھی۔

باب الاسلام، سندھ کا فاتح محمد بن قاسمؒ تین سال تک اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خطہ ہندوستان میں رہتا ہے لیکن اس عرصہ میں ایک فرد کا سر قلم کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ ساکنانِ ہند اس کی شمشیر کردار سے اس درجہ مسخر ہوگئے کہ جب وہ تین سال کے بعد حجاج بن یوسف کے حکم سے عرب واپس لوٹتا ہے تو انہوں نے دیوتا سمجھ کر اس کے بت بنالئے۔

اسلام نے مخلوق خدا کے لئے نفع بخشی کا جو اصول دیا وہ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی یکساں کارفرما تھا اور اس سلسلے میں تاریخ اسلام کا ایک واقعہ جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے نقل کیا جاتا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں شہرِ مدینہ کے اندر کسی کنویں کا پانی میٹھا نہ تھا۔ مدینہ منورہ سے چار میل کے فاصلے پر ایک میٹھے پانی کا کنواں کسی یہودی کی ملکیت تھا جو مہنگے داموں پانی بیچتا تھا۔ مسلمان بامر مجبوری چار میل کی مسافت طے کر کے مشقت اٹھاتے اور پانی خرید کر لاتے۔ ایک دفعہ اس یہودی کی رگِ خباثت پھڑکی اور اس نے اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو پانی سے محروم کرنے کے لئے زیادہ دام وصول کرنا شروع کر دیئے۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ نے یہودی کے ہاتھوں مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھا تو آپ نے اپنے گرد جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور فرمایا کہ:

”تم میں سے کون ہے جو میرے ہاتھ سے جنت خریدنا چاہتا ہے؟“

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جو صحابہ میں زیادہ مال دار تھے دست بستہ عرض کرنے لگے، ”آقا! غلام حاضر ہیں۔“

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اگر تم اس یہودی سے آدھا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دو تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔“

حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ نے بارہ ہزار درہم کے عوض اس یہودی سے آدھا کنواں خرید لیا اور اسے مدینہ کے مسلمانوں کے لئے عام وقف کر دیا۔ اب مسلمانوں کو اپنی ضرورت کے مطابق بغیر کسی روک ٹوک اور دشواری کے پانی میسر آتا اور ان کی ضرورت سے فاضل پانی بچ رہتا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے مدینے کے یہودیوں کو دعوت دی کہ جب مسلمان اپنی ضرورت کا پانی لے لیا کریں تو تم بھی اس میں سے پانی بھر لیا کرو۔ چنانچہ انہوں نے حضور ﷺ کی اس پیش کش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودی سے پانی خریدنا بند کر دیا اور

مفت پانی بھرنے لگے۔ اس طرح یہودی کا کاروبار مندا پڑ گیا۔ وہ شکوہ کناں آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''یا تو آپ یہودیوں کو پانی مفت دینا بند کردیں یا بقیہ کنواں بھی مجھ سے خرید لیں۔'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہم یہودیوں کو مفت پانی دینا بند تو نہیں کرسکتے البتہ بقیہ آدھا کنواں خریدنے کی بات ممکن ہے چنانچہ آپ ﷺ کے ارشاد کی تکمیل میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے بقیہ کنواں بھی آٹھ درہم پر یہودی سے خرید لیا اور اسے اہل مدینہ کے لئے وقف کردیا۔

اس واقعہ سے اسلام کا تصورِ ملکیت واضح ہوجاتا ہے کہ اس کی تہہ مین مخلوقِ خدا کی بہتری اور فلاح کا فلسفہ مضمر ہے۔ جب تک مسلمانوں میں اس تصور کی کارفرمائی رہی وہ عظمت و شوکت کے بامِ عروج پر متمکن رہے اور دنیائے شرق وغرب ان کے زیرنگیں رہی۔ جب اس تصور کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو عزت و شوکت ان کے ہاتھ سے جاتی رہی اور نتیجتاً ان کی عظمت قصہ پارینہ بن کر رہ گئی۔

جزو دوم

مسائلِ زکوٰۃ کا بیان

نماز کی طرح زکوٰۃ بھی اسلام کا ایک رکن ہے۔ نماز کی طرح اس کے بارے میں بھی سیکڑوں آیتیں اور احادیث صحیحہ آئی ہیں جن میں زکوٰۃ ادا کرنے کی سخت تاکید آئی ہیں اور نہ ادا کرنے والے پر طرح طرح کے دنیاو آخرت کے عذابوں کی وعیدیں آئی ہیں۔

مسئلہ: زکوٰۃ فرض ہے۔ اس کا انکار کرنے والا کافر اور نہ ادا کرنے والا فاسق و جہنمی ہے اور ادا کرنے میں بلاعذر دیر کرنے والا گہنگار و مردود الشہادۃ ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱:۱۶۰)

مسئلہ: اللہ کے لئے مال کے ایک حصہ کو، جو شریعت نے مقرر کیا ہے کسی فقیر کو مالک بنادینا شریعت میں زکوٰۃ کہلاتا ہے۔

زکوٰۃ فرض ہونے کی شرائط

زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں:

۱۔ مسلمان ہونا: زکوٰۃ مسلمان پر فرض ہے، کافر پر فرض نہیں۔

۲۔ بالغ ہونا: زکوٰۃ بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ نابالغ زکوٰۃ کی فرضیت سے مستثنیٰ ہے۔

۳۔ عاقل ہونا: زکوٰۃ عاقل، بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ دیوانے پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

۴۔ آزاد ہونا: یعنی لونڈی و غلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

۵۔ مالک نصاب ہونا: شریعت کے مقرر کردہ نصاب سے کم مال کے مالک پر زکوٰۃ فرض

نہیں ہے۔

۶۔ پورے طور پر مالک ہونا: صاحبِ نصاب کا مال پر قبضہ بھی ہو تب زکوٰۃ فرض ہے مثلاً کسی نے اپنا مال زمین میں دفن کر دیا اور جگہ بھول گیا پھر برسوں کے بعد جگہ یاد آئی اور مال مل گیا۔ جس وقت مال گم تھا اس زمانہ کی زکوٰۃ واجب نہیں کیونکہ نصاب کا مالک تو تھا مگر چونکہ اس پر قبضہ نہیں تھا اس لئے پورے طور پر مالک نہ تھا۔

۷۔ صاحب نصاب کا قرض سے فارغ ہونا: مثلاً کسی کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے مگر وہ ایک ہزار روپے کا مقروض بھی ہے تو اس کا مال قرض سے فارغ نہیں ہے، لہٰذا اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

۸۔ نصاب کا حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا: حاجتِ اصلیہ یعنی آدمی کو زندگی بسر کرنے میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جیسے رہنے سہنے کا مکان، جاڑے گرمیوں کے کپڑے، گھریلو سامان یعنی کھانے پینے اور کھانا پکانے کے برتن، چارپائیاں، کرسیاں، میزیں، چولھے، پنکھے، کام کرنے کی مشین وغیرہ۔ اگرچہ یہ سب سامان لاکھوں روپے کے ہوں مگر ان پر زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ سب مال وسامان حاجتِ اصلیہ سے فارغ نہیں ہیں۔

۹۔ مال نامی ہونا یعنی مال بڑھنے والا ہونا خواہ حقیقۃً بڑھنے والا مال ہو جیسے مال تجارت اور چرائی پر چھوڑے ہوئے جانور یا حکماً بڑھنے والا مال جیسے سونا، چاندی کہ یہ اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان سے چیزیں خریدی جائیں اور بیچی جائیں تاکہ نفع ہونے سے یہ بڑھتے رہیں لہٰذا سونا چاندی جس حال میں بھی ہوں خواہ زیورات اور برتنوں کی شکل میں ہوں یا زمین میں دفن ہوں ہر حال میں یہ مال نامی یعنی بڑھنے والا مال ہے اور ان کی زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے۔

۱۰۔ مال نصاب پر ایک سال گزر جانا: نصاب کا مال پورا ہوتے ہی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی بلکہ ایک سال تک وہ نصاب ملک میں باقی رہے تو سال پورا ہونے کے بعد اس کی

زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱:۱۶۰۔۱۶۴)

سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے ہے اور چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے ہے۔ سونا، چاندی میں چالیسواں حصہ نکال کر بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سونے کی زکوٰۃ میں سونا اور چاندی کی زکوٰۃ میں چاندی ہی دی جائے بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ بازار بھاؤ سے سونے چاندی کی قیمت لگا کر روپیہ زکوٰۃ میں دیں۔

زیورات کی زکوٰۃ

حدیث شریف میں ہے کہ دو عورتیں حضور اقدس ﷺ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا ”تم ان زیورات کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟“

عورتوں نے عرض کیا: ”جی نہیں“

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کیا تم اسے پسند کرتی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟“

عورتوں نے عرض کیا: ”نہیں یا رسول اللہ!“

حضور ﷺ نے فرمایا: ”تم ان زیورات کی زکوٰۃ ادا کرو۔“

(ترمذی شریف)

جن زیورات کی مالک عورت ہو خواہ وہ میکے سے لائی ہو یا اس کے شوہر نے اس کو زیورات دے کر مالک بنادیا ہو تو ان زیورات کی زکوٰۃ عورت پر فرض ہے اور جن زیورات کا مالک مرد ہو یعنی عورت کو صرف پہننے کے لئے دیا گیا ہے مالک نہیں بنایا تو ان زیورات کی زکوٰۃ مرد کے ذمہ ہے عورت پر نہیں۔

(فتاویٰ رضویہ، ۴)

سونے چاندی کی زکوٰۃ

۱۔ اگر کسی کے پاس تھوڑی چاندی اور تھوڑا سونا ہے اور سونا چاندی میں سے کوئی بھی بقدر نصاب نہیں تو ایسی صورت میں سونے کی قیمت کی چاندی یا چاندی کی قیمت کا سونا مان کر دونوں کو ملائیں پھر اگر ملانے پر بھی بقدر نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ نہیں اور اگر سونے کی قیمت چاندی، چاندی میں ملائیں تو بقدر نصاب ہوجاتا ہے اور چاندی کی قیمت کا سونا، سونے میں ملائیں تو بقدر نصاب نہیں ہوتا تو واجب ہے کہ جس صورت میں نصاب پورا ہوجاتا ہے وہ کریں۔

(درمختار و ردالمختار)

۲۔ تجارتی مال وسامان کی قیمت لگائی جائے پھر اس سے اگر سونے یا چاندی کا نصاب پورا ہو تو اس کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱:۱۶۸)

۳۔ اگر کسی کے پاس سونا چاندی نہ ہو، نہ مالِ تجارت ہو بلکہ صرف نوٹ اور روپے ہوں تو کم سے کم اتنے روپے، پیسے اور نوٹ ہوں کہ بازار میں ان سے ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جا سکتی ہو تو وہ صاحبِ نصاب ہے۔ اس کو نوٹ اور روپے پیسوں کی زکوٰۃ کل کا چالیسواں حصہ نکالنا فرض ہے۔

۴۔ اگر شروع سال میں نصاب پورا تھا اور آخر سال میں بھی نصاب پورا رہا۔ درمیان سال میں مال گھٹ کر نصاب سے کم رہ گیا تو یہ کمی کچھ اثر نہ کرے گی بلکہ اس کو پورے مال کی زکوٰۃ دینا پڑے گی۔

۵۔ روپے پیسوں کی زکوٰۃ میں روپے پیسے ہی دینا ضروری نہیں بلکہ جتنے روپے زکوٰۃ کے نکلتے ہیں ان کا غلہ یا کپڑا یا کتابیں یا کوئی بھی سامان خرید کر مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنادینے سے زکوٰۃ ادا ہوجاہے گی۔

عشر کا بیان

عشر بھی زکوٰۃ کی طرح ہے جو

۱۔ زمین سے پیدا ہونے والی ہر قسم کی اشیاء مثلاً گیہوں، جو، چنا، باجرہ، دھان، سرسوں وغیرہ اور ہر قسم کے اناج، گنا، روئی، پٹ سن، ہر قسم کی ترکاریاں، پھل، پھول، میوے سب پر واجب ہے۔ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

۲۔ جو پیداوار بارش یا زمین کی نمی سے پیدا ہو اس میں سے دسواں حصہ واجب ہوتا ہے اور جو پیدوار چرسے، ڈول، پمپنگ مشین یا ٹیوب ویل وغیرہ کے پانی سے یا خریدے ہوئے پانی سے پیدا ہو اس میں بیسواں حصہ واجب ہوتا ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱:۱۷۴)

۳۔ کھیتی کے اخراجات نکال کر عشر نہیں نکالا جائے گا۔ بلکہ جو کچھ پیدوار ہوئی ان سب کا عشر یا نصف عشر (دسواں یا بیسواں) دینا میں واجب ہے۔ گورنمنٹ کو جوا مالگزاری (لگان) دی جاتی ہے وہ بھی عشر کی رقم سے ادا نہیں کی جائے گی۔ بلکہ پوری پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ خدا کی راہ میں نکالنا پڑے گا۔

(فتاویٰ رضویہ)

۴۔ زمین اگر بٹائی پر دے کر کھیتی کرائی تو زمین والے اور کھیتی کرنے والے دونوں کو جتنی پیداوار ملی ہے اپنے اپنے حصہ کی پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔

(ردالمختار، ۲:۵۶)

سائمہ جانوروں کی زکوٰۃ کا بیان

سائمہ: سائمہ جانور وہ ہے جو سال کے اکثر حصہ میں چر کر گزر بسر کرتا ہو اور اس سے مقصود صرف دودھ یا بچے لینا یا فربہ کرنا ہے۔ اگر گھر میں گھاس لاکر کھلاتے ہوں یا مقصود بوجھ دلانا یا ہل چلانا وغیرہ جیسے کسی کام میں لانا یا سواری لینا ہے تو اگرچہ وہ چرکر

گزر کرتا ہو وہ سائمہ نہیں اور اس کی زکوٰۃ واجب نہیں اور اگر تجارت کا جانور جنگل میں چرائی پر ہے تو یہ بھی سائمہ نہیں۔ بلکہ اس کی زکوٰۃ قیمت لگا کر ادا کی جائے گی کیونکہ یہ تجارت کا مال ہے۔

تین قسم کے جانوروں کی زکوٰۃ واجب ہے جبکہ وہ 'سائمہ' ہوں: اونٹ، گائے اور بکری۔ لہٰذا ان تینوں کے نصاب اور ان تینوں کی زکوٰۃ کی الگ الگ مقدار کا بیان اس طرح ہے۔

اونٹ کی زکوٰۃ

۱۔ اونٹوں کی زکوٰۃ کا کم سے کم نصاب پانچ اونٹ ہیں۔ پانچ اونٹ سے کم ملکیت پر زکوٰۃ واجب نہیں اور جب پانچ یا پانچ سے زیادہ ہوں مگر پچیس تک ہر پانچ پر ایک بکری زکوٰۃ میں دینا وجب ہے یعنی پانچ اونٹوں ہوں تو ایک بکری، دس اونٹ ہوں تو دو بکری، پندرہ اونٹ ہوں تو تین بکری دینا ہوگی۔

۲۔ زکوٰۃ میں جو بکری دی جائے وہ سال بھر سے کم کی نہ ہو۔ بکری دیں یا بکرا اس کا اختیار ہے۔

(ردالمختار)

۳۔ پچیس سے پنتیس تک اونٹ ہوں تو ایک بنت مخاض یعنی اونٹ کا مادہ بچہ جو ایک سال کا ہو چکا ہو اور دوسرے برس میں ہو۔ چھتیس سے پنتالیس اونٹ ہوں تو ایک بنت لبون یعنی اونٹ کا مادہ بچہ جو دو سال کا ہو چکا ہو اور تیسرے برس میں ہو۔ چھیالیس سے ساٹھ تک میں ایک حِقہ یعنی اونٹنی جو تین برس کی ہو چکی ہو اور چوتھے سال میں ہو۔ اِکسٹھ سے پچھتر تک میں ایک ''جذعہ'' یعنی چار سال کی اونٹنی جو پانچویں برس میں ہو۔ چھہتر سے نوے تک اونٹ ہوں تو دو بنتِ لبون۔ اکانوے سے ایک سو بیس تک میں دو حِقہ۔ اس کے بعد ایک سو پنتالیس تک میں دو حِقہ اور ہر پانچ پر ایک بکری مثلاً ایک سو پچیس اونٹ میں دو حِقہ اور ایک بکری اور ایک سو تیس

اونٹ میں دو حِقّہ اور دو بکریاں وعلیٰ ہٰذالقیاس۔ پھر ایک سو پچاس اونٹ میں تین حِقّہ۔ اگر اس سے زیادہ اونٹ ہوں تو ان میں ویسا ہی کریں جیسا شروع میں کیا تھا یعنی ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری اور پچیس میں بنتِ مخاض۔ چھتیس میں بنتِ لبون۔ یہ ایک سو پچانوے تک کا حکم ہو گیا یعنی اتنے میں تین حِقّہ اور ایک بنت لبون پھر ایک سو چھیانوے سے دو سو چار اونٹ تک چار حِقّہ اور یہ بھی اختیار ہے کہ پانچ بنت لبون دے دیں۔ پھر دو سو اونٹوں کے بعد وہی طریقہ برتیں جو ایک سو پچاس کے بعد ہے یعنی ہر پانچ میں ایک بکری، پچیس میں بنت مخاض، چھتیس میں بنت لبون۔ پھر دو سو چھالیس سے دو سو پچاس اونٹ تک پانچ حقہ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

(ہدایہ وغیرہ عامہ کتب)

۴۔ اونٹ کی زکوٰۃ میں جس موقع پر ایک یا دو یا تین یا چار سال کا اونٹ کا بچہ دیا جاتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ مادہ ہو۔ نر دیں تو مادہ کی قیمت کا ہو ورنہ نر نہیں لیا جائے گا۔

(درمختار)

گائے کی زکوٰۃ

گائے کی زکوٰۃ کا نصاب کم از کم تیس گائیں ہیں۔ تیس سے کم گائیں ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں اور جب تیس پوری ہوں تو ان کی زکوٰۃ ایک تبیع یعنی سال بھر کا ایک بچھڑا یا تبیعہ یعنی سال بھر کی بچھیا ہے اور گائیں چالیس ہوں تو ایک مُسنِ یعنی دو سال کا بچھڑا یا مُسِنَّہ یعنی دو سال کی بچھیا۔ انسٹھ تک یہی حکم ہے۔ پھر ساٹھ گائیوں میں دو تبیع یا تبیعہ، پھر ہر تیس گائیوں میں ایک تبیع یا تبیعہ اور ہر چالیس گائیوں میں ایک مُسنِ یا مُسِنَّہ۔ مثلاً ستّر گائیوں میں ایک تبیع یا ایک تبیعہ اور ایک مُسن اور اسّی گائیوں میں دو مُسنِ وعلیٰ ہٰذالقیاس اور جس جگہ تیس اور چالیس دونوں ہو سکتے ہوں وہاں اختیار ہے کہ تبیع زکوٰۃ میں دس مُسنِ مثلاً ایک سو بیس گائیوں میں اختیار ہے کہ چار تبیع دیں یا تین مُسنِ۔

(عامہ کتب)

☆ بھینس گائے کے حکم میں ہے۔ اگر کسی کے پاس گائے بھینس دونوں ہوں تو نصاب میں ملا لی جائیں گی۔ مثلاً بیس گائیں ہیں اور دس بھینسیں تو دونوں مل کر تیس ہو گئیں لہٰذا زکوٰۃ واجب ہو گئی۔

(فتاویٰ عالمگیری)

☆ گائے بھیس کی زکوٰۃ میں اختیار ہے کہ نر زکوٰۃ میں دیا جائے یا مادہ۔ مگر افضل یہ ہے کہ اگر گائیں زیادہ تعداد میں ہوں تو بچھیا اور اگر بیل زیادہ تعداد میں ہوں تو بچھڑا۔

(فتاویٰ عالمگیری)

بکریوں کی زکوٰۃ

بکریوں کا نصاب کم از کم چالیس بکریں ہیں۔ چالیس سے کم بکریاں ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں۔ اگر پوری چالیس بکریاں ہوں تو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا واجب ہے اور یہی حکم ایک سو بیس بکریوں تک ہے یعنی ان میں بھی وہی ایک بکری ہے اور ایک سو اکیس میں دو اور دو سو ایک میں تین اور چار سو میں چار۔ پھر ہر سو بکریوں میں ایک بکری زکوٰۃ میں ادا کریں۔

(عامۂ کتب)

☆ اختیار ہے کہ زکوٰۃ میں بکری یا بکرا جو کچھ بھی ہو یہ ضروری ہے کہ وہ سال بھر سے کم کا نہ ہو۔

(در مختار)

☆ بھیڑ، دنبہ بکری کے حکم میں ہے۔ اگر ایک سے نصاب پورا نہ ہو تو دوسرے کو ملا کر پورا کریں۔ مثلاً بیس بکریاں ہوں اور اور بیس بھیڑیں تو بکری کا نصاب دونوں کو ملا کر چالیس پورا ہو گیا اور ایک بکری زکوٰۃ میں واجب ہو گئی اور زکوٰۃ میں بکری بھی دے سکتے ہیں اور بھیڑ بھی۔ دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

(در مختار)

تجارتی سامانوں کی زکوٰۃ

تجارت کے سامانوں کی قیمت لگا کر ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ مال تجارت میں سال گزرنے پر جو قیمت ہے اس کا اعتبار ہے مگر شرط یہ ہے کہ شروع سال میں اس کی قیمت ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونے کی مقدار کے برابر ہو تو سال گزرنے پر اس سامان تجارت کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ادا کرنا ہوگی۔ اور اگر دکان میں مختلف قسم کے اسباب ہوں تو سب سامانوں کی قیمتوں کا مجموعہ ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کی مقدار ہو یعنی جب کہ اس کے پاس یہی سامان تجارت ہو اور اگر سامان تجارت کے علاوہ اس کے پاس سونا چاندی بھی ہو تو ان سب کو ملا کر حساب سے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی۔

(فتاویٰ عالمگیری)

۱۔ تجارت کے سامان کی قیمت اس جگہ کی لگائی جائے گی جہاں وہ سامان موجود ہے۔ اگر مال جنگل میں ہے تو اس جنگل کے قریب جو آبادی ہے وہاں اس کی جو قیمت ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

(فتاویٰ عالمگیری)

۲۔ کرایہ پر اٹھانے کیلئے دیگیں یا دوسرے برتن یا دریاں، گدّے یا کرسیاں میزیں یا پلنگ اور مسہریاں وغیرہ اس کے پاس ہوں تو اگرچہ ان سامانوں کی قیمت ہزاروں روپے ہو مگر ان سامانوں میں کوئی زکوٰۃ واجب نہیں۔ یوں ہی اگر کرایہ پر اٹھانے کیلئے مکان اور دکانیں ہوں تو ان مکانوں اور دکانوں کی زکوٰۃ نہیں۔ ہاں ان کے کرایوں کی جو آمدنی ہوگی اگر وہ نصاب کے برابر ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ اسی طرح موٹریں، بسیں، ٹرک وغیرہ اگر کرایہ پر چلانے کیلئے اس کے پاس ہوں تو اگرچہ یہ لاکھوں روپے کے ہوں مگر ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ ہاں البتہ ان سے جو آمدنی ہوگی اگر وہ بقدر نصاب ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگی۔

۳۔ زکوٰۃ میں مسکین کو روپیہ پیسہ ہی دینا ضروری نہیں بلکہ جتنا روپیہ زکوٰۃ کا دینا واجب ہے اگر اس رقم کا کوئی سامان خرید کر مسکینوں کو دے دیں مثلاً سلائی مشینیں یا دستکاری کے کچھ اوزار یا غریب طالب علموں اور عالموں کو کتابیں، کپڑے، کمبل، رضائیاں وغیرہ ہوں تو بھی زکوٰہ ادا ہو جائے گی اور یہ روپیہ پیسہ دینے سے بدرجہا افضل ہے اور دینی کتابوں کو زکوٰۃ میں دینا تو نہایت ہی افضل ہے کہ اس میں خدا کے عائد کردہ فرض زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہو جائے گی اور مسائل دین کی اشاعت کا ثواب بھی الگ ملے گا۔ کاش مالدار مسلمانوں کو یہ مسئلہ معلوم ہوجائے کہ دینی کتابوں کی اشاعت زکوٰۃ دینے کا بہترین اور افضل ترین طریقہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

زکوٰہ کا مال کن لوگوں کو دیا جائے؟

جن جن لوگوں کوعشر و زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے وہ یہ لوگ ہیں:

۱۔ فقیر یعنی وہ شخص جس کے پاس کچھ مال ہے مگر نصاب سے کم ہے۔

۲۔ مسکین یعنی وہ شخص جس کے پاس کھانے کیلئے غلہ اور پہننے کیلئے کپڑا بھی نہ ہو۔

۳۔ قرضدار یعنی وہ شخص کہ جس کے ذمہ قرض ہو اور اس کے پاس قرض سے فاضل کوئی مال بقدر نصاب نہ ہو۔

۴۔ مسافر جس کے پاس سفر کی حالت میں مال نہ رہا ہوں۔ اس کو بقدر ضرورت زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے۔

۵۔ عامل یعنی جس کو بادشاہ اسلام نے زکوٰۃ وعشر وصول کرنے کیلئے مقرر کیا ہو۔

۶۔ مکاتب غلام تاکہ وہ مال دے کر آزاد ہو جائے۔

۷۔ غریب مجاہد تاکہ وہ جہاد کا سامان کرے۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱: ۱۷۶ تا ۱۷۷)

کن لوگوں کو زکوٰۃ کا مال دینا منع اور کن کو جائز ہے

جن لوگوں کو عشر و زکوٰۃ کا مال دینا جائز نہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ مالدار یعنی صاحبِ نصاب جس پر خود زکوٰۃ فرض ہے۔

۲۔ بنی ہاشم یعنی حضرت علی، حضرت جعفر، حضرت عقیل، حضرت عباس، حضرت حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم کی اولاد کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱: ۱۷۷ و ہدایہ)

۳۔ اپنی اصل و فرع یعنی ماں، باپ، دادی، دادا، نانی، نانا وغیرہم اور بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسہ نواسی کو زکوٰۃ کا مال دینا جائز نہیں۔

۴۔ شوہر اپنی عورت کو اور عورت اپنے شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ یونہی صدقۂ فطر اور کفارہ بھی ان کو نہیں دے سکتے۔

۵۔ مالدار کے نابالغ بچے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں اور مالدار کی بالغ اولاد کو جب کہ وہ صاحب نہ ہو، زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

۶۔ کسی کافر و مرتد یا بد مذہب کو زکوٰۃ کا مال دینا جائز نہیں۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱: ۱۷۷ و ہدایہ)

☆ بہو، داماد اور سوتیلی ماں یا سوتیلے باپ یا زوجہ کی اولاد جو دوسرے شوہر سے ہو یا شوہر کی اولاد جو دوسری بیوی سے ہو اور دوسرے رشتہ داروں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

(رد المختار، ۲: ۶۳)

☆ مالدار کی بیوی اگر صاحب نصاب نہیں تو اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱: ۱۷۷ و ہدایہ)

☆ تندرست اور طاقتور آدمی اگر مالک نصاب نہیں تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر اس کیلئے سوال کرنا اور بھیک مانگنا جائز نہیں۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۱: ۱۷۷ و ہدایہ)

☆ زکوٰۃ ادا کرنے میں یہ ضروری ہے کہ جسے دیں اس کو مالک بنا دیں، اس لیے اگر زکوٰۃ کی رقم سے کھانا پکا کر غریبوں کو بطور دعوت کے کھلا دیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی کیونکہ یہ اباحت ہوئی تملیک نہ ہوئی۔ ہاں اگر کھانا پکا کر کھانا غریبوں کو دے دے اور ان کو اس کھانے کا مالک بنا دے کہ وہ چاہیں اسے کھائیں یا کسی دوسرے کو دے دیں یا بیچ ڈالیں تو زکوٰۃ ادا ہوگئی کیونکہ اس میں تملیک (مالک بنا دینا) پائی گئی۔

(درمختار و ردالمختار، ۲: ۶۲)

☆ اگر مال زکوٰۃ سے دینی کتابیں خرید کر غریب طلباء کو ان کتابوں کا مالک بنا دیں تو یقیناً زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اعانت دین اور اشاعت اسلام کا اجرعظیم بھی ملے گا۔ کاش اہل دولت اس طرف توجہ کریں کہ یہ ادائے زکوٰہ کی بہت ہی افضل صورت ہے۔

☆ فقیر زکوٰۃ کے مال کا مالک ہو جانے کے بعد خود اپنی طرف سے اگر مسجد و مدرسہ کی عمارت میں لگا دے یا میت کے کفن دفن میں خرچ کر دے تو جائز ہے۔

☆ جن لوگوں کو زکوٰۃ دینا ناجائز ہے انہیں اور بھی کوئی صدقہ، فدیہ، نذر و کفارہ وصدقۂ فطر دینا جائز نہیں۔

(جوہرہ)

☆ صدقۂ نفل اور اوقاف کی آمدنی بنی ہاشم کو دے سکتے ہیں خواہ وقف کرنے والے نے ان کی تعیین کی ہو یا نہ کی ہو۔

(درمختار)

☆ زکوٰۃ وصدقات وغیرہ میں افضل یہ ہے کہ پہلے اپنے بہن بھائیوں کو دے پھر ان کی اولاد کو، پھر چچاؤں اور پھوپھیوں کو، پھر ان کی اولاد کو، پھر ماموؤں اور خالاؤں کو، پھر ان کی اولاد کو، پھر دوسرے رشتہ داروں کو پھر پڑوسیوں کو پھر اپنے پیشہ والوں کو، پھر اپنے گاؤں اور شہر کے رہنے والوں کو۔

(جواہر، عالمگیری)

☆ دوسرے شہروں کو زکوٰۃ بھیجنا مکروہ ہے لیکن اگر وہاں حاجت مند رشتہ دار ہوں تو بھیج سکتا ہے ایسے ہی دوسرے شہر میں اپنے شہر سے زیادہ حاجتمند ہوں یا طالب علموں، عالموں یا عابدوں کیلئے بھیجے تو ان سب صورتوں میں دوسرے شہر کو زکوٰۃ کا مال بھیجنا بلا کراہت جائز ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری و درمختار)

☆ جس کے پاس آج کھانے کو ہے یا وہ تندرست ہے کہ کما سکتا ہے اسے کھانے کیلئے سوال کرنا حلال نہیں اور بے مانگے کوئی خود دے دے تو لینا جائز ہے اور کھانے کو اس کے پاس ہے مگر کپڑا نہیں تو کپڑے کے لیے سوال کرسکتا ہے۔ یوں ہی اگر علم دین کی طلب میں یا جہاد میں مشغول ہے تو اگرچہ تندرست وقوی ہو اور کمانے پر قدرت بھی رکھتا ہو پھر بھی اسے سوال کی اجازت ہے۔

(درمختار)

☆ مستحب یہ ہے کہ ایک شخص کو اتنا دیں کہ اس دن اس کو سوال کی حاجت نہ پڑے اور یہ اس فقیر کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس کے کھانے، بال بچوں کی کثرت اور دوسری باتوں کا لحاظ کر کے دے۔

(درمختار و ردالمختار)

☆ علم دین حاصل کرنے والے طالب علموں اور گوشہ نشین غریب علماء کو زکوٰۃ کا مال دینا افضل ہے کہ اس میں فرض زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہو جائے گی اور علم دین کی اعانت کا ثواب بھی ملے گا۔ دولت مندوں کو خاص طور پر اس جہت کا دھیان رکھنا چاہیے۔

☆ کسی بدمذہب کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

(درمختار)

جزوسوم

صدقۂ فطر کا بیان

☆ ہر مالک نصاب پر اپنی طرف سے اور اپنی نا بالغ اولاد کی طرف سے ایک ایک صدقۂ فطر دینا واجب ہے۔

(درمختار،۲:۴۷)

☆ صدقۂ فطر کی مقدار یہ ہے کہ اگر گیہوں یا گیہوں کا آٹا آدھا صاع اور جو یا جو کا آٹا یا کھجور ایک صاع دیں۔ نئے وزن سے ایک صاع کا وزن چار کلو اور تقریباً چورانوے گرام ہوتا ہے اور آدھا صاع کا وزن دو کلو اور تقریباً سینتالیس گرام ہوتا ہے۔

(درمختار،۲:۷۶)

☆ صدقۂ فطر دینے کیلئے روزہ رکھنا شرط نہیں ہے۔اس لیے اگر بیماری یا سفر کی وجہ سے معاذ اللہ بلا عذر اپنی شرارت سے روزہ نہ رکھا جب بھی صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔

(ردالمختار،۲:۴۷)

☆ صدقۂ فطر انہیں کو دیا جائے گا جن کو زکوۃ دینا جائز ہے۔

☆ باپ نہ ہوتو دادا باپ کی جگہ یعنی وہ اپنے یتیم پوتے اور پوتی کی طرف سے صدقۂ فطر دے گا۔اپنی عورت اور بالغ اولاد کا صدقۂ فطر اس کے ذمہ واجب نہیں۔

(درمختار)

☆ ماں باپ ، دادا دادی، نا بالغ بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کا صدقۂ فطر اس کے ذمہ واجب نہیں اور بغیر حکم ادا بھی نہیں کرسکتا۔

(ترمذی شریف،۱:۸۲)

☆ بہتر یہ ہے کہ عید کی صبح صادق ہونے کے بعد اور عید گاہ جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرے۔ علاوہ ازیں نماز عید کی ادائیگی کے بعد بھی صدقۂ فطر دینا درست ہے۔

ہوسکتا ہے کسی کا چولہا نہ جل سکا ہو اور وہ آپ کے صدقۂ فطر سے اپنے اہل و عیال کیلئے سامان خورد نوش لے کر عید کی خوشیوں میں آپ کے ساتھ شامل ہو سکے۔

سوال کرنے کے اہل کون لوگ ہیں؟

آج کل ایک عام وبا پھیلی ہوئی ہے کہ اچھے خاصے تندرست لوگوں نے اپنے وجود کو بیکار قرار دے رکھا ہے، محنت مشقت سے جی چراتے ہیں اور ناجائز طور پر بھیک مانگ مانگ کر پیٹ بھرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے تو سوال کرنا اور بھیک مانگنا اپنا پیشہ ہی بنا رکھا ہے۔ گھر میں ہزاروں روپے ہیں، کھیتی باڑی بھی ہے مگر بھیک مانگنا نہیں چھوڑتے۔ ان سے کہا جاتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ یہ تو ہمارا پیشہ ہے ہم اپنا پیشہ چھوڑ دیں؟ حالانکہ ایسے لوگوں کو سوال کرنا اور بھیک مانگنا بالکل حرام ہے، اگر وہ چاہیں تو خود کھا کر اوروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ حدیث شریف ہے:

''جو شخص بغیر حاجت کے سوال کرتا ہے گویا وہ آگ کا انگارہ کھاتا ہے۔''

(ترمذی شریف، ۱: ۸۲)

ایک اور حدیث شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص لوگوں سے سوال کرے حالانکہ اس کو نہ فاقہ ہو نہ اس کے اتنے بال بچے ہیں جن کی ضروریات پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو قیامت کے دن وہ اس طرح آئے گا کہ اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا'' اور حضور ﷺ نے فرمایا ''جس پر فاقہ نہیں گزرا اور نہ اتنے بال بچے ہیں جن کی طاقت نہیں اور سوال کا دروازہ کھولے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایسی جگہ سے فاقہ کا دروازہ کھول دے گا جو اس کے خیال میں بھی نہیں۔''

ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے:

''جو شخص مال بڑھانے کیلئے لوگوں سے سوال کرتا ہے تو وہ گویا آگ کا انگارہ طلب کرتا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ بغیر شدید ضرورت اور مجبوری کے بھیک مانگنا اور لوگوں سے سوال کرنا جائز نہیں ہے لیکن جو شدید حاجت سے مجبور ہو گیا تو اس کیلئے شریعت نے سوال کرنے کی اجازت دی ہے مگر ضرورت بھر ہی۔ ضرورت سے زیادہ سوال کرنا منع ہے۔

صدقہ کرنے کی فضیلت

زکوٰۃ و عشر و صدقۂ فطر، یہ تینوں تو واجب ہیں جو ان تینوں کو ادا نہ کرے گا، سخت گنہگار ہو گا مگر ان کے علاوہ صدقہ دینے اور خدا کی راہ میں خیرات کرنے کا بھی بہت بڑا ثواب ہے اور دنیا و آخرت میں اس کے بڑے بڑے فوائد و منافع ہیں چنانچہ اس کے بارے میں یہاں چند احادیث لکھتے ہیں ان کو غور سے پڑھئیے اور اپنے پیارے رسول ﷺ کے ان مقدس فرمانوں پر عمل کر کے اپنی دنیا و آخرت سنوار لیجئے۔

حدیث ۱: حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا فرمایا تو ہلنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا فرمایا اور زمین کو پہاڑوں کے سہارے سے ٹھہرا دیا۔ یہ دیکھ کر فرشتوں کو پہاڑوں کی طاقت پر بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے عرض کی کہ اے پروردگار! کیا تیری مخلوق میں پہاڑوں سے بھی بڑھ کر طاقتور کوئی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں، لوہا۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ تیری مخلوق میں لوہے سے بڑھ کر کوئی طاقت ور چیز ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں، آگ۔ پھر فرشتوں نے پوچھا کہ کیا آگ سے بھی بڑھ کر کوئی طاقت والی چیز تیری مخلوق میں ہے؟ اللہ نے فرمایا ہاں، پانی۔ پھر فرشتوں نے سوال کیا کہ کیا تیری مخلوق میں پانی سے بھی زیادہ طاقتور کوئی چیز ہے؟ تو ارشاد ہوا کہ ہاں، ہوا۔ یہ سن کر فرشتوں نے دریافت کیا کہ کیا تیری مخلوق میں ہوا سے بھی بڑھ کر طاقت رکھنے والی کوئی چیز ہے؟ تو فرمایا ہاں، ابن آدم اپنے داہنے ہاتھ سے صدقہ دے اور بائیں ہاتھ سے چھپائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قدر چھپا کر صدقہ دے کہ دائیں ہاتھ سے صدقہ دے اور بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔ یہ صدقہ پہاڑ، لوہا، آگ، پانی، ہوا اور تمام چیزوں سے بڑھ کر طاقتور ہے۔

(مشکوٰۃ، ۱:۱۷۰)

حدیث ۲: صدقہ گناہوں کو اس طرح مٹا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔

(مشکوٰۃ، ۱:۱۴)

حدیث ۳: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان کو صدقہ کرنا چاہیے۔ تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو شخص صدقہ کرنے کیلئے کوئی چیز نہ پائے، وہ کیا کرے؟ تو ارشاد فرمایا کہ اس کو چاہئے کہ وہ ہاتھ سے کوئی کام کر کے کچھ کمائے۔ پھر خود بھی اس سے نفع اٹھائے اور صدقہ بھی دے۔ تو لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ کمانے کی طاقت نہ رکھتا ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کسی حاجت مند کی کسی طرح سے مدد کر دے۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ اگر وہ یہ بھی نہ کرے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتا رہے۔ یہ سن کر لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ یہ بھی نہ کرے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ خود برائی کرنے سے رک جائے یہی اس کیلئے صدقہ ہے۔

(مشکوٰۃ، ۱:۱۶۷)

حدیث ۴: حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ خدا کے غضب کو بجھا دیتا ہے اور بری موت کو دفع کرتا ہے۔

(مشکوٰۃ، ۱:۱۶۸)

حدیث ۵: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک زنا کار عورت ایک کتے کے پاس سے گزری جو ایک کنویں کے پاس پیاس سے زبان نکالے ہوئے تھا اور قریب تھا کہ پیاس اس کتے کو مار ڈالے تو اس عورت نے اپنا چمڑے کا موزہ نکالا اور اس کو اپنی اوڑھنی میں باندھ کر اس میں کنویں سے پانی بھرا اور اس کتے کو پلا دیا تو اتنا ہی صدقہ کرنے سے اس کی مغفرت ہوگئی۔

(مشکوٰۃ، ۱:۱۶۸)

حدیث ۶: حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری

ماں کی وفات ہو گئی ہے تو اس کی طرف سے کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پانی''۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک کنواں کھدوایا اور یہ کہا کہ یہ سعد کی ماں کیلئے ہے (یعنی اس کا ثواب سعد کی ماں کو پہنچے۔)

(مشکوٰۃ، ۱: ۱۶۹)

حدیث ۷: حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کسی ننگے بدن والے مسلمان کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا سبز لباس پہنائے گا اور جو کسی بھوکے مسلمان کو کھانا کھلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے میوے کھلائے گا اور جو کسی پیاسے مسلمان کو پانی پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا شربت پلائے گا جس پر مہر لگی ہو گی۔

(مشکوٰۃ، ۱: ۱۶۹)

حدیث ۸: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو کسی مسلمان کو کپڑا پہنائے گا تو جب تک اس کے بدن پر اس کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہے گا اس وقت تک کپڑا پہنانے والا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے گا۔

(مشکوٰۃ، ۱: ۱۶۹)

حدیث ۹: حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے (یعنی بنجر زمین کو کھیتی کے قابل بنا کر کھیت بوئے یا درخت لگائے) تو اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا اور جتنے چرند و پرند اس کا دانہ یا پھل کھالیں گے وہ سب اس کیلئے صدقہ ہو گا یعنی اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔

(مشکوٰۃ، ۱: ۱۶۹)

حدیث ۱۰: حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے کسی (مسلمان) بھائی کے سامنے (خوشی سے) مسکرا دینا بھی صدقہ ہے اور کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے اور کسی اندھے کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے اور راستے

سے ہڈی، پتھر اور کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔

(مشکوٰۃ، ۱: ۱۶۹)

مطلب یہ ہے کہ ان سب کاموں پر صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

❁ ☆ ❁ ☆ ❁